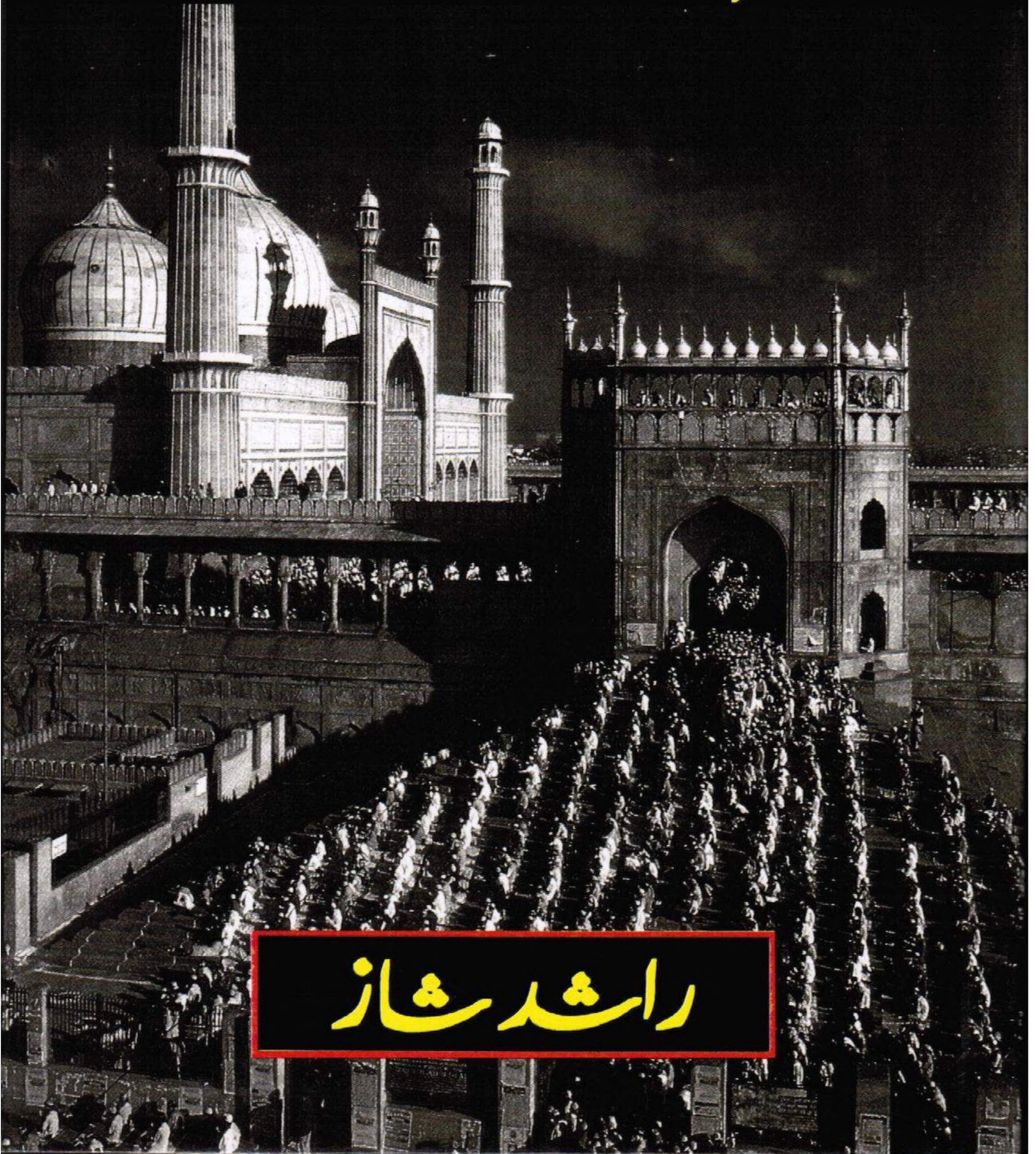
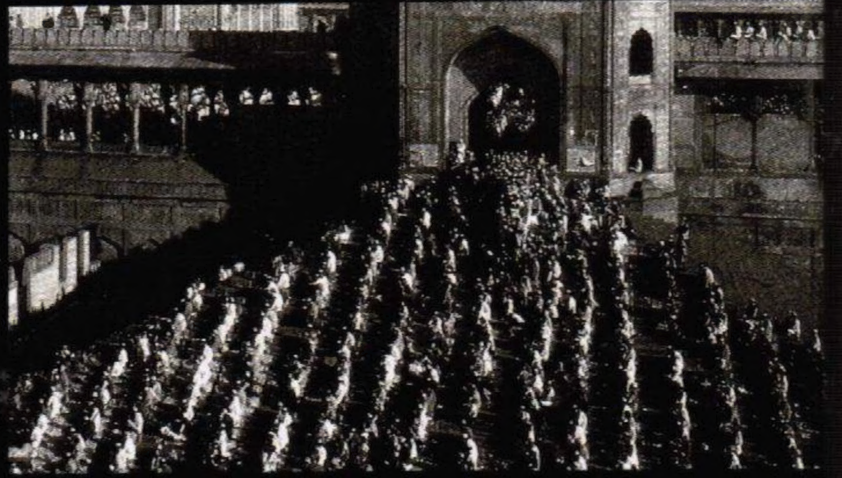
ہندوستانی مسلمان

ایامِ گم گشتہ کے پچاس برس



راشد شاز



ہندوستانی مسلمانوں کی پچاس سالہ تاریخ مجرمانہ خاموشی کی شرمناک داستان ہے۔ سیکولر دانشور ہوں یا مذہبی علماء، ملی قائدین ہوں یا روحانی گدی نشین، یہ سب گذشتہ پچاس سالوں سے مداہنت کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ہم بحیثیت امت یہ بالکل بھول گئے کہ ہندوستان کی سرزمین میں جہاں ۱۹۴۷ء کی نئی سیاسی صورت حال نے ہمیں ایک اجنبی ملک کا باشندہ بنادیا تھا اس میں ہمارے لئے زندگی جینے کا اگر کوئی جواز ہوسکتا تھا تو وہ کیا تھا؟ نئے ہندوستان میں جہاں مسلمان ایک قوم کی محکومی سے نکل کر دوسری قوم کی سیاسی محکومی میں چلے گئے تھے وہاں ہماری اسٹریٹیجی کیا ہونی چاہئے تھی؟ ہم اس مسئلہ پر بھی گفتگو سے گریز کرتے رہے کہ نئے ہندوستان میں ہمارا ملی ایجنڈا کیا ہونا چاہئے۔ گذشتہ پچاس برس ہماری ملی تاریخ میں عہد سیاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ایسا عہد جسے ہم ایام گم گشتہ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

من حیث الامت ہم زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار آخری سانس لے رہے ہیں۔ ہم ایک طرف تو خود کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کا داعی بتاتے ہیں لیکن دوسری طرف عملی طور پر ہم اپنی ساری قوت نظام کفر کے استحکام کے لئے وقف کئے دیتے ہیں۔ فکری اور نظری قیادت ہو یا منظم جماعتیں اور دینی گروہ، ہر کوئی ایک بے سمتی اور تضاد کا شکار ہے۔ ہمارے علماء دعائیں تو دین کے غلبے کے لئے مانگتے ہیں لیکن فتوے کفار و مشرکین کو ووٹ دینے کے لئے جاری کرتے ہیں۔ گویا ہم جو کچھ کہتے ہیں خود اپنے اعمال سے اس کی پرزور تردید بھی کررہے ہیں۔ ہم اس بات کے لئے تو آمادہ نہیں ہوتے کہ مسجد کی امامت غیر مسلموں کے حوالے کردیں لیکن ان کی سیاسی اتباع میں ذرہ برابر بھی تکلف محسوس نہیں کرتے حالانکہ شریعت کی رو سے مسلمانوں کے امور کو غیر مسلموں کے ہاتھوں میں سونپنا قطعاً حرام ہے۔

— راشد شاز

MILLI TIMES PUBLICATIONS Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025

ہندوستانی مسلمان

ایامِ گُم گشتہ کے پچاس برس

مصنف

راشد شاز

ترتیب و تدوین

کوثر فاطمہ

زیرِ اہتمام

انسٹی ٹیوٹ آف مسلم اُمّہ افیرز، علی گڑھ

سال اشاعت ۱۹۹۹ء

• یکے از مطبوعات انسٹی ٹیوٹ آف مسلم امۃ افیرز، علی گڑھ

تعداد اشاعت : ۲۰۰۰ (دو ہزار)

قیمت : دو سو پچاس روپئے (Rs. 250/-)

مطبع : رتنا آفسیٹ اوکھلا انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔۲۰

ناشر

Milli Times Publications

ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

Tel.: +91-11-6827018, 6926246, Fax: +91-11-6946686

E-mail: militime@del3.vsnl.net.in

علی گڑھ

ملی پارلیامنٹ بلڈنگ 4/1176-D نیو سرسید نگر، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

Tel.: 0571-500629, Telefax: 0571-400182

ابتدائیہ

اللہ ان لوگوں پر رحم فرمائے جو اسی بارے میں شبہ کرتے ہیں جس کی صداقت پر ان کے قلب مطمئن ہوتے ہیں۔ گذشتہ پچاس برسوں سے ہم مداہنت کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ سچ کو سچ کہنا ہمارے لئے مشکل ہوگیا ہے۔ رات کو دن کہنے کی ہمیں کچھ ایسی لت پڑگئی ہے کہ رات کا لفظ ہماری لغت سے یکسر غائب ہوگیا ہے۔ اب اگر کوئی مردِ درویش رات کی طرف اشارہ کردے تو ہمیں اس کی کم علمی اور نادانی پر جھنجھلاہٹ ہوتی ہے آخر یہ اتنی موٹی سی بات کیوں نہیں سمجھ پاتا کہ اب اسی رات کا نام دن پڑگیا ہے۔ گویا دن دو قسم کے ہیں ایک وہ جس میں سورج چمکتا ہے اور دوسرا وہ جب سورج دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح آزادی کی بھی کئی قسمیں ہیں جس میں سب سے معروف وہ آزادی ہے جس میں سیاسی غلامی اور اذیت ناک محرومی کے احساسات ہر وقت دل و دماغ پر چھائے رہتے ہیں۔

پچاس سالہ بوڑھی آزادی کے حسن و جمال کا ہر سو چرچا ہے۔ اجنبی افکار و خیالات کو رواج دینے کے لئے اغیار کے سیٹیلائٹ مسلسل ہماری سرحدوں میں اپنی شعائیں پھینک رہے ہیں۔ بلکہ عین ہماری ملی سرحدوں کے اندر اغیار نے اپنے سیٹیلائٹ نصب کررکھے ہیں۔ کہیں یہ سیٹیلائٹ سیاسی مسلمانوں کی شکل میں ہیں تو کہیں نظام کفر کے لۓ ایجنٹ سرکاری علماء نے یہ ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔ ان سیارچوں نے عین ہمارے مدار میں اجنبی خیالات کی یورش کررکھی ہے۔

حالات انتہائی سخت ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ من حیث الامت ہم ایک ایسے جہاز میں سوار ہوں جس کے پچھلے حصے سے دھواں اٹھ رہا ہو۔ زندگی اور موت میں لمحے بھر کا بھی فاصلہ نہ ہو۔ وقت

بہت کم ہے، ایسا لگتا ہے جیسے ٹڈی دلوں کی فوج ہمارے اوپر اتر آئی ہو جو ہر لمحہ ہمارے وجود کو چاٹ رہی ہو۔ جہنم جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں نہ جانے کیوں ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے وہ جگہ یہی ہو جہاں ہم گذشتہ نصف صدی سے رہ رہے ہیں۔ البتہ جب ہم سے یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ہم ایک آزاد ملک کے شہری ہیں تو ہمیں اس آزادی پر بے پناہ پیار آتا ہے۔ ہمارا سارا غم یکلخت کافور ہو جاتا ہے کہ اب ایک اذیت ناک زندگی جینے کے لئے غلام رہنے کی ضرورت بھی نہیں۔

کبھی کبھی مجھے ان لوگوں کی بے ضرر خوش بختی پر پیار آتا ہے جو زندگی کو کچھ اس دھوکے سے دیکھتے ہیں جیسے وہی سب کچھ حقیقت ہو۔ زندگیاں گزر جاتی ہیں لیکن ان بے چاروں پر دنیا کی رنگینیوں کا تاثر کچھ اس طرح قائم رہتا ہے جیسے موسیقی کے کسی اسٹیج پر بدلتی روشنیوں کا جھوٹا ہالہ۔ لیکن مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے جیسے انسانی تھیٹر سے اچانک بجلی چلی گئی ہو، جیسے شدید گرمی کے باعث کسی بدصورت عورت کا میک اپ پگھل رہا ہو۔

جب سے خلافت کا ادارہ تباہ ہوا ہے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں No Man's Land میں آپڑا ہوں۔ نہ میرا کوئی ملک ہے نہ شہریت، میں جس نظام کا حصہ تھا اور جس ملک کی شہریت اختیار کر رکھی تھی وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل چکی ہے۔ میں خود کو ہر لمحہ ہوا میں معلق محسوس کرتا ہوں۔

عرض مرتب

یہ کتاب جسے میں ایک کتاب کی حیثیت سے ترتیب دینا چاہتی تھی اب ایک دستاویز بن گئی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی پچاس سالہ زندگی کی ایک اہم دستاویز۔ اس عرصے میں ہندوستانی مسلمانوں پر جو قیامت گزرتی رہی اور ان کی ملی زندگی کے ساتھ جو حادثے رونما ہوتے رہے اس کی داستانِ دلخراش ان صفحات میں سننے کو ملتی ہے۔

ڈاکٹر راشد شاز ایک عرصے سے ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے گم کردہ راستے کی طرف دوبارہ لے چلنے کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں آپ کا یہ معمول رہا کہ جب کوئی ملی مسئلہ سامنے آیا تو اس پر ملی ٹائمز کے لئے کوئی مضمون املا کرادیا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کوئی کتابچہ یا مختصر مضمون ڈاکٹر محمد احمد صاحب کو املا کرادیتے یا میں اسے لکھتی چلی جاتی۔ ملکی سیاق میں لکھے جانے والے مضامین ملی ٹائمز میں شائع ہوتے یا کسی کتابچے کی شکل اختیار کرلیتے اور بین الاقوامی مسائل پر لکھے جانے والے مضامین یا تو براہ راست انگریزی میں املا کرائے جاتے یا اردو سے عربی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوکر بیرونِ ملک اسلامی انقلابیوں کے حلقوں میں گردش کرتے رہتے۔ ان مضامین پر مصنف کا نام بالعموم نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ مختلف جگہوں پر جب یہ مضامین بغیر کسی حوالہ کے نقل ہوتے تو میں انھیں توجہ دلاتی کہ نقل کرنے والے کو کم از کم حوالہ تو دینا چاہئے تھا۔ لیکن آپ کی شانِ بے نیازی نے اس طرف کبھی توجہ نہ کی۔ گذشتہ سال جب ملی ٹائمز کے احتساب نمبر کے لئے آپ نے کچھ چیزیں املا کروائیں اور آپ کی ایماء پر بھائی راحیل احمد کے تعاون سے اس میں

"تصاویر غیرت" کا حصہ بھی شامل ہوگیا تو ملک اور بیرون ملک سے احباب کا تقاضا بڑھنے لگا کہ اس طرح کے مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ سچ پوچھئے تو اسی وقت ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی بات میرے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے مصروف ترین شب و روز میں معاونت کی وجہ سے اس طرف متوجہ ہونا ممکن نہ ہوسکا۔

پچھلے دنوں جب ڈاکٹر صاحب یورپ کے سفر پر تشریف لے گئے اور وہاں بلقان کے شورش زدہ علاقوں میں ان کا قیام طویل ہوتا گیا تو اس دوران اس کتاب کی ترتیب کا خیال میرے احساس پر مسلسل چھایا رہا۔ اسی دوران ملی ٹائمز کے دفتر میں فدائین اسلام کے خطوط کے جواب لکھنے کی ذمہ داری بھی میرے کندھوں پر آپڑی۔ میں نے یہ دیکھا کہ ایسے بہت سے سوالات جن کے مفصل جواب ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں پہلے سے موجود ہیں ان کی تکرار ان خطوط میں رہتی ہے۔ سوچنے لگی کیوں نہ ہندوستانی مسلمانوں پر لکھوائی جانے والی تحریروں کا ایک ایسا عام فہم انتخاب شائع کردیا جائے جو ڈاکٹر صاحب کی فکر کو سمجھنے میں معاون ہو اور جس سے نئے ہندوستان کے نئے منصوبے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہو۔

ہوسکتا ہے میرے اس انتخاب میں ان تحریروں کی نمائندگی زیادہ ہو جس سے میں خود بھی بہت متاثر ہوئی ہوں اور جس سے مجھے بعض مسائل پر بالکل نئے انداز سے سوچنے کا حوصلہ ملا ہے۔ یہ مضامین چونکہ مختلف اوقات میں بول کر لکھوائے گئے ہیں اس لئے ان میں تکرار کا احساس بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے اپنی طرف سے کسی کاٹ چھانٹ کے بغیر اسے جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ ایسا اس لئے کہ میں سمجھتی ہوں کہ جس طرح ڈاکٹر صاحب کی ذات امت کی امانت ہے اسی طرح ان کی تحریریں بھی امت کا اجتماعی سرمایہ ہیں۔ میں اس میں کسی خیانت کا الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتی۔

کوثر فاطمہ

۲۶/ دسمبر ۱۹۹۸ء نئی دہلی

ترتیب

ابتدائیہ ۵
عرض مرتب ۷
○ ہندوستانی مسلمان : منزل نامعلوم ۱۳
○ امت مسلمہ کا نظریاتی انحراف ۳۷
○ تین فتوے : ایک سوال ۵۵
○ مسلم نسل کشی کے پچاس سال ۵۹
○ تحفظ شریعت سے نفاذ شریعت تک ۶۹
○ سرکاری ملازمتوں میں مسلمان ۷۴
○ ہندوستانی مسلمانوں کی مجہول نسل ۷۹
○ ہندوستانی مسلمانوں پر وندے ماترم کا عذاب ۸۶
○ اسلام، مسلمان اور قومی ترانہ ۹۵
○ دستور پر نظرثانی کی مخالفت کیوں؟ ۱۰۳
○ ایک نئی مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کی ضرورت ۱۰۹
○ ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مسئلے پر منارۂ رسولؐ سے آنے والی صدا کیا کہتی ہے؟ ۱۲۱
○ اسلام میں اجنبی تصورات کی آمیزش ۱۳۴
○ ہندوستان میں اسلامی اور غیر اسلامی ایجنڈے کی جنگ : کون کس طرف ہے؟ ۱۴۴
○ مسلم پرسنل لا بورڈ کے لئے مجوزہ ایجنڈا ۱۵۸
○ بی جے پی کے دور حکومت میں مسلمان (۱) ۱۶۷
○ بی جے پی کے دور حکومت میں مسلمان (۲) ۱۷۳
○ بی جے پی کے دور حکومت میں مسلمان (۳) ۱۷۸
○ اے خاصہ خاصان رسلؐ وقت دعا ہے ۱۸۴

خطبات ۱۹۳

○ مسلم اُمّت: ملکی اور بین الاقوامی مسائل ۱۹۵

○ مابعد انہدام ہندوستان میں ایک نئے لائحہ عمل کی ضرورت ۲۱۱

○ ایک منصفانہ سیاسی متبادل کی تلاش ۲۲۵

○ ہندوستانی مسلمان فکری اور عملی ارتداد کی زد میں ۲۴۱

مکاتیب ۲۵۹

○ مجلس شوری ۲۶۱

○ مکتوب ۲۶۹

○ ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی قافلہ اب متحرک ہونے کو ہے ۲۸۷

○ مسلم سیاسی پارٹی کی حمایت و نصرت کے لئے قائد ملی کا مکتوب ۲۹۶

دستاویزات ۲۹۹

○ ۱۹۹۶ء پٹنہ اجلاس کے لئے دعوت نامہ کا متن ۳۰۱

○ مسلم سیاسی بل کا پس منظر ۳۰۶

○ مسلم سیاسی بل ۳۱۴

○ ملی فرمان ۳۲۷

○ مسلم منشور ۳۲۸

○ مسلم رائے دہندگان کا منشور ۳۳۹

تصاویر غیرت ۳۴۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ کتاب ہندوستانی مسلمانوں کی گذشتہ پچاس سالہ بے سمت سفر کی دل خراش روداد ہی نہیں بلکہ اس احساسِ زیاں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نئی مسلم فکر کا اعلامیہ بھی ہے۔ ان صفحات میں قاری کو صرف ماضی کا نوحہ نہیں ملتا بلکہ نئے مستقبل کی تعمیر کے لئے فکر و عمل کے واضح راستے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مصنف نے دلائل و براہین کی روشنی میں یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں امتِ اسلامیہ ہند جن اہداف کے حصول کے لئے کوشاں رہی ہے وہ سرے سے اسلامی ایجنڈا تھا ہی نہیں، لہٰذا کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ گم شدہ اسلامی ایجنڈے کو دوبارہ دریافت کیا جائے تاکہ اس ملک میں ایک نئی صبح کے طلوع کے لئے منظم جد و جہد کا آغاز ہو سکے۔



سمندر بڑا ہے اور کشتی چھوٹی لیکن جب کبھی میرے ارادے متزلزل ہوتے ہیں تو کوئی مجھ سے سرگوشی کرتا ہے کہ لاتحزن ان اللہ معنا (غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے) ایک انجانی ہستی، ایسا لگتا ہے، ہر وقت میری پشت پناہی کررہی ہو۔ نہ جانے کتنے لمحات ایسے آئے جب مجھے اپنی چھوٹی سی کشتی بڑی اور مہیب خوفناک سمندر حقیر لگنے لگا۔ میں اپنے اردگرد بہتوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ امکانات کے دروازوں کا قفل کھولنے کے لئے غلط چابیاں لگارہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ جدوجہد جتنی بھی ہو جب تک صحیح چابی نہ ملے قفل نہیں کھل سکتا۔

ہندوستانی مسلمان: منزل نامعلوم

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو جب نئی صبح کا سورج طلوع ہوا تو مولانا ابوالکلام آزاد کو ایسا لگا جیسے یہ سورج اس سورج سے مختلف ہو جس کے طلوع کی انہیں برسہا برس سے توقع تھی اور جس کے لئے انھوں نے اپنی زندگی کی ساری توانائی جھونک دی تھی۔ نیا ہندوستان اب ایک منقسم ہندوستان تھا جس میں مسلمانوں کی عددی قوت تین حصوں میں بٹ چکی تھی۔ بعض سیاستدانوں کے لئے اگر ۱۵/ اگست بے شمار کامیابیوں کا نقطہ عروج تھا، اگر ایک طرف جواہرلال نہرو کی دیرینہ آرزو وزارت عظمیٰ کی شکل میں پوری ہورہی تھی تو دوسری طرف محمد علی جناح بھی نوتشکیل یافتہ مملکت پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اس منصب پر فائز ہوچکے تھے۔ جناح ہوں یا نہرو ان دونوں کے لئے آزادی کی نئی صبح یقیناً جشن کا دن تھا لیکن آزاد اور گاندھی کو اپنا خواب کسی حد تک بکھرتا دکھائی دیتا تھا۔ گاندھی کے ہاتھ میں پھر بھی شاہ کلید تھی کہ وہ اپنی زبردست عوامی مقبولیت کے باعث جب چاہیں مرن برت کی دھمکی دے کر نئے ہندوستان کے خواب کو اب بھی کسی حد تک اپنی مٹھی میں رکھ سکتے تھے۔ البتہ آزاد کا غم ایک ایسے شخص کا غم تھا جس کی کشتی طوفان نے تباہ کردی ہو اور جسے بھنور سے نکلنے کا راستہ دکھائی نہ دیتا ہو۔

منقسم ہندوستان میں مسلم سیاست کو اب ایک نیا مرحلہ درپیش تھا۔ تقسیم نے صورت حال یکسر بدل کر رکھ دی تھی۔ آخر آخر تک آزاد کو یہ امید تھی کہ شاید ہندوستان کی ایک غیر فطری جغرافیائی تقسیم ممکن نہ ہو۔ ابتدا میں پاکستان کے فلسفہ سازوں نے متحدہ ہند میں چھوٹے چھوٹے مسلم تہذیبی وفاق کا خواب دیکھا تھا جس نے جناح کی قیادت میں ایک علیحدہ ملک کے مطالبے کی شکل اختیار کرلی تھی۔ آزاد کو اس بات کا یقین تھا کہ اس ملک پر ہزار سالہ حکمرانی کرنے والی امت شمالی ہند کے اہم مراکز، دہلی اور آگرہ کی سیاسی تاریخی جاہ و حشمت کو خیرباد کہہ کر کسی اور طرف ہجرت نہیں کرپائے گی۔ انہیں اپنے قریبی کانگریسی رفقاء اور بالخصوص گاندھی جی، جن کے لئے متحدہ ہندوستان ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا تھا،

پر بھرپور اعتماد تھا کہ وہ ہندوستان کی تقسیم جیسے فیصلے کو ہرگز ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ انہیں اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ اگر مسلم لیگ کے مطالبوں کو کسی حد تک تسلیم بھی کرلیا گیا تو متحدہ ہندوستان میں ان کی مرکزی حیثیت مجروح نہ ہوگی اور آنے والے دنوں میں ان کے لئے امام الہند کی حیثیت مزید اعتبار حاصل کرلے گی۔ آزاد کو اس بات کا بھی خوب اندازہ تھا کہ مسلم لیگ کی قیادت جن لوگوں پر مشتمل ہے وہ کسی عظیم مقصد کے لئے معمولی سی قربانی دینے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اگر مطالبہ پاکستان کی تحریک اور اس کی قیادت کسی واقعی آزمائش سے دوچار ہوتی ہے تو جناح کے اردگرد جمع ہونے والے لوگ جلد ہی منتشر ہوجائیں گے۔ لیکن جناح کی زبردست قوت ارادی نے ان کا یہ اندازہ بھی غلط ثابت کردیا اور انہیں سب سے بڑا دھچکا اس وقت لگا جب پٹیل اور نہرو تو کجا خود گاندھی جی نے تقسیم کے فیصلے کو قبول کرلیا۔ تب آزاد کو ایسا لگا جیسے ان کے قدموں سے زمین نکل گئی ہو، ان کے پاس کوئی سہارا نہ رہا جس پر وہ ٹیک لگاتے۔ منقسم ہندوستان کے نئے نقشے میں اگر ایک طرف جناح کو بانی ریاست کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی تو دوسری طرف نہرو کو آزاد ہندوستان کے نئے معمار کی حیثیت سے سامنے آنے کا موقع مل رہا تھا۔ آزاد جو ہمیشہ سے سیاست میں کلیدی کردار ادا کرتے رہے تھے اور جنہیں متواتر کانگریس کی قیادت کا موقع ملتا رہا تھا قوت کے نئے میزانئے میں اب ان کا Relevance بڑی حد تک ختم ہوچکا تھا۔

منقسم ہندوستان میں جب کانگریس کے دوسرے قائدین کے لئے جشن و طرب کا خاصا جواز تھا، جب پٹیل کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کا ملک محض انگریزوں کی نوے سالہ غلامی سے آزاد نہیں ہوا بلکہ صدیوں کی سیاسی غلامی سے اسے نجات ملی ہے، تب دور بہت دور تن تنہا گوشہ تنہائی میں مولانا ابوالکلام آزاد کو ایسا لگا جیسے اسلاف کی اس دلی پر عظمت رفتہ کا سورج شاید اب کبھی طلوع نہ ہوسکے گا۔ عظمت رفتہ کا یہ خواب اور سخت مایوسی میں امیدوں کے چراغ جلانے کی کوشش بالآخر خطابت کے قالب میں ڈھل گئی جسے جامع مسجد کی تاریخی معرکہ الآراء تقریر سے موسوم کیا جاتا ہے۔

آزاد کا یہ غم ذاتی سطح پر خواہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو انہیں نئی صورت حال میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دینا تھا۔ البتہ ایک ایسے شخص کے لئے جس کی ساری ترکیبیں ناکام ہوگئی ہوں، اندازے الٹ پلٹ گئے ہوں اور جسے ایسا لگا ہو جیسے اب اس اندھیرے سے نکلنے کے لئے کوئی راستہ ملنا مشکل ہے، اس کے لئے یہ کیوں کر ممکن ہوتا کہ وہ اب عمر کے اس مرحلے میں کسی نئے

طریقہ سفر کا ڈول ڈالتا۔ دیکھا جائے تو نئے ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی منزل بالکل ابتدائی دنوں سے ایک بے یقینی اور بے سمتی کا شکار رہی۔ جائیں تو جائیں کہاں؟ سیاسی سفر کی حتمی منزل کیا ہونی چاہیئے؟ ہم اس ملک میں سیاسی طور پر کیا کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ ایک شکست خوردہ سپاہی کے لئے کسی ایسے سوال کا واضح جواب فراہم کرنا ممکن نہ تھا جو نئی سمت میں سفر کی دعوت دیتا ہو۔ تب سے اب تک اس ملک میں ہمارا سیاسی قافلہ ان بنیادی سوالات کے واضح جوابات دریافت نہیں کر پایا ہے۔ گویا جس بے سمتی میں نئے ہندوستان کے مسلمان آج سے پچاس سال پہلے مبتلا تھے آج بھی وہ کم و بیش وہیں نظر آتے ہیں۔ یقیناً گذشتہ نصف صدی میں مسلمانوں نے سیاست میں چلت پھرت جاری رکھی ہے۔ ہمارا سیاسی قافلہ کلی طور پر جمود کا شکار نہیں رہا ہے، لیکن کسی واضح سمت کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم بار بار اس دائرے میں گھومتے رہے اور اسی نقطہ پر پہنچتے رہے جہاں سے کبھی سفر کا آغاز ہوا تھا۔ آج جب اس سفر کو پچاس برس پورے ہو چکے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی سابقہ پیش رفت یا بے سمتی کا انتہائی معروضی انداز سے جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ماضی میں اگر قافلے کے رہنماؤں سے بعض بنیادی نوعیت کی غلطیاں ہوئی ہیں تو ان کا تدارک اب کیسے کیا جائے؟ محض کسی شخص، گروہ یا رہنما کو موردالزام ٹھہرانے سے مسئلہ حل ہوگا اور نہ ہی ماضی کی شخصیات کی تقدیس کا نغمہ گانے سے مستقبل کے لئے کوئی راستہ نکل سکے گا۔

اپنی بساط بھر ابوالکلام آزاد نئی صورت حال میں ہندوستانی مسلمانوں کو حوصلہ دلانے کے لئے جو کچھ ممکن تھا کرتے رہے۔ وہ ایک شکست خوردہ سپاہی ضرور تھے لیکن انہوں نے کبھی ہتھیار نہیں ڈالا۔ البتہ تھے وہ بہرحال انسان، جسے قریب ترین رفقاء کی بے وفائی کا داغ لگا تھا۔ مایوسی اور ناکامیوں نے ان کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ اپنی بہت کچھ کوششوں کے باوجود وہ ایک بالکل تازہ دم سپاہی کی طرح نئے سفر کا آغاز نہیں کر پائے، کہ وہ بہرحال انسان تھے اور ہر انسان خواہ وہ کتنی ہی غیر معمولی صلاحیت کا حامل کیوں نہ ہو اس کی Limitations تو بہرحال ہوتی ہیں۔ ان کے ہر صحیح اور غلط اجتہاد کے لئے اللہ کے یہاں اجر موجود ہے، البتہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ نئے سفر کی نئی ابتدا جسے کسی وجہ سے مولانا آزاد انجام نہ دے سکے، اب ہم اس سمت میں ایک منصوبہ بند پیش قدمی کا آغاز کریں۔ البتہ اس سے پہلے کہ ہم سفر کا آغاز کریں بہتر ہوگا کہ گزشتہ پچاس سالہ سیاسی سفر کا ایک ناقدانہ جائزہ

لیں اور ان وجوہات کا پتہ چلانے کی کوشش کریں جس کی وجہ سے ہمارے متقدمین صحیح سمت میں نئے سفر کا آغاز نہیں کر پائے۔ گویا ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ ہم اپنے بزرگوں کے کامیاب اور ناکام تجربوں سے کیا کچھ سیکھ سکتے ہیں پھر اگر اس مرحلے میں بعض بنیادی غلطیوں کا پتہ لگایا جاسکا تو ہمارے لئے ممکن ہوگا کہ ہم مستقبل میں ان غلطیوں سے اپنا دامن بچا سکیں۔

تقسیم کے فوراً بعد ہندوستانی مسلمانوں کو سیاسی قیادت کے لئے بنیادی طور پر جو چند افراد یا گروہ میسر آئے ان میں ابوالکلام آزاد کا مقام سب سے نمایاں تھا۔ بیشتر مسلمان جو جناح کی سیاسی قیادت کے اسیر تھے وہ پاکستان منتقل ہو رہے تھے۔ بعض مسلم لیگیوں نے اب نئے حالات میں کانگریس میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ گو کہ جنوب میں مسلم لیگ کے بعض حلقے اب بھی لیگی سیاست کو نیا روپ دینے میں مصروف تھے، لیکن یہ حلقہ بہت مختصر تھا۔ پھر چونکہ مسلم لیگ کی ہوا منقسم ہندوستان میں اکھڑ گئی تھی اس لئے ہندوستانی مسلمان اب اگر سیاسی رہنمائی کے لئے کسی طرف دیکھتے تھے تو وہ بنیادی طور پر ابوالکلام آزاد کی ذات تھی۔ آزاد کے اردگرد نیشنلسٹ مسلمانوں اور جمعیۃ العلمائ مولویوں کا بھی ایک حلقہ تھا جن میں بعض سربرآوردہ شخصیتیں بھی موجود تھیں۔ لیکن سیاسی اعتبار سے ان کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی بلکہ یہ سب سیاسی رہنمائی کے لئے آزاد کی طرف ہی دیکھتی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ مذہبی حلقوں میں مولوی حسین احمد مدنی کے گہرے اثر و رسوخ کی وجہ سے اور پھر ان کی سابقہ سیاسی سرگرمیوں کے باعث بھی رہنمائی کے لئے مسلمانوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھتی تھیں۔ لیکن سیاسی اعتبار سے دیوبندی علماء ہوں یا جمعیۃ العلماء سے متعلق افراد، ان سبھوں کی حیثیت آزاد کے تتمہ Extension سے زیادہ نہ تھی جو متفقہ طور پر کم از کم القاب و آداب کی حد تک تو ابوالکلام آزاد کو امام الہند تسلیم کرتے ہی تھے۔ گویا نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا کام کلی طور پر آزاد کے کندھوں پر آپڑا تھا۔ آزاد اور ان کے حلقہ احباب کے لئے ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ نئے ہندوستان میں ان کا سیاسی فلسفہ پوری طرح بے محل (Irrelevant) ہو چکا تھا۔ بالکل نئے راستے پر قافلے کو لے چلنے میں یہ خطرہ تھا کہ انہیں اپنے سابقہ سیاسی نظریات کو یکسر مسترد کرنا پڑتا۔ ایسا کئے بغیر نئے لائحہ عمل کی ترتیب مشکل ہی نہیں ناممکن تھی۔ آگے چل کر سید محمود نے کسی حد تک سابقہ جامد سیاسی تصورات سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کی البتہ وہ کوئی واضح راستہ بنانے میں ناکام رہے۔ آئیے پہلے یہ دیکھیں کہ نئے ہندوستان میں سیاسی قائدین کی پہلی

نسل کو فکری اور نظریاتی سطح پر کن سوالوں سے الجھنا پڑا۔

منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے سامنے اب تین راستے تھے۔ اولاً متحدہ قومیت کے جس راستے پر وہ اب تک گامزن تھے اور ملک کی سیاست میں غیر مسلموں کے اشتراک سے جو رول ادا کرنا چاہتے تھے اسی سابقہ رویے پر گامزن رہیں۔ ثانیاً صورت حال کے یکسر بدل جانے سے اب جب سابقہ سیاسی رویے کی فرسودگی پوری طرح واضح ہو چکی تھی اس رویے کو یکسر ٹھکرا کر ایک نئے رویے کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ثالثاً، متحدہ قومیت کا انکار یا اقرار کئے بغیر اب نئی صورت حال کے پیش نظر کتاب وسنت کی رہنمائی میں ایک نیا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے لیکن ایسا کرنے میں بھی اپنی ناکامی کا اعتراف اور سابقہ سیاسی رویے سے اپنی برات کا اظہار کرنا پڑتا۔ پھر تقسیم کے بعد مسلمانوں کی جان و مال کو جو سخت خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور ہر طرف جس بڑے پیمانے پر قتل عام کا بازار سجایا جا رہا تھا اس نے قائدین کو کسی نئی ابتداء کے بجائے ایک ایسے عمل پر مجبور کر دیا جس کا ماحصل صرف اور صرف یہ تھا کہ اس ملک میں زندگی کی امان پانے کے لئے کچھ جواز فراہم ہو جائے۔ لہٰذا ابتدائی دنوں میں ہماری سیاسی رہنمائی بنیادی سوالوں سے بڑی حد تک اپنا دامن بچائے رہی۔ لکھنو کنونشن، جسے نئے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں مسلمانوں کے پہلے سیاسی اجتماع کی حیثیت حاصل ہے، وہاں اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوا کہ چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کیا گیا کہ مسلمان اس ملک کے وفادار ہیں، لہٰذا اپنی اس وفاداری اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی خدمات کے طفیل انہیں بھی زندگی جینے کا حق دے دیا جائے۔ جمعیۃ العلماء کے ایک سرکردہ عالم مولانا حفظ الرحمن نے اپنی وفاداری کا اعلان کچھ اس طرح کیا:

> بے شک ہم وفادار ہیں مگر صرف مادر وطن کے وفادار ہیں۔ کانفرنس نے تمھیں مشورہ دیا ہے کہ مشترک سیاست میں حصہ لو اور کسی ایسی سیاسی جماعت میں شرکت کرو جو ہندو اور مسلمانوں کے لئے برابر ہو، میں کہتا ہوں کانگریس میں شرکت کرو کیونکہ اس سے بہتر کوئی جماعت ہمارے سامنے نہیں ہے مگر کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے کانگریس میں ہرگز شریک نہ ہو۔ اگر تم پناہ ڈھونڈنے کے لئے کسی جماعت میں شریک ہوتے ہو تو اس سے نہ جماعت کو فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ تمہاری شرکت ملک کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔
>
> (الجمعیۃ، قومی اتحاد کانفرنس نمبر، ص ۲۳)

مولانا آزاد جنھیں اب تک ہندوستانی مسلمانوں سے یہ شکایت تھی کہ انہوں نے متحدہ قومیت کے نعرے پر کھلے دل سے ان کا ساتھ نہیں دیا ہے اور جو نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی امید کا واحد مرکز بن گئے تھے، انھوں نے اس کانفرنس میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ مسلمان اب نئی صورت حال میں کھلے دل سے ان کا ساتھ دیں، مشترکہ سیاست میں حصہ لیں اور ملک کی تعمیر و ترقی میں ان کا اور اہل وطن کا ہاتھ بٹائیں البتہ نئے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا اس بارے میں مایوسی، خوف اور اندیشے ان کے دل و دماغ پر بری طرح طاری تھے۔ اپنے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر تو دور کی بات اب تو انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے قریبی رفقاء اور ان کی نئی حکومت مسلمانوں سے ان کی اسلامی شناخت چھین لینے کے درپے ہے۔ مولانا کی یہی مایوسی اور خوف خطابت میں کچھ اس طرح ڈھل گئی:

> میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔
>
> (ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی، فرقہ واریت مخالف کنونشن نمبر، ص ۴۵)

لکھنو کانفرنس نئے ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کسی نئے سیاسی رویے کی داغ بیل نہ ڈال سکی۔ اس وقت جو مسئلہ سب سے اہم تھا وہ یہ کہ کسی طرح مسلمانوں کی جان و مال بچالی جائے، ان کا کھویا ہوا حوصلہ بحال ہو اور حکومت وقت کو یہ یقین دلایا جائے کہ ملک کے ۴ کروڑ مسلمان وفاداری میں دوسرے اہل وطن سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ اب ان کا مفاد اس ملک کے مفاد سے وابستہ ہے اگر وہ اس ملک میں اپنا کوئی مستقبل دیکھتے ہیں تو یہ دوسری اقوام کے مستقبل سے مختلف کوئی مستقبل نہیں۔ حتیٰ کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ملی مفاد بھی تقسیم ہو چکا ہے اور امت مسلمہ کا وہ حصہ جو ہماری جغرافیائی سرحدوں سے باہر ہے، ہندوستانی مسلمان ان کے مسائل اور مفادات سے کچھ بھی غرض نہیں رکھتے۔ ان ہی دنوں علمائے ہند کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی تقریر میں اس نکتے کی وضاحت کچھ اس طرح کی:

> تقسیم ہند نے مسلم مفادات بھی تقسیم کردیئے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو چیز پاکستانی

مسلمانوں کے لئے مفید ہو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی مفید ہو بلکہ ممکن ہے کہ کوئی معاملہ پاکستانی مسلمانوں کے لئے مفید ہو اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہو۔ ظاہر ہے کہ ہم پر پاکستانی مسلمانوں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی وہ خود اپنے ذمہ دار ہیں۔ ہم پر انڈین یونین کے ۴ کروڑ مسلمانوں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہمیں ہر موقع پر وہ صورت اختیار کرنی ہے جو انڈین یونین کے مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔ ہم اسلامی تعلیمات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے جس قدر اس پر صحیح طور سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں گے اسی قدر وطن عزیز کے بہترین بہادر محافظ اور اس کے اہم ترین جز ثابت ہوں گے۔

(الحرم میرٹھ۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی نمبر، ص ۱۱۱)

گویا سیاسی رہنماؤں کی پہلی نسل نے مسلمانوں کو جس راہ پر لے چلنے کی کوشش کی اس میں اسی بات پر زور تھا کہ وطن عزیز کے لئے بہترین اور بہادر محافظ کا کام ان سے لیا جائے۔ ان کے اندر وطن پرستی اور وطن کی خدمت کا جذبہ بیدار کیا جائے تاکہ پاکستان کے بننے سے ہندوستانی مسلمانوں کے دامن پر جو داغ لگا تھا اسے کسی حد تک دھویا جاسکے۔ دیکھا جائے تو پہلے دور کی سیاست بڑی حد تک اسی Guilt Complex کی مرہون منت ہے۔ ساری کوشش اس بات کی ہو رہی ہے کہ ہم پر وطن سے بے وفائی کا جو الزام ہے، ایک علیحدہ شناخت اور علیحدہ قومیت کے قیام کا جو الزام ہے، اسے کسی طرح دھویا جاسکے۔ ظاہر ہے کسی ایسی مجروح ذہنیت کو باحوصلہ اور بالغ نظر قیادت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ متحدہ قومیت کے تلخ نتائج کے سامنے آجانے کے باوجود آزاد اور ان کے رفقاء کے لئے کسی نئے راستے کی نشاندہی کا کام مشکل رہا۔ رہے یہ سوالات کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی منزل کیا ہوگی؟ وہ اس ملک میں اپنے لئے کون سا سیاسی نظام پسند کرتے ہیں اور کسی ایسی سیاسی منزل کے حصول کے لئے کیا کچھ کرنا ہوگا؟ تو ان سوالات کا وقتاً فوقتاً اجمالی جواب فراہم کرنے کی کوشش تو کی گئی لیکن جس انداز سے ان اہم بنیادی سوالوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی اس نے مسئلے کو نظری طور پر سلجھانے کے بجائے مزید الجھا دیا۔

آزادؒ ہوں یا مدنیؒ یہ دونوں حضرات عام سیاسی لوگ نہ تھے بلکہ ان کی دین اور اس کے مطالب پر بھی گہری نظر تھی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان میں ان کے

کرنے کا کام کیا ہے بلکہ آزاد نے تو اپنے کیریر کا آغاز ہی حزب اللہ جیسی انقلابی تنظیم کے خدوخال مرتب کرنے سے کیا تھا۔ سابق دارالاسلام کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کے خواب سے وہ زندگی بھر اپنا پیچھا نہ چھڑا سکے۔ اور مولانا مدنی ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے اہم دینی درسگاہ کے سربراہ تھے۔ انھیں ایک سیاسی Visionary کی حیثیت حاصل نہ بھی ہو پھر بھی درس وارشاد کے حوالے سے وہ داعی تو غلبہ اسلام کے ہی تھے۔ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی منزل متعین کرنے کا سوال جب بھی آیا، ان حضرات نے اشارہ اسلام اور اسلامی اقدار کے غلبے کی طرف ہی کیا۔ البتہ راستے کی یہ نشاندہی اتنی مبہم، مجمل اور غیرواضح تھی کہ اس سے کسی واقعی سمت کا پتہ چلنا مشکل تھا۔ واضح طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ حضرات وطن عزیز کی وفاداری اور اللہ کی وفاداری کے درمیان ایک کشمکش سے دوچار ہوں۔ ایک طرف تو ان کے ذہنوں پر اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا خواب چھایا ہوا تھا اور دوسری طرف خودساختہ سیاسی نظریات بالکل مخالف سمت میں ان کے قدموں کو لئے چلتے تھے۔ اس کشمکش نے آزاد کو آنے والے دنوں میں سخت قنوطیت، مایوسی اور احساس شکست سے دوچار کردیا اور حسین احمد مدنی سیاست کے میدان سے بڑی حد تک کنارہ کشی اختیار کرکے درس وارشاد اور گوشہ نشینی پر مجبور ہوگئے۔ ان بزرگوں کے دل ودماغ میں خواب اور عمل کی کشمکش کس شدت کے ساتھ برپا تھی اس کا کچھ اندازہ حسین احمد مدنی کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے نئے ہندوستان میں اسلام کے روشن مستقبل کے سلسلے میں کی تھی:

> عام شہری کی زندگی میں جو تلخی اس وقت موجود ہے وہ عارضی ہے۔ یقین ہے کہ جلدی ہی یہ تلخی خوش گوار تعلقات کی شیرینی سے بدل جائے گی۔ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل زیادہ شاندار اور روشن ہو تو ان کا فرض ہے کہ اپنے عمل وکردار سے اپنی اہمیت وافادیت ثابت کریں۔ انڈین یونین کے لئے وہ جس قدر زیادہ مفید ثابت ہونگے اتنی ہی ان کی عزت ووقعت ہوگی۔ جمہوری نظام حکومت میں نسل مذہب خاندان ترقی کا مدار نہیں ہوتا بلکہ خدمت وقابلیت معیار ترقی ہوا کرتی ہے۔ ملک وملت کی خدمت کا صحیح جذبہ اور بہترین قابلیت پیدا کریں، لامحالہ کامیابی وکامرانی ان کے ہم آغوش ہوگی۔
>
> (الجمعیۃ میرٹھ، حضرت مدنی نمبر، ص ۲۱۱)

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء تک ملک بھر میں منعقد ہونے والے سیاسی اور غیر سیاسی اجلاس میں جو گفتگو سننے کو ملتی ہے اس میں کم و بیش اسی قسم کی باتیں سامنے آتی ہیں۔ رہی یہ بات کہ ملک و ملت کی خدمت کا صحیح جذبہ کیسے پیدا ہوگا اور خود "خدمت" سے دراصل کون سی خدمت مراد ہے اور یہ سب کچھ کس "شاندار" اور "روشن مستقبل" کی طرف لے جائے گا اس کی تفصیلات سے یا تو دانستہ دامن بچانے کی کوشش کی گئی یا ان حضرات کے ذہنوں میں سرے سے کوئی واضح خاکہ موجود نہ تھا۔ لکھنو کنونشن سے بلند ہونے والی آواز نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جس سیاسی راستے کی نشاندہی کی تھی اسے مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) یہ بات تسلیم کرلی گئی تھی کہ ملک اور ملت کے مفاد میں کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا مسلمانوں کو ملک و ملت کے مفاد میں کام کرنا چاہیے۔

(۲) مشترکہ سیاست کو واحد سیاسی لائحہ عمل کے طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی منشور کی بنیاد کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اب اگر اس ملک میں کوئی سیاسی جدوجہد ہوسکتی تھی تو غیر مسلم اقوام کے ساتھ مل کر ہی۔

(۳) ہندوستانی مسلمانوں کا مفاد اب جغرافیائی حدود میں محدود تھا اور جو کچھ ان کے حق میں مفید ہوسکتا تھا بعینہ یہی چیز ہندوستان کے باہر مسلم قوم کے لئے مضر ہوسکتی تھی۔ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کو صرف اپنے مسائل سے غرض رکھنی تھی۔ عالم گیر امت کے مفاد پر اب متحدہ قومیت غالب آچکی تھی۔

(۴) یہ بات تسلیم کرلی گئی تھی کہ نظام حکومت اب لبرل ڈیموکریسی کے اصولوں پر مرتب کیا جائے گا جس میں سیکولرازم کو ایک بنیادی نظری فلسفے کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اب مسلمانوں کو اسی نظام کے اندر رہتے ہوئے اپنا راستہ بنانا تھا۔

(۵) یہ بات بھی تسلیم کرلی گئی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کا کوئی بھی خواب دوسری ہم وطن قوموں کے مستقبل سے جدا نہ ہوگا۔ نئے ہندوستان کی تعمیر کے لئے ہندو اور مسلمان مشترکہ طور پر جدوجہد کریں گے۔ گویا ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت (Destiny) اب ملک کی قسمت سے وابستہ ہوگی۔

ان بنیادی اصولوں کے تعین کے بعد لکھنو کانفرنس نے یہ اعلان کیا کہ اب اس ملک میں ہندوستانی مسلمانوں کی کوئی علیحدہ سیاسی پارٹی یا علیحدہ سیاسی فکر نہیں ہوگی لہٰذا جمعیۃ العلماء جسے اب تک قوم پرست مسلمانوں کے سیاسی جرگے کی حیثیت حاصل تھی اسے ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے تحلیل کردیا گیا اور اس کا کام صرف یہ قرار پایا کہ وہ دینی اور ثقافتی مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی تک خود کو محدود رکھے۔ البتہ اگر جمعیۃ کے افراد انفرادی طور پر سیاست میں حصہ لینا چاہیں تو وہ کانگریس کے بینر تلے میدان میں آئیں۔ ان اعلانات سے تقسیم آزادی کا داغ مسلمانوں کے دامن سے شاید کسی حد تک دھل گیا ہو اور کسی حد تک متعصب ہندوؤں کی نظروں میں مسلمانوں کا اعتبار بھی قائم ہوگیا ہو، البتہ ان اعلانات نے آنے والے دنوں میں مسلمانوں کے سیاسی عزائم پر مہر لگادی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا خود کانگریسی حلقے کے مسلمانوں کو ایسا لگا جیسے لکھنو کانفرنس نے ان کے ہاتھ پیر باندھ دیئے ہوں۔ ۱۹۶۴ء میں اسی احساس کی شدت نے سید محمود کو روایتی سیاست سے بغاوت پر آمادہ کیا۔

سید محمود کو یہ احساس ستائے دیتا تھا کہ آخر مسلمان کانگریس کے ہاتھوں پے درپے ہزیمتیں اٹھانے کے باوجود اپنے آپ کو روایتی طور پر اس کا خادم کیوں گردانتے ہیں۔ اگر ملک میں دوسری سیاسی قوتیں نئے نعروں کے ساتھ سامنے آرہی ہیں تو مسلمان ان کی حمایت کیوں نہ کریں۔ گویا ایک سابقہ سیاسی رویے میں تبدیلی کی ضرورت ناگزیر ہے۔ سید محمود پر یہ بات بھی واضح ہوچکی تھی کہ اس ملک میں کانگریسی مسلمانوں کے علاوہ دوسری ملی اور دینی جماعتیں بھی سرگرم عمل ہیں جو امت کے احیاء اور اس کی سربلندی کے لئے بھلا برا کچھ نہ کچھ پروگرام رکھتی ہیں۔ پھر کیوں نہ ان گروہوں اور جماعتوں کا بھی تعاون حاصل کیا جائے کہ کانگریس کے مکار سیاستدانوں کے مقابلے میں تو بہرحال یہ جماعتیں زیادہ قابل اعتبار تھیں اور امت کے تئیں ان کی وابستگی شکوک و شبہات سے بالاتر تھی۔ لہٰذا پہلی مرتبہ نئے ہندوستان میں مسلم سیاست کانگریس سے الگ ہوکر ملی دھارے میں شامل ہوگئی۔ سید محمود نے معروف شخصیات، علماء اور سیاست دانوں کے علاوہ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کو بھی مل بیٹھنے اور مشترکہ ملی لائحہ عمل تیار کرنے کی دعوت دی تھی۔ کہنے کو یہ فی نفسہ ایک بڑا قدم تھا جس سے کانگریس کے حلقوں میں سید محمود کو تنقید کا نشانہ بننا پڑا لیکن اپنے اہداف میں نوتشکیل شدہ مسلم مجلس مشاورت سابقہ سیاسی رویے کا ہی تتمہ تھی، جس کا مقصد کسی نئے سیاسی رویے کی تشکیل نہیں بلکہ موجودہ نظام کے اندر ہی مسلمانوں کے اتحاد کے

ذریعہ ان کی سیاسی قیمت میں کچھ اضافہ کر دیتا تھا۔ مختلف سیاسی پارٹیوں تک سفارشیں پہنچائی گئیں اور کچھ لے دے کر مسلم ووٹوں کے عوض ملی مفادات کے حصول کی کوشش جاری رہی۔ لیکن عملی طور پر نہ تو سید محمود کسی نئے تجربے کے موڈ میں تھے اور نہ ہی اس کنونشن سے کسی واضح سیاسی راستے کی نشاندہی ہو سکی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ مسلمانوں کے باحوصلہ افراد میں آزادانہ سیاست کا امکان روشن ہوگیا۔ اسی تجربے سے حوصلہ پاکر آنے والے دنوں میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے مسلم مجلس کا ڈول ڈالا جس کے حیرت انگیز نتائج نے محدود وقفے کے لئے ہی سہی امکانات اور امیدوں کے بند دروازے کھول دیئے۔

۱۹۴۷ء کی لکھنو کانفرنس سے لے کر ۱۹۶۴ء کے لکھنو کنونشن تک ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی سفر جن بنیادی اصولوں پر جاری رہا اسے کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے :

لکھنو کانفرنس ۱۹۴۷ء زیر صدارت مولانا آزاد	لکھنو کانفرنس ۱۹۶۴ء زیر صدارت سید محمود
(۱) کانگریس مسلمانوں کی جان و مال کی محافظ ہے، اس لئے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہوجانا چاہیے۔	(۱) مسلمان کانگریس کے ہاتھوں پریشان ہوچکے ہیں اس لئے دوسری سیاسی پارٹیوں کو بھی آزمانا چاہیے۔
(۲) ملک کی سیاست میں مسلمانوں کو غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مشترکہ جدوجہد کرنی چاہیے۔	(۲) ملک کی سیاست میں مسلمانوں کو مؤثر بنانے کیلئے مسلم گروہوں اور جماعتوں کا اتحاد ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے متحدہ ووٹ کے ذریعہ کسی سیاسی پارٹی سے معاملہ کر سکیں۔
(۳) سیکولر جمہوری نظام میں خدمت کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنی حیثیت منوانی چاہیے اور اسی نظام کے اندر اپنی ترقی کا راستہ ڈھونڈنا چاہیے۔	(۳) مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ مل کر دستور کے جمہوری اقدار کے نفاذ کی سبیل پیدا کرنی چاہیے۔
(۴) مسلمانوں کو ملک کی ترقی کے لئے دوسروں سے کہیں بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنی چاہیے اس لئے کہ یہ ملک اتنا ہی ہمارا بھی ہے جتنا دوسری قوموں کا۔	(۴) مسلمانوں کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ملک کی ثقافتی، سماجی، معاشی اور سیاسی ترقی کے دھارے سے دور نہ ہوجائیں اور ملک کی ترقی میں بھرپور رول ادا کریں۔
(۵) جمعیۃ العلماء کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے تحلیل کیا جاتا ہے۔ آنے والے دنوں میں انفرادی طور پر مسلمان کانگریس کے پلیٹ فارم سے سیاست کریں گے، مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی شناخت نہیں ہوگی۔	(۵) مسلم جماعتوں کا وفاق ملک کی سیاست پر براہ راست اثرانداز ہوگا، البتہ کوئی ایسا سیاسی قدم نہیں اٹھایا جائے گا جس سے علیحدگی پسندی کا الزام لگ سکے یا علیحدہ مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کا امکان پیدا ہو۔

۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۴ء کی کانفرنسوں میں لب ولہجے کے فرق کے باوجود نظری اعتبار سے کسی واضح فرق کا سراغ نہیں ملتا۔ سید محمود نے یہ ہمت تو ضرور کی کہ کانگریس کے خول سے نکل کر انھوں نے دوسری ملی جماعتوں حتیٰ کہ مسلم لیگ کے ساتھ مل بیٹھنا قبول کرلیا اور اس طرح وہ یہ تاثر دینے میں کامیاب ہوگئے کہ مسلمانوں کا وجود کانگریس سے الگ ہوکر دینی بنیادوں پر امت کی دوسری جماعتوں کے ساتھ ایک اہم رشتہ رکھتا ہے۔ گویا ملی وفاداری سیاسی وفاداریوں پر سبقت لے جاسکتی ہے۔ البتہ اب تک وہ جس متحدہ قومیت کے اسیر رہ چکے تھے اس سے یکسر تائب ہونا ان کے لئے ممکن نہ ہوا۔

پھر ذاتی طور پر وہ ایک بہت مضبوط شخصیت کے مالک نہ تھے جس کا اظہار آزمائش کے ایک لمحے میں وائسرائے سے ذاتی خط وکتابت کے درمیان ہوچکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سید محمود کی ملی سرگرمیوں، مشاورت کے انعقاد اور اس میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی جیسی پارٹیوں کی شرکت پر ہندو دوستوں نے واویلا مچایا تو سید محمود نے اپنے ملی تصورات اور اسلامی شناخت پر اصرار کرنے کے بجائے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ وہ اس طرح فرقہ وارانہ مسلم جماعتوں کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ (حوالے کے لئے دیکھئے۔ سید محمود کی مرارجی ڈیسائی سے مراسلت) مروجہ مسلم سیاسی رویہ تو وہ اس عرصے میں کمزور ضرور ہوا جس کی بازگشت ۶۴ء کی کانفرنس میں سنائی دیتی ہے۔ البتہ بنیادی تصورات بڑی حد تک وہی رہے۔

۱۹۶۸ء میں عبدالجلیل فریدی کے راست سیاسی اقدام نے علیحدہ سیاست کی کامیابی کے امکانات تو ضرور روشن کردیئے اور بہت سے مضطرب ذہنوں میں نئے سیاسی تجربے نے ہلچل مچادی لیکن عبدالجلیل فریدی کو کچھ تو زندگی نے اتنی مہلت نہ دی اور نہ ہی انہیں ایسے رفقائے کار میسر آئے جو اس مشن کو فکری بنیادوں پر منظم کرنے کا کام کرتے۔ مسلم مجلس کا تجربہ تاریک راتوں میں جگنو کی مانند ہے جس سے روشنی کا احساس تو یقیناً ہوتا ہے لیکن یہ روشنی اتنی کافی نہیں کہ کسی واضح راستے کی نشاندہی کرسکے۔ حیرت ہے کہ فریدی کے حیرت انگیز تجربے نے ہمارے سیاسی مفکرین کو اس طرف متوجہ نہ کیا کہ وہ ملک میں نئے سیاسی میزانئے کی تشکیل کے لیے کوئی نئی حکمت عملی ترتیب دیتے۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو شاید یہ ہو کہ فریدی کے تجربے نے صرف امکانات کی ایک دنیا نہیں دکھائی تھی بلکہ سیاست کی بساط پر پائی جانے والی بڑی بڑی ناانصافیوں اور مسلم سیاست کی راہ میں امکانی خطرات کی نشاندہی بھی کردی

تھی۔ آج بھی کسی نئی مسلم سیاسی قوت کے احیاء کی راہ میں وہ رکاوٹیں جوں کی توں برقرار ہیں جن کا تذکرہ ہم آگے کریں گے۔

۱۹۶۴ء کی لکھنو کانفرنس کو اس اعتبار سے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں اہمیت حاصل رہے گی کہ یہاں گو کہ نئے رویے کی بنیاد نہیں رکھی گئی لیکن سابقہ سیاسی رویے سے بیزاری اور نئے رویے کی ضرورت کا اظہار ضرور کیا گیا۔ آنے والے دنوں میں جب ملک کے سیاسی افق پر سیکولرازم اور لبرل جمہوری اقدار کے غازے کی ضرورت باقی نہ رہی اور جب ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد کھلم کھلا مسز گاندھی نے فاتح ہندو دیوی کا روپ اختیار کر لیا تو مسلمانوں میں نئے سیاسی متبادل کی تلاش ہونے لگی۔ آگے چل کر بابری مسجد کے قضیے نے بی جے پی اور کانگریس کے درمیان ہندو کارڈ کی مسابقت مزید تیز کر دی۔ گویا اب مسلمانوں کے لئے کانگریس سے دور کوئی سیاسی سہارا تلاش کرنا ناگزیر ہو گیا۔ اسی اثناء ملک کے افق پر علاقائی پارٹیاں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کی سیاسی پارٹیاں متبادل کے طور پر مسلمانوں کے سامنے آئیں۔ ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۶ء تک لوک سبھا کے انتخابات میں مسلمانوں کی سیاسی حکمت عملی بنیادی طور پر سید محمود کی سیاسی حکمت عملی کا تتمہ ہے، جس میں مسلم ووٹوں کے اجتماعی استعمال کا رجحان سامنے آتا ہے اور ہر چھوٹی بڑی سیاسی پارٹی سے اس ووٹ کے عوض مراعات طلبی کی کوشش کی جاتی ہے

سال	مسلم اراکین کی تعداد	%تناسب
1947 (جداگانہ طریقہ انتخاب رائج تھا)	31	13.10
1952	36	7.21
1957	24	4.47
1962	32	6.27
1967	29	5.68
1971	27	5.00
1977	32	6.03
1980	46	8.50
1984	41	7.60
1989	33	6.31
1991	28	5.03
1996	27	5.00

مسلم اراکین پارلیامنٹ (لوک سبھا)

ہمارے لئے یہ سوال بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ اپنے اس پچاس سالہ سفر میں ہندوستانی مسلمان کہاں سے کہاں پہنچے ہیں۔ کیا نئے ہندوستان میں ہم من حیث الامت کوئی واضح سیاسی راستہ بنانے میں کامیاب ہوسکے ہیں؟ اگر نہیں تو اس بات کا پتہ چلایا جائے کہ آخر اس راہ میں کیا کیا رکاوٹیں رہی ہیں؟ انہیں کس حد تک دور کرنے کی کوشش کی گئی اور اس عمل میں ہم کس حد تک کامیاب ہوسکے؟ ناکام تجربوں کے علاوہ کامیاب تجربے آخر ٹھٹھر کر کیوں رہ گئے؟ پھر ہم ان بنیادی سوالوں کے جواب فراہم کرنے کی کوشش بھی کریں جن سے کسی وجہ سے سیاسی قائدین کی پہلی نسل نے اپنا دامن بچایا تھا یعنی یہ کہ اس ملک میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی منزل کیا ہے؟ پھر ہم حقائق کی دنیا میں اس بات کے تعین کی بھی کوشش کریں گے کہ فی زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ممکنہ سیاسی متبادل کیا اور کیا ہوسکتے ہیں؟ لیکن اس سے پہلے کہ ہم بعض بنیادی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں آئیے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ موجودہ سیاسی نظام میں کسی مسلم سیاسی قیادت کے احیاء کا امکان اگر ہے تو کس حد تک؟

ہندوستانی پارلیامنٹ (لوک سبھا) کوئی پانچ سو چوالیس (۵۴۴) اراکین پر مشتمل ہوتی ہے جس میں سے دو نشستوں پر صدر جمہوریہ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اینگلو انڈین کمیونٹی کے دو افراد کو نامزد کرسکتا ہے اگر وہ الیکشن کے ذریعہ پارلیامنٹ میں نہ آسکیں۔ اب ان ۵۴۲ نشستوں میں ۱۲۰ نشستیں شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کے لئے مخصوص کردی گئی ہیں۔ گویا کھلا مقابلہ صرف ۴۲۲ نشستوں پر ہے جن میں اگر مسلمان چاہیں تو اپنے نمائندے کھڑا کرسکتے ہیں۔ موجودہ سیاسی نظام کی ایک بڑی بے انصافی تو یہ ہے کہ طاقتور مسلم حلقہ ہائے انتخابات کو درج فہرست ذاتوں کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے اور دوسری طرف مسلم حلقوں کی تقسیم کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ ان میں مسلم ووٹوں کی اہمیت تحلیل ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ مشترکہ نظام انتخاب میں پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی تعداد ان کی اصل تعداد کے مقابلے میں ہمیشہ کم رہی ہے۔ البتہ ابتدا میں جب جداگانہ طریقہ انتخاب کو ختم نہیں کیا گیا تھا تو پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی تعداد ۱۳ فیصد تھی جو بعد کے دنوں میں ۸ فیصد سے زیادہ نہیں ہوسکی لیکن اس کے باوجود موجودہ سیاسی نقشے میں اب بھی کم از کم جو بیس ایسی پارلیمانی نشستیں

پارلیامنٹ میں درج فہرست ذاتوں کے لئے مخصوص نشستیں

(برائے بارہویں لوک سبھا انتخابات)

صوبے / یونین ٹیریٹریز	لوک سبھا میں مخصوص نشستیں		کل تعداد
	SC	ST	
آندھرا پردیش	6	2	42
اروناچل پردیش	-	-	2
آسام	1	2	14
بہار	8	5	54
گوا	-	-	2
گجرات	2	4	26
ہریانہ	2	-	10
ہماچل پردیش	1	-	4
جموں وکشمیر	-	-	6
کرناٹک	4	-	28
کیرالہ	2	-	20
مدھیہ پردیش	6	9	40
مہاراشٹر	3	4	48
منی پور	-	1	2
میگھالیہ	-	-	2
میزورم	-	1	1
ناگالینڈ	-	-	1
اڑیسہ	3	5	21
پنجاب	3	-	13
راجستھان	4	3	25
سکم	-	-	1
تامل ناڈو	7	-	39
تری پورا	-	1	2
اتر پردیش	18	-	85
مغربی بنگال	8	2	42
انڈمان اور نکوبار	-	-	1
چنڈی گڑھ	-	-	1
دادراور نگر حویلی	-	1	1
دمن اور دیو	-	-	1
دہلی	1	-	7
لکشدیپ	-	1	1
پانڈیچری	-	-	1
کل	79	41	543

موجود ہیں جہاں مسلمان اپنی بنیادوں پر الیکشن جیت سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ان مسلم پارلیمانی حلقوں کو آزاد کرالیا جائے جنہیں درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لئے مختص کردیا گیا ہے تو موجودہ سیاسی نظام کی خامیوں کے باوجود مسلمان ایک قوت بن کر ابھر سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسلم سیاسی قوت کے احیاء کا اتنا واضح امکان موجود ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ اب تک ان امکانات سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا؟ گزشتہ پچاس سالہ مسلم سیاسی رویے کے احتساب

کے لئے یہ سوال بنیادی اہمیت اختیار کرلیتا ہے۔
اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے ذہن سے امکانات کا یہ پہلو پوری طرح اوجھل نہیں رہا ہے۔

مسلم پارلیمانی حلقہ ہائے انتخاب

(جہاں مسلمان اب بھی صرف اپنی بنیادوں پر کامیاب ہو سکتے ہیں)

صوبے	حلقوں کے نام	مسلم آبادی کا تناسب
آسام	دھبری	43.40
	سلچر	39.10
آندھرا پردیش	حیدر آباد	38.00
بنگال	برہم پور	55.90
	جانگی پور	55.27
	مرشد آباد	55.19
	رائے گنج	39.04
	مالدہ	43.00
بہار	کشن گنج	37.00
	کٹیہار	39.10
یوپی	رام پور	45.00
	مراد آباد	42.00
	امروہہ	37.03
کشمیر	اننت ناگ	95.40
	بارہ مولہ	97:30
	سری نگر	90.60
کیرالا	پونانی	60.10
	مانجیری	60.90
	کالی کٹ	51.50
لکشدیپ		98.00

وقتاً فوقتاً مسلم سیاست کی نئی صف بندی پر گفتگو بھی ہوتی رہی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ جنوب میں مسلم لیگ کے تجربے اور شمال میں مختصر عرصے کے لئے مسلم مجلس کے کامیاب تجربے سے اس نہج پر

سوچنے کا سراغ ملتا ہے۔ پھر ایک مختصر لمحے کے لئے ہی سی بنگال کی سطح تک مسلم لیگ کا تجربہ اسی نظریے کی غمازی کرتا ہے۔ البتہ ان محدود کامیاب تجربوں کے باوجود علیحدہ سیاسی صف بندی ایک طاقتور متبادل کی حیثیت سے اگر اب تک اپنی شناخت نہیں بنا سکی ہے تو اس کی بنیادی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ

بیس فیصد سے زائد مسلم آبادی والے لوک سبھا کے ۱، حلقوں میں
کفار و مشرکین کی بندر بانٹ

سال	پارٹیوں کے نام				
	کانگریس	جن سنگھ / بھاجپا	سوشلسٹ / لوک دل جنتا پارٹی / جنتادل	بائیں بازو کی جماعتیں	مقامی پارٹیاں و دیگر
1952	37	00	1	8	2
1957	49	1	3	6	5
1962	36	2	6	6	13
1967	29	9	8	10	13
1971	49	3	-	14	5
1977	16	-	39	11	5
1980	34	-	15	16	6
1984	45	-	3	11	12
1989	13	1	23	15	11
1991	11	16	13	17	7
1996	14	15	7	18	17

فکری اور نظری طور پر ملک کی مسلم سیاست آزاد کے لکھنو کنونشن سے اب تک خود کو پوری طرح آزاد نہیں کر پائی ہے۔ مسلم سیاست سے متعلق بعض بنیادی سوالات جس طرح لکھنو کنونشن میں حل طلب تھے اسی طرح آج بھی ان سوالوں پر ایک سنجیدہ بحث مطلوب ہے۔

مسلم حلقہ ہائے انتخاب (لوک سبھا)

(وہ پارلیمانی حلقے جہاں مسلمان پندرہ فیصد یا اس سے زائد ہیں)

لوک سبھا حلقے	مسلم تناسب
آندھرا پردیش	
۱۔ گنٹور	۱۵
۲ کڈپا	۱۵
۳۔ کرنول	۱۷
۴۔ نندیال	۱۷
۵۔ حیدرآباد	۴۲
۶۔ سکندرآباد	۱۸
۷۔ میڈک	۱۵
۸۔ نظام آباد	۱۵
آسام	
۹۔ بارپیٹا	۳۸
۱۰۔ دھبری	۵۵
۱۱۔ گوہاٹی	۲۴
۱۲۔ کلیابور	۲۹
۱۳۔ کریم گنج ★	۴۵
۱۴۔ منگل دوئی	۲۴
۱۵۔ نوگانوں	۳۴
۱۶۔ سلور	۳۰
بہار	
۱۷۔ ارریا ★	۲۸
۱۸۔ بگہا ★	۱۸
۱۹۔ بتیا	۲۲
۲۰۔ بھاگل پور	۲۰
۲۱۔ دربھنگا	۲۲
۲۲۔ گیا ★	۱۵
۲۳۔ گری ڈیہہ	۱۵
۲۴۔ گوڈا	۱۵
۲۵۔ گوپال گنج	۱۶
۲۶۔ کٹیہار	۳۷
۲۷۔ کشن گنج	۶۶
۲۸۔ کوڈرما	۱۵
۲۹۔ مدھوبنی	۲۳
۳۰۔ موتی ہاری	۱۵
۳۱۔ مظفرپور	۱۵
۳۲۔ پورنیا	۲۹
۳۳۔ راج محل ★	۲۵
۳۴۔ شیوہر	۱۸
۳۵۔ سیتا مڑھی	۱۶
۳۶۔ سیوان	۱۷
دھلی	
۳۷۔ چاندنی چوک	۲۲
۳۸۔ مغربی دہلی	۱۵
گجرات	
۳۹۔ احمد آباد	۱۵
۴۰۔ بھڑوچ	۱۷
۴۱۔ کچھ	۱۹
۴۲۔ فرید آباد	۲۵
جموں و کشمیر	
۴۳۔ اننت ناگ	۹۵
۴۴۔ بارہ مولا	۹۷
۴۵۔ جموں	۲۸
۴۶۔ لداخ	۴۶
۴۷۔ سری نگر	۹۰
۴۸۔ اودھم پور	۳۱
کرناٹک	
۴۹۔ بنگلور شمالی	۱۷
۵۰۔ بیدر ★	۱۸
۵۱۔ بیجاپور	۱۶
۵۲۔ دھارواڑ شمالی	۱۶
۵۳۔ دھارواڑ جنوبی	۱۵
۵۴۔ گلبرگہ	۱۷
کیرالا	
۵۵۔ انڈور ★	۱۶
۵۶۔ بڈاگرا	۳۰
۵۷۔ کالی کٹ	۳۵
۵۸۔ کنانور	۲۵
۵۹۔ ارناکلم	۱۶
۶۰۔ چرین کیل	۱۷
۶۱۔ کاسرگوڑ	۲۷
۶۲۔ منجیری	۵۶
۶۳۔ اوٹاپالم	۲۰

لوک سبھا حلقے	مسلم تناسب
۶۴۔ پال گھاٹ	۱۷
۶۵۔ پنانی	۲۶
۶۶۔ تری چور	۱۵
۶۷۔ لکشدیپ ★	۹۵
مدھیہ پردیش	
۶۸۔ بھوپال	۱۸
۶۹۔ کھنڈوا	۱۵
مہاراشٹر	
۷۰۔ آکولہ	۱۵
۷۱۔ اورنگ آباد	۱۹
۷۲۔ ممبئی شمال۔مغرب	۱۵
۷۳۔ جالنا	۱۵
۷۴۔ مالیگاؤں ★	۱۵
۷۵۔ نان دیڑ	۱۵
۷۶۔ پربھنی	۱۵
۷۷۔ شولا پور	۱۵
راجستھان	
۷۸۔ بھرت پور	۱۶
۷۹۔ جے پور	۱۵
اترپردیش	
۸۰۔ آگرا	۱۵
۸۱۔ اکبرپور ★	۱۵
۸۲۔ علی گڑھ	۱۸
۸۳۔ امروہہ	۳۷
۸۴۔ آنولہ	۱۸
۸۵۔ بدایوں	۱۸
۸۶۔ باغپت	۱۶

لوک سبھا حلقے	مسلم تناسب
۸۷۔ بہرائچ	۲۳
۸۸۔ بلرام پور	۲۸
۸۹۔ بارہ بنکی ★	۲۰
۹۰۔ بریلی	۲۸
۹۱۔ بجنور ★	۳۸
۹۲۔ بلند شہر	۱۹
۹۳۔ چایل ★	۱۸
۹۴۔ ڈومریا گنج	۲۶
۹۵۔ گونڈا	۱۷
۹۶۔ ہاپڑ	۲۱
۹۷۔ ہری دوار ★	۲۶
۹۸۔ کیرانا	۲۹
۹۹۔ کیسر گنج	۲۳
۱۰۰۔ کانپور	۱۷
۱۰۱۔ خلیل آباد	۳۰
۱۰۲۔ کھیری	۱۶
۱۰۳۔ کھورجا ★	۲۱
۱۰۴۔ لال گنج ★	۱۷
۱۰۵۔ لکھنو	۲۳
۱۰۶۔ میرٹھ	۳۰
۱۰۷۔ مراد آباد	۴۰
۱۰۸۔ مظفر نگر	۲۷
۱۰۹۔ نینی تال	۱۷
۱۱۰۔ پڑرونا	۲۷
۱۱۱۔ پیلی بھیت	۱۹
۱۱۲۔ رام پور	۴۲
۱۱۳۔ سہارن پور	۳۸

لوک سبھا حلقے	مسلم تناسب
۱۱۴۔ سنبھل	۲۷
۱۱۵۔ شاہ آباد	۱۶
۱۱۶۔ شاہ جہاں پور	۲۱
۱۱۷۔ سیتاپور	۱۹
مغربی بنگال	
۱۱۸۔ آسنسول	۱۵
۱۱۹۔ بالورگھاٹ ★	۱۶
۱۲۰۔ بسیرہاٹ	۴۳
۱۲۱۔ برہام پور	۴۳
۱۲۲۔ وری بھوم ★	۳۵
۱۲۳۔ بول پور	۲۴
۱۲۴۔ بردوان	۱۹
۱۲۵۔ کوچ بہار ★	۲۲
۱۲۶۔ دارجلنگ	۱۵
۱۲۷۔ ڈایمنڈ ہاربر	۳۲
۱۲۸۔ جادو پور	۱۹
۱۲۹۔ جانگی پور	۵۹
۱۳۰۔ جے نگر ★	۲۹
۱۳۱۔ کٹوا	۲۱
۱۳۲۔ کرشنا نگر	۳۲
۱۳۳۔ مالدا	۴۰
۱۳۴۔ متھرا پور ★	۲۰
۱۳۵۔ مرشد آباد	۵۸
۱۳۶۔ رائے گنج	۵۵
۱۳۷۔ شری رام پور	۱۶
۱۳۸۔ تملک	۱۵
۱۳۹۔ اولوبیریا	۲۲

★ وہ حلقے جو نچلی ذات کے ہندوؤں کے لئے مخصوص کرلئے گئے ہیں۔

سیاسی امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھانے اور نئی بااعتماد سیاسی صف بندی کے لئے لازم تھا کہ ہندوستان میں مسلم سیاست کے ہدف پر کھل کر گفتگو ہوتی اور یہ بات طے کرلی جاتی کہ سیاست میں مسلمانوں کی شرکت کا مقصد کیا ہے؟ وہ سیاست میں شرکت کے ذریعے کیا کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اگر مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے کچھ تحفظات حاصل کرلئے جائیں اور غیر مسلم آقاؤں سے زندگی جینے کی کچھ زیادہ مراعات حاصل کرلی جائیں یا ووٹوں کے عوض ان سے اپنی جان ومال کے تحفظ کا سودا طے کرلیا جائے تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ شاید یہ مقصد علیٰحدہ صف بندی کے مقابلے میں مختلف سیاسی پارٹیوں کی خوشنودی کے ذریعہ زیادہ آسانی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پھر جو لوگ دوسروں سے اپنی زندگی کے طالب ہوں یا جو اپنی زندگی کے لئے ارباب حکومت کی نگاہ کرم کو لازم خیال کرتے ہوں انہیں یقیناً علیٰحدہ سیاسی صف بندی ایک خطرناک سیاسی کھیل معلوم ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان امکانات کی موجودگی کے باوجود علیٰحدہ سیاسی صف بندی ایک طاقتور متبادل کی حیثیت سے مسلم سیاسی فکر میں اپنی جگہ بنانے میں اب تک ناکام رہی ہے۔

ایک دوسری اہم وجہ یہ بھی تھی کہ آزاد اور مدنی کی نسل کے بعد مسلم سیاست کو کوئی بالغ نظر شخصیت یسر نہ آسکی اور جو لوگ سیاسی میدان میں اپنی قسمت آزمائی کے لئے آئے ان کی حیثیت سیاسی طالع آزماؤں کی تھی۔ وہ کسی واضح سیاسی فکر کے ساتھ میدان میں نہیں آئے تھے۔ سابقہ سیاسی فکر سے بغاوت کے لئے ضروری تھا کہ فکری بنیادوں پر نیا سیاسی رویہ تشکیل دیا جاتا۔ ۱۹۶۴ء کی لکھنو کانفرنس نے جامد مسلم فکر میں ہلچل تو ضرور مچادی تھی لیکن بعد میں جن لوگوں نے سیاسی میدان کو اپنی سرگرمی کے لئے منتخب کیا ان کے پاس نہ تو کوئی سیاسی فلسفہ تھا اور نہ ہی وہ حوصلہ جو کسی نئے سیاسی فکر کی ترتیب کے لئے مطلوب ہوتا ہے۔ آزاد کے یہاں ذہن کے کسی گوشے میں تو یہ بات موجود تھی کہ وہ بنیادی طور پر مسلمان ہیں اور وہ اپنے اسلامی سرمائے کے کسی بھی حصے کو ضائع کرنا اپنا نقصان سمجھتے ہیں۔ البتہ بعد کی نسل اس بنیادی فکری چوکھٹے سے عاری تھی۔ اس کے پاس اگر کوئی مقصد تھا تو صرف یہ کہ سیاست کے میدان میں اپنے دوسرے ہم وطنوں کی طرح وہ بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ بنیادی طور پر یہ اس کا شخصی Ambition تھا اگر چلتے چلاتے اس Process میں امت کا بھی کچھ بھلا ہوجائے تو اس پر اسے کچھ اعتراض نہ تھا کہ ان تمام حضرات کو اپنی سیاست بہرحال مسلم حوالے سے کرنی تھی۔ سیاست

میں نظری رہنمائی اب ایک فضول چیز سمجھی جاتی تھی۔ علمائے کرام اور مشائخ، معتبر مصنفین اور شارحین اسلام، ان سبھوں نے سیاست سے یکسر کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ ملی تحریکیں ہوں یا وقتاً فوقتاً برپا کی جانے والی تحفظ شریعت کی مہمیں، یہ سب کی سب سیاست سے اپنا دامن بچاتی تھیں۔ سکہ بند علماء کے یہاں بھی اسلام کی سربلندی کا قافلہ سیاست کی راہ داری سے ہوکر نہیں گزرتا تھا اور جب سیاسی مسئلہ امت کے درمیان اتنا ناقابل اعتناء بن جائے تو عام مسلمانوں کو یہ سمجھنے میں کچھ دیر نہیں لگتی کہ سیاست کی دنیا اہل تقویٰ کی دنیا سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے۔ یہاں کسی قرآنی ہدایات کی ضرورت نہیں۔

مختلف ریاستوں میں مسلم آبادی کا تناسب

نمبر شمار	صوبے	مسلم آبادی کا تناسب
۱۔	آندھرا پردیش	9
۲۔	اروناچل پردیش	2
۳۔	آسام	29
۴۔	بہار	15
۵۔	گوا	5
۶۔	گجرات	9
۷۔	ہریانہ	5
۸۔	ہماچل پردیش	2
۹۔	کرناٹک	12
۱۰۔	کیرالا	24
۱۱۔	مدھیہ پردیش	5
۱۲۔	مہاراشٹر	10
۱۳۔	منی پور	7
۱۴۔	میگھالیہ	4
۱۵۔	میزورم	1
۱۶۔	ناگالینڈ	2
۱۷۔	اڑیسہ	2

نمبر شمار	صوبے	مسلم آبادی کا تناسب
۱۸۔	پنجاب	1
۱۹۔	راجستھان	8
۲۰۔	سکم	1
۲۱۔	تمل ناڈو	6
۲۲۔	تری پورا	7
۲۳۔	اتر پردیش	18
۲۴۔	مغربی بنگال	24
	یونین ٹیریٹریز	
۱۔	انڈومان و نکوبار	8
۲۔	چندی گڑھ	3
۳۔	دادر اور نگر حویلی	3
۴۔	دمن و دیو	9
۵۔	دہلی	10
۶۔	لکشدیپ	95
۷۔	پانڈیچری	7
	ہندوستان	12

آٹھویں دہائی میں جو لوگ مسلم سیاست کے حوالے سے میدان میں آئے ان کے یہاں سیکولرازم اور جمہوریت کے استحکام کا مسئلہ ایک جملہ معترضہ کے بجائے بنیادی فلسفے کی حیثیت اختیار کرچکا تھا۔ اب اگر مسلمان سیاسی میدان میں متحرک تھے تو اس لئے نہیں کہ "اپنی خدمت سے مسلم قوم کو نیک نامی بخشیں" یا یہ کہ "تاریخی اعتبار سے دوسروں کے مقابلے میں اس ملک کی خدمت ان پر کہیں زیادہ واجب تھی" بلکہ اب سارا زور اس بات پر تھا کہ ملک میں سیکولرازم کو فروغ ہو، جمہوریت جڑ پکڑے اور سیکولر آرڈر کو ہندو انتہا پسندوں سے جو خطرہ لاحق ہوگیا ہے اس کا سدباب کیا جاسکے۔ ان بے چاروں کو سرے سے اس بات کا شعور نہ تھا کہ ان کا تعلق کس امت سے ہے اور یہ کہ سیکولرازم اور جمہوریت کی ترویج واشاعت کے لئے انہیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے اس کام پر مامور نہیں کیا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ سیکولرازم کے یہ مبلغ اپنے نئے نظریاتی چوکھٹے کی وجہ سے اب پہلی نسل کے مقابلے میں کہیں زیادہ بااعتماد یا باحوصلہ ہوگئے تھے یا پچھلی نسل کے Guilt Complex سے انہوں نے اپنا دامن چھڑالیا تھا اس لئے کہ ملک سے وفاداری اور اس کے جا و بے جا اظہار کی رسم یہاں بھی ہنوز برقرار تھی۔ اگر کبھی کسی مرحلے میں ان حضرات سے کوئی ایسا قدم اٹھ گیا جس پر ان کی وطن پرستی پر سوالیہ نشان لگنے لگا یا ارباب اقتدار کی طرف سے لے دے ہونے لگی تو انہوں نے فوراً اپنا قبلہ تبدیل کرلیا اور ایک غلطی کے لئے ہزاروں سجدہ سہو کئے جانے لگے۔

ایک ایسی فضا میں جب مسلم سیاست کے لئے کوئی اساس موجود نہ ہو اور کسی نئے، بڑے اور انقلابی قدم کے لئے کوئی جواز موجود نہ ہو، کسی نئے سیاسی رویے کی تشکیل کا کام کیسے ممکن ہوسکتا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں مسلم مجلس مشاورت کو اپنے عوامی منشور کو برتنے میں جتنی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اس سے بھی کہیں زیادہ ناکامی اور مایوسی ۱۹۸۹ء کے مسلم سیاسی کنونشن کے منتظمین کے حصے میں آئی۔ ۱۹۶۷ء کے سیاسی تجربے نے ارباب مشاورت پر یہ بات واضح کردی تھی کہ مختلف سیاسی پارٹیوں میں پائے جانے والے "مسلم دوست" نمائندوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے باوجود عملی طور پر مشاورت کی جھولی میں کچھ بھی نہ آیا تھا۔ کچھ تو ان میں نرے مفاد پرست ثابت ہوئے اور کچھ پارٹی ڈسپلن کے آگے مجبور تھے۔ ۱۹۸۹ میں بھی اسی تجربے کو دہرانے کی کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کی طرف سے ایک منشور مطالبات ترتیب دیا گیا لیکن اس سے پہلے کہ یہ بیل منڈھے چڑھتی قائدین نے اپنی راہ بدل دی۔ حالانکہ بابری

مسجد اور شاہ بانو کی ہنگامہ خیز تحریکوں نے پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مسلم ووٹوں کے ارتکاز کا امکان پیدا کر دیا تھا لیکن اب بھی نظری طور پر چونکہ لوگوں کے ذہن صاف نہ تھے بلکہ سیاسی مسلمانوں کی ذہنی پراگندگی کا عالم یہ تھا کہ ان کی زبانیں اسلامی سیاسی فکر کی مخالفت میں بلا تکلف دلائل لاتی تھیں اور ان کی قابل ذکر اکثریت اس خیال کی حامل نہیں تھی کہ نئی مسلم سیاسی صف بندی کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی ہونا چاہئے۔ سیاست خواہ مسجد اور شریعت ہی کے حوالے سے کیوں نہ ہو لیکن یہ حضرات اس کے ذریعہ سیکولر آرڈر کا استحکام چاہتے تھے اور اگر معاملہ سیکولر آرڈر کے استحکام ہی کا ہو تو یہ کام ملک کی دوسری سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مل کر بھی انجام دیا جاسکتا تھا۔ پھر کسی نئی مسلم سیاسی صف بندی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کسی واضح سیاسی فکر سے محروم اور سیاسی منزل کے شعور سے خالی لوگوں کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک نئے سیاسی رویے کی بنیاد ڈالتے۔ نتیجتاً نئی مسلم سیاسی صف بندی کی شدید خواہش کے باوجود عملی طور پر یہ سوال التواء کا شکار رہا۔

گزشتہ پچاس برسوں کے فکری الحاد اور سیاسی میدان کو دینی رہنمائی سے مکمل الگ کر دینے کے سبب اس ملک میں نیا سیاسی رویہ تشکیل دینے والوں کو کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے بہت سے بنیادی سوالات کا جواب فراہم کرنا پڑے گا۔ مسلم سیاسی صف بندی کے لئے اگر کوئی جواز فراہم ہوسکتا ہے تو اسی صورت میں جب مسلمان نظری طور پر اس بات کو تسلیم کرلیں کہ ان کا بنیادی فریضہ اس ملک کو ایک سیاسی سمت عطا کرنا ہے۔ اگر موجودہ سیاسی روش کو ہی اعتبار بخشنا ہو یا محض اپنے لئے تحفظات کا دائرہ وسیع کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے اتنے انقلابی اور جرات مندانہ قدم کی ضرورت نہیں ہوگی۔ البتہ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کے سیاسی کارواں کی رہنمائی ان کی مذہبی ذمہ داری ہے اور خیر امت کی حیثیت سے اس کرہ ارض پر وہ قائدانہ منصب کے سب سے زیادہ سزاوار ہیں تو یقیناً ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر انہیں اس سمت میں قدم اٹھانا چاہئے اور موجودہ سیاسی امکانات کو اس مقصد کے لئے بھرپور استعمال کرنے کا جتن کرنا چاہئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ مسلمان اس سمت میں کوئی قدم بڑھائیں انہیں ان بنیادی سوالات کا جواب فراہم کرنا ہوگا جو ۴۷ء سے اب تک حل طلب ہیں اور ان کا غیر واضح، اجمالی اور مبہم جواب فراہم کرکے سیاسی قائدین کی پہلی نسل نے کچھ اس طرح الجھادیا ہے کہ اب اس کا واضح جواب فراہم کرنا ایک مجددانہ نظر چاہتا ہے۔ کیا مسلمان اپنی علیحدہ سیاسی صف بندی اس لئے کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے پاس

ملک کی دوسری قوموں کے مقابلے میں کوئی بہتر سیاسی فلسفہ موجود ہے؟ کیا اس ملک میں مسلمانوں کا سیاسی ایجنڈا دوسری قوموں سے مختلف ہے؟ کیا متحدہ قومیت کا تصور اور مشترکہ ایجنڈے کا تصور اب اپنی قدر و قیمت کھو چکا ہے؟ کیا مسلمانوں کا ملی مفاد ایک خالص نیشنلسٹ ملکی مفاد سے کسی قدر مختلف ہے؟ کیا ہندوستانی مسلمان سرحدوں سے باہر بھی ایک بین الاقوامی امت کی حیثیت سے عالمی سیاسی افق پر اپنا کوئی رول دیکھتے ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خوشگوار ہندوستان کی مسلم تعبیر کیا دوسری غیر مسلم تعبیروں سے مختلف ہے؟ ان سوالات کا واضح جواب فراہم کئے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی قافلے کے لئے کوئی راستہ بنانا ممکن نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان سوالات کا واضح جواب اس وقت تک فراہم نہیں ہو سکتا جب تک ہندوستانی مسلمانوں کا غبار آلود فکری مطلع صاف نہیں ہوتا۔ آئیے یہ دیکھیں کہ اپنے آپ کو دین کا سچا پیرو کہلانے والی امت بعض بنیادی فکری سوالوں پر گومگو کا شکار کیوں ہے؟ اس کے اندر فکری کج روی کہاں کہاں پیدا ہو گئی ہے اور نظری اعتبار سے غیر اسلامی، اجنبی، در آمد شدہ فکر نے بعض مسلمات پر کس طرح اپنا سایہ اتنا گہرا کر دیا ہے کہ اصل حقیقت نظر آنا مشکل ہو رہی ہے۔ کسی پیش قدمی سے پہلے لازم ہوگا کہ پچاس سالہ فکر کا جائزہ لیا جائے اور ان فکری التباسات سے پردہ اٹھایا جائے جو اس دوران مختلف خوش کن اصطلاحات کے سہارے ہمارے یہاں در آئے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کا نظریاتی انحراف

اسلام سے سیکولر ڈیموکریسی تک پچاس سالہ سفر کی ایک کربناک داستان

تقسیم ہند کے بعد بھارتی ہند میں کوئی چار کروڑ مسلمان رہ گئے تھے۔ ان چار کروڑ نفوس کی قیادت کے لئے اس ملک میں نامور علماء کرام، سیاسی شخصیات اور روحانی قائدین موجود تھے، پھر ہندوستانی مسلمانوں کے اہم دینی ادارے اور معروف علمی درس گاہیں بھی اسی ہندوستان میں موجود تھیں۔ دینی جماعتوں، انجمنوں اور مشائخ کے حلقے بھی منقسم طور پر ہی سہی ان کا بھی ٹوٹا بکھرا دائرہ یہاں موجود تھا۔ لیکن ان تمام روحانی و علمی شخصیات کی موجودگی کے باوجود نئے ہندوستان کی مسلم قیادت اس سوال کا کوئی واضح جواب فراہم کرنے سے قاصر رہی کہ بھارتی ہند میں مسلمانوں کا مقام کیا ہوگا اور یہ کہ آنے والے دنوں میں اس ملک میں مسلمان اپنے لئے کیا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تب سے اب تک کوئی پچاس سال گزرنے کے بعد بھی اس سوال کا کوئی واضح جواب فراہم کیا جانا باقی ہے۔ دیکھا جائے تو فطری اعتبار سے ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی مسلمانوں نے جس نامعلوم منزل کی طرف اپنے سفر کا آغاز کیا تھا آج بھی وہ اسی نامعلوم منزل کی طرف گامزن ہیں۔ مذہبی قائدین ہوں یا دینی جماعتیں، روحانی شخصیات ہوں یا خالص سیاسی مسلمان ان میں سے کسی کا ذہن شاید ہی اس مسئلے پر صاف ہو کہ وہ بالآخر اس امت کے کارواں کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ ان کی چلت پھرت اور دوڑ دھوپ آخر اس امت کو کس مقام پر فائز کرنے کے لئے جاری ہے اور جب مسافر کو منزل کا پتہ معلوم نہ ہو اور اپنے سفر کی اہمیت کا قطعی شعور نہ ہو تو اس کے قدموں کا مختلف اور متضاد راہوں میں اٹھ جانا غیر متوقع نہیں۔

تقسیم ہند کے وقت مسلمانوں کی روحانی قیادت بڑی حد تک دار العلوم دیوبند اور جمعیۃ العلماء

سے وابستہ علماء پر مشتمل تھی اور ابوالکلام آزاد بڑی حد تک سیاسی قیادت کا علامیہ سمجھے جاتے تھے۔ علمائے دیوبند ہوں یا ابوالکلام آزاد، ان حضرات سے امت کو بجاطور پر اس بات کی توقع تھی کہ وہ اپنے دینی علوم کی بنیاد پر امت کے لئے جو راستہ بھی منتخب کریں گے وہ کتاب و سنت سے الگ کوئی راستہ نہ ہوگا۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب اور افسوس ناک حقیقت ہے کہ بھارتی ہند میں اسلامیان ہند کے کارواں کا رخ متعین کرنے میں ان حضرات کے ذہنوں پر کتاب و سنت کے بجائے گاندھی جی کے خیالات کا زیادہ غلبہ رہا۔ ان بزرگوں کی تحریریں اور تقریریں پڑھ جائیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ حضرات دو وابستگیوں کے درمیان کوئی راستہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک طرف تو کتاب و سنت کے واضح ارشادات کا بوجھ ہے اور دوسری طرف متحدہ قومیت کے نظریئے سے نبھانے کی کوشش۔ فکری طور پر تو یہ حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کے قائل ہیں البتہ عملی طور پر گاندھی جی کی روحانیت کے آگے ان کے سر جھک گئے ہیں۔ ان دو وابستگیوں سے نبھانے کی کوشش میں شرعی اصطلاحات اور قیل و قال سے فکری پراگندگی کی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ مولانا حسین احمد مدنی کے سامنے جب یہ سوال رکھا گیا کہ کیا آزاد ہندوستان میں جہاں مسلمان اور غیر مسلموں کے تعاون سے ایک نظام حیات تشکیل دیا جائے گا اسے اسلام کا مطلوبہ نظام کہا جاسکے گا یا نہیں اور یہ کہ اگر آزادی کے بعد قائم ہونے والا سیاسی نظام اسلامی نظام نہیں ہوتا تو آخر کسی ایسے نظام کے قیام کی کوشش کا جواز کیا ہے؟ تو آپ نے اس سوال کا کوئی سیدھا جواب دینے کے بجائے فرمایا:

> مختلف قوموں کے اس اشتراک کی وجہ سے آزادی کے بعد ملک میں جو نیا نظام قائم ہوگا اس کی تعمیر میں مسلم و غیر مسلم دونوں شریک ہوں گے۔ یہ مشترکہ نظام اگرچہ مکمل طور پر اسلامی معیار کے مطابق نہ ہوگا تاہم اس میں مسلمانوں کا ایک اہم اور موثر عنصر ہوگا۔ اب یہ خود مسلمانوں کی حکمت تبلیغ پر منحصر ہے کہ وہ آنے والے نظام کو کس حد تک اسلامی معیار پر اتار سکتے ہیں انہی وجوہ سے آزادی کے بعد قائم ہونے والے مشترکہ نظام کو موجودہ نظام کے مقابلہ میں "اھون البلیتین" قرار دیا جاتا ہے۔
>
> (مکتوب شیخ الاسلام، منقول اخبار نئی دنیا شیخ الاسلام نمبر، مورخہ ۱۹/ جنوری ۱۹۵۸ء)

مسلمانوں کی اور ہندوؤں کی مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں مستقبل کا جو نقشہ ترتیب پائے گا اس

کا صحیح ادراک کرنے کے بجائے ساری ذمہ داری مسلمانوں کی آئندہ حکمت تبلیغ پر ڈال دی گئی اور یہ بات فرض کرلی گئی کہ آنے والے دنوں میں اچانک یہ امت جس کا شیرازہ منتشر ہے، اخلاقی حالات تباہ ہیں، کسی مشترکہ و متحدہ قیادت سے دور ہے اور جو فریضہ دعوت حق کے شعور سے پوری طرح خالی ہے وہ اچانک مبلغین کی فوج میں تبدیل ہو جائے گی۔ اگر یہ کام اتنا ہی آسان تھا اور سارا معاملہ حکمت تبلیغ کا تھا تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ امت کی شیرازہ بندی کے بعد اسی حکمت تبلیغ کے ذریعہ مسلمانوں کو مؤثر عنصر کے مقام سے آگے بڑھا کر قیادت کے منصب پر فائز کر دیا جاتا اور اگر مسلمانوں کو انگریزی نظام کے اندر ایک مؤثر عنصر کی حیثیت سے سامنے لانا اور فیصلہ کن قوت عطا کرنا ممکن نہ تھا تو بعد کے دور میں اچانک انگریزوں کے چلے جانے سے یہ کام کیسے انجام پاسکتا تھا؟ اس سوال کا کوئی سیدھا جواب دینے کے بجائے مولانا مدنی نے "اھون البلیتین" کے فلسفے کا سہارا لیا اور اس فیصلے کی خود کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے مستقبل کے مبلغین اور ان کی حکمت تبلیغ کے سر ڈال دیا۔

تو کیا مولانا حسین احمد مدنی کو اس بات کی کوئی امید تھی کہ مستقبل کے ہندوستان میں رفتہ رفتہ مسلمان دوبارہ ایک فیصلہ کن قوت حاصل کرلیں گے اور آنے والے دنوں میں ان کوششوں سے ہندوستان کو دوبارہ دارالاسلام بنایا جاسکے گا؟ مولانا مدنی کی تحریروں اور ان کی تقاریر سے اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ پھر آخر یہ حضرات چاہتے کیا تھے؟ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد سے اگر کسی دارالاسلام کے قیام کا خواب نہیں دیکھتے تھے، اگر ان کی جدوجہد کا مقصد اللہ کی شریعت کی سربلندی نہیں تھا تو خود ان ساری دوڑ دھوپ اور جدوجہد کی شرعی طور پر کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اس سوال پر ہم آگے بحث کریں گے۔

نئے ہندوستان میں اس بات کی شعوری کوشش کی جاتی رہی ہے کہ مسلمانوں کی ملی زندگی کی شیرازہ بندی کی جائے اور ان کو شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے مواقع فراہم کئے جائیں۔ تقسیم ہند سے قبل ہی مسلم قیادت کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ آنے والے دنوں میں دہلی کی سرزمین پر مسلمانوں کی فیصلہ کن حیثیت باقی نہیں رہ پائے گی تب مضطرب مسلم ذہنوں میں یہ سوال اٹھنے لگا تھا کہ اگر نیا نظام ایک اسلامی زندگی جینے کے مواقع فراہم نہیں کرتا تو اسے شرعی بنیادوں پر کس طرح قبول کیا جائے گا۔ تب بھی ان سوالوں کا کوئی واضح جواب فراہم کرنے کے بجائے مسلمانوں سے یہ کہا گیا کہ ان کا کام

صرف علماء کی پیروی کرنا ہے اور علماء میں بھی وہ لوگ جو وارثان نبی ہوں، جنہیں علم لدنی اور علم معرفت دونوں حاصل ہو اور محض وحی پر بھروسہ کرنے کے بجائے القاء ربانی اور الہام باطنی سے کام لیتے ہوں۔ علمائے اہل دیوبند کی نظر میں چونکہ خود ان کے اندر یہ شان بدرجہ اتم موجود تھی اس لئے عام مسلمانوں سے یہ توقع کی گئی کہ وہ آنکھ بند کر کے ان علماء کی پیروی کریں۔ وہ جدھر لے جانا چاہتے ہوں ادھر چلیں کہ ان کے پاس صرف کتاب و سنت کا علم ہی نہیں بلکہ وحی کے علاوہ موجودہ زمانے کی وحی یعنی القائے ربانی اور الہام باطنی بھی موجود ہے۔ مولانا قاری محمد طیب نے جمعیۃ العلماء کے ایک جلسے میں اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ بحران کی اس فضا میں امت کی کشتی کو صرف اور صرف جمعیۃ العلماء کے علماء ہی پار لگا سکتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی قیادت کیلئے یہ شرط عائد کر دی کہ محض اس کا:

> عالم ہونا یا کتابوں کے درس و تدریس پر قادر ہونا کافی نہیں بلکہ بایں معنی ان میں وراثت نبوت کی شان ہونی چاہئے کہ ان کا علم خود بینی اور ترددات سے بالاتر ہو۔ ادھر ان علماء میں عصمت کی شان بصورت محفوظیت پائی جاتی ہو، تقویٰ و طہارت اور احتیاط و حزم کی وجہ سے ان کا رویہ نہ ذاتی گمراہی کا ہو نہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا ہو۔ وہ ضلوا و اضلوا دونوں قسم کی ناپاکیوں سے پاک ہوں پھر جب کہ ان دونوں اوصاف انکشاف باطن اور محفوظیت کے علماء کوئی اجتماعی شان بھی پیدا کر لیں تو ان میں فی الجملہ عصمت کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔
>
> (اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، خطبہ صدارت بمبئی ۱۹۴۶ء قاری محمد طیب)

اور چوں کہ علماء کا یہ گروہ اپنے اتحاد کی وجہ سے عصمت کی شان بھی پیدا کر چکا تھا اس لئے اس سے کسی غلط فیصلے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا تھا۔ پھر اس نئی تشریح کے مطابق محض کتاب و سنت کے حوالے سے کسی فیصلے کو صحیح یا غلط قرار دینا ممکن نہ تھا کہ اب پرانی وحی کے مقابلے میں نئی وحی کے حاملین معصوم علمائے کرام کی فوج ظفر موج امت کو موجودہ بحران سے نکالنے کے لئے میدان میں آچکی تھی۔ کتاب و سنت کے مقابلے میں علمائے کرام کے قول کو ترجیح دینے کا یہی وہ رجحان تھا جس نے آنے والے دنوں میں اہم مسائل پر غور و فکر کے لئے کتاب و سنت کی طرف رجوع کا دروازہ بند کر دیا۔ اس رویے نے نہ صرف یہ کہ عام مسلمانوں کے دل و دماغ پر پہرے بٹھائے بلکہ اہم سیاسی مسائل پر رہنمائی

کے لئے جب کبھی بھی ضرورت پڑی امت نے علماء کی طرف دیکھنے کو کافی سمجھا اور چونکہ ان "معصوم" علماء کے فیصلے آپس میں مختلف اور متضاد تھے اس لئے بددل ہوکر عام مسلمانوں نے ان کی رہنمائی سے یکسر آنکھیں بند کرلیں۔

ہمارے لئے مسئلے کا جو پہلو فی الوقت غور طلب ہے وہ یہ کہ کیا بزرگوں کی یہ نسل علمائے کرام کی انجمن بناکر واقعی یہ سمجھتی تھی کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے کوئی شرعی زندگی جینے کا انتظام کرلے گی۔ علماء کی انجمن اور اس انجمن کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے درمیان کسی خاص عالم کو خواہ کتنا ہی اعتبار کیوں نہ حاصل ہوجائے اور وہ اپنے مریدوں کے حلقے میں خواہ کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو نئے نظام کے اندر مسلمانوں کے اس امیر کی حیثیت ایک معمولی اہلکار سے زیادہ نہ تھی۔ لہٰذا جمعیۃ کے بڑے بڑے باکمال علماء خواہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں اقتدار کل کے مالک ہی کیوں نہ ہوں نئے نظام میں ان کی حیثیت کسی حاشیہ نشیں سے زیادہ نہ تھی۔ خود مسلمانوں کی سب سے بڑی شخصیت ابوالکلام آزاد گاندھی کے ارادت مندوں میں سے تھے جن کی ساری روحانی عظمت اور ورثۃ الانبیاء کی حیثیت گاندھی کی مہاتمائی روحانی شخصیت کے آگے پھیکی پڑگئی تھی۔ بعد کے دنوں میں بھی مختلف سطحوں پر ملک کے اندر جو شرعی نظام قائم کیا گیا یا جو لوگ امیرالہند کی حیثیت سے سامنے آئے وہ اس سیاسی نظام کے اندر امت کے لئے تو کجا اپنے لئے بھی کوئی باوقار رول دریافت نہ کرسکے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسول اکرمؐ کی وراثت کا دعویٰ کرنے والی امت یا اس امت کے چیدہ افراد نظام کفر کے حاشیہ بردار کی حیثیت قبول کرلیں۔ کیا شرعی اعتبار سے کسی امیر شریعت یا امیرالہند کے لئے جائز ہے کہ وہ مسلمانوں کو نظام کفر کی معصیت میں رکھ کر شرعی زندگی جینے کا فن سکھائے۔ یا وہ نظام کفر سے کوئی اعراض نہ برتے اور پھر بھی یہ دعویٰ کرے کہ اس کی جدوجہد اسے شرعی زندگی جینے اور جلانے کے لئے ہورہی ہے۔

امت کی شیرازہ بندی کا مقصد اگر اس ملک میں شریعت کی بالادستی قائم کرنا نہیں تھا، اگر امت کو کسی دینی قیادت پر یکجا کرنے کے پیچھے ایک اسلامی نظام حیات کی تشکیل نہیں تھی تو آخر کون سا کام تھا جو قائدین کی پہلی نسل مسلمانوں کے اتحاد سے لینا چاہتی تھی۔ اگر موجودہ نظام کو الٹ کر اس کی جگہ کوئی نیا نظام حق قائم کرنا ان بزرگوں کے پیش نظر نہیں تھا تو آخر یہ ساری چلت پھرت، وعظ اور تقاریر، کانفرنسوں اور جلوسوں سے وہ کیا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اپنی موت سے چند روز پیشتر مولانا حسین احمد

مدنی نے نئے ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے جو راہ عمل تجویز کیا وہ کچھ اس طرح تھا:

ان ملکوں میں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے اور مسلمان اپنی اقلیت کی وجہ سے وہاں پر نہایت کمزور اور ان کی آواز نہایت گری ہوئی ہے اشد ضرورت ہے کہ ان میں اجتماعی قوت اور نظام مکمل ہو۔ بالخصوص انڈین یونین (بھارت) میں تقسیم ہند کے بعد یہ ضرورت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اس لئے تمام مسلمانوں کا عموماً اور علمائے اسلام کا خصوصاً اہم فریضہ ہے کہ وہ جاگیں اور تحفظ بقا کی صورتیں عمل میں لائیں، اختلافات کو مٹائیں اور اجتماعی قوتوں کو بڑھاکر صحیح نظام پر گامزن رہیں۔

(موت سے چند روز پیشتر مکتوب بنام غلام محمد مصطفیٰ محولہ روزنامہ الجمعیۃ دہلی ص ۹، ۱۷ شیخ الاسلام نمبر ۱۰/ فروری ۱۹۵۸ء)

کل تک جن لوگوں نے امت کو اپنی رہنمائی کی صحت کا پورا پورا یقین دلایا تھا، کل تک جو لوگ حسن تبلیغ کے ذریعہ نئے نظام کو اپنی آرزوؤں کی راہ پر ڈالنے کا ولولہ رکھتے تھے آج وہی لوگ اب اس امت کو تحفظ اور بقا کی صورتیں عمل میں لانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اب اقدامی عمل سے کنارہ کش ہوکر دفاعی حیثیت میں سارا کام کرنے پر زور تھا۔ گویا روز اول سے قائدین کی پہلی نسل نے امت کو جو درس دیاوہ یہ تھا کہ "وہ اس ملک میں اپنی بقا اور تحفظ کی فکر کریں، اختلافات کو مٹائیں اور اجتماعی قوتوں کو بڑھاکر صحیح نظام پر گامزن رہیں" لیکن یہ صحیح نظام کیا تھا اور اس پر کیسے گامزن ہوا جاسکتا تھا اس بارے میں ان کے پاس نہ تو کوئی پروگرام تھا اور نہ منصوبہ۔ اصل زور تو تحفظ پر تھا صحیح نظام کا تذکرہ تو ایک ناآسودہ آرزو کی حیثیت سے گاہے بہ گاہے زبان پر آجاتا تھا ورنہ اگر اس نظام کی طرف لے چلنے کا کوئی واقعی پروگرام ہوتا تو اس کا تذکرہ محض رواروی میں چلتے چلاتے نہ ہوتا اور اس کے لئے کوئی واقعی خاکہ blue-print بھی پیش کیا جاتا۔ کچھ یہی حال آزاد کے یہاں بھی تھا جو اب تک اسلاف کی عظمت اور اسلامی ہند کی تاریخ سے اپنا پیچھا نہ چھڑا پائے تھے اور جو ان کے ہاں گاہے بہ گاہے مایوس خطابت کی شکل میں ڈھلتی رہتی تھی۔ تاریخی اعتبار سے تو یہ بات سچ تھی کہ جمنا کے کنارے ہمارے بزرگوں نے وضو کیا تھا۔ اس خطابت سے یقیناً حوصلے کو جلا ملتی ہے لیکن حقیقت کی دنیا میں نیا نظام بزرگوں کے تمام آثار مٹانے کے درپے تھا۔ لہٰذا اب جس بات پر سب سے زیادہ زور تھا وہ یہ کہ مسلمان اپنے تحفظ کی فکر کریں۔

آنے والے دنوں میں عام ملی رویہ اسی احساس عدم تحفظ اور محرومی کے زیر اثر تشکیل پایا۔ لہٰذا معاملہ زبان کا ہو یا شریعت کا، مسلم اداروں کا ہو یا اوقاف اور عبادت گاہوں کا، مسلمان اقدامی لہ یجنڈے سے یکسر کنارہ کش ہو کر تحفظ کی سیاست کے شکار ہو گئے۔ دینی اور روحانی قیادت ہو یا سیاسی اور سیکولر لیڈرشپ، ہر کسی نے تحفظ کی ایسی پر زور مہم چلائی کہ عام ذہنوں سے یہ تصور بھی محو ہوتا گیا کہ آخری رسولؐ کی امت پر محض اپنے تحفظ کا نہیں بلکہ دنیا کی رہنمائی کا فریضہ بھی عائد کیا گیا ہے۔ پھر قائدین کی پہلی نسل پر تقدس اور روحانیت کا ایسا دبدبہ تھا کہ مضطرب مسلمانوں کو یہ پوچھنے کی جرات بھی نہ ہوئی کہ اگر جان و مال، دین اور دینی مظاہر کے تحفظ کے لئے اتنا ہی کچھ جتن کرنا تھا تو یہ سب کچھ تو پرانے نظام میں بھی انجام دیا جاسکتا تھا، اس کے لئے ہندوستان کو آزاد کرانے اور آزادی کی طویل جنگ میں امت کو جانی اور مالی قربانیوں سے گزارنے کی ضرورت کیا تھی۔ کیا انگریزوں سے تحفظ شریعت کی جنگ لڑنے کے مقابلے میں اپنے ہم وطنوں سے یہ لڑائی زیادہ ثواب کا باعث تھی؟ پھر اگر اس طویل جدوجہد میں امت اپنے پیغمبرانہ منشور کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں کر سکی تو اس لایعنی جدوجہد کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ آخر آپ نے کون سی پسندیدہ دنیا بنائی تھی جس میں مسلمانوں کا دین، ان کی ثقافت اور ان کی عبادت گاہیں سخت خطرے سے دوچار تھیں۔ شرعی اعتبار سے کیا کسی ایسی صورت حال کو مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے یا اسے آزادی کا ہم معنی گردانا جاسکتا ہے؟ عام مضطرب مسلمان کے ذہن میں یہ سوال کہیں نہ کہیں موجود ضرور تھا، البتہ حالات کی سختی کسی نئی فقہی موشگافی کی اجازت نہیں دیتی تھی اس لئے عملاً ان بنیادی سوالات پر غور کرنے کے بجائے جمہور امت حفاظت کے کام میں زور و شور سے لگ گئی۔

حفاظت چوں کہ اپنی تعریف کے اعتبار سے ایک مدافعانہ رویہ ہے۔ جو لوگ چہار طرف سے ہونے والے پے در پے حملوں سے پریشان ہوں، جن کی سرگرمیوں کا واحد مرکز و محور اپنی جان و مال بچالے جانا اور اذیت ناک زندگی کے لئے کچھ اور مہلت حاصل کر لینا ہو کسی ایسے انسانی گروہ سے قیادت یا رہنمائی کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ پھر کسی مدافعانہ طرز عمل میں یہ قوت بھی نہیں ہوتی کہ وہ کسی چیز کا کلی طور پر تحفظ ہی کر سکے۔ انسانی دنیا میں نظریات ہوں یا اشیاء خیال، ہو یا مادہ اپنی اصل حالت میں زیادہ دنوں تک جوں کا توں برقرار نہیں رہ سکتے۔ یہی حال کسی انسانی گروہ یا امت کا ہے یا تو وہ آگے بڑھے گا یا رفتہ رفتہ زوال کا گھن اسے چاٹ جائے گا۔ عملی دنیا میں تحفظ قابل عمل فلسفہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا کوئی امت اگر

ارتقاء کی طرف گامزن نہیں ہوئی، اس کے یہاں خیالات کے تخلیقی دھارے خشک ہونے لگے ہوں یا وہ نئی بلندیوں تک سفر کے ارادے کو ترک کر کے موجودہ پوزیشن پر برقرار رہنا چاہتی ہو تو عملاً ہوتا یہ ہے کہ آنے والا ہر دن اس کے تخلیقی سرچشمے کو خشک کرتا چلا جاتا ہے۔ فرد ہو یا گروہ اگر وہ آگے بڑھنے سے منہ موڑ لے تو اسے کوئی قوت پیچھے ہٹنے سے نہیں روک سکتی۔ کسی مخصوص مقام پر جوں کا توں اپنے آپ کو برقرار رکھنا اس دنیا میں ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحفظ کی سرتوڑ جدوجہد کے باوجود اس امت نے رفتہ رفتہ اپنا بہت کچھ قیمتی سرمایہ کھودیا ہے۔ ہندی مسلمانوں کی مخصوص ثقافت ہو یا شمالی ہند کے مسلمانوں کا لسانی طریقہ اظہار، ملی زندگی کی جلوہ سازیاں ہوں یا ایک عظیم امت ہونے کا احساس، یہ سب کچھ رفتہ رفتہ ہمارے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ طرفہ تو یہ ہے کہ اب ہماری قابل ذکر اکثریت اس شعور سے بھی خالی ہو چکی ہے کہ آخری رسولؐ کی امت کی حیثیت سے سیادت اور رہنمائی کا فریضہ مسلمانوں کو انجام دینا ہے۔ ہم بدقسمتی سے اس خواب سے بھی دست کش ہو چکے ہیں کہ روایتی طور پر ایک سابق دارالاسلام کے شہری کی حیثیت سے اس ملک کو دوبارہ کیس بہتر انداز سے دارالاسلام بنانے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ پچھلے پچاس سالہ سفر میں ہم سے جو سب سے اہم سرمایہ کھویا گیا ہے وہ یہ کہ ہمارے اندر اپنی موجودہ زبوں حالی اور اس خطے میں اپنی شاندار تاریخ کا احساس جاتا رہا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر عملاً ہوا یہ ہے کہ ہم اپنے انبیائی خواب سے دست کش ہو کر غیر اسلامی خوابوں کے اسیر ہو گئے ہیں۔ اب ہماری محترم شخصیات اور روحانی قیادت بھی اس ملک میں کسی الٰہی نظام کے قیام کے بجائے نظام کفر کے استحکام کے لئے علی الاعلان اپنی قوتیں صرف کر رہی ہے۔ وہ لوگ جن سے بجا طور پر توقع تھی کہ وہ اس نازک صورت حال میں امت کی صحیح قیادت فرمائیں گے۔ افسوس کہ وہی صلحائے امت اب اعلائے کلمۃ اللہ کے بجائے نظام کفر کے استحکام کی کھلی دعوت دے رہے ہیں۔

گزشتہ پچاس برسوں کے دوران ہماری مذہبی قیادت نے اس بات کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی ہے کہ موجودہ نظام کی شرعی حیثیت متعین کی جائے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں موجودہ ہندوستانی نظام کس حد تک ہمارے خوابوں کی تعبیر ہے اور کس حد تک اس نظام میں ہمارے قرآنی خواب کی تعبیر کا امکان پایا جاتا ہے اس بارے میں ہمارے علمائے کرام نے مجرمانہ خاموشی اختیار کر رکھی ہے، اور عملاً چونکہ علمائے کرام کی چلت پھرت نے موجودہ نظام کو ہی اعتبار بخشا ہوا ہے اس لئے مسلمانوں کے اندر یہ

احساس عام ہے کہ موجودہ نظام اگر اپنی تمام برکتوں کے ساتھ حرکت میں آجائے تو مسلمانوں کے سارے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملی جلسوں اور ان کی قراردادوں میں شدت سے اس آرزو کا اظہار ہوتا رہا ہے کہ اس ملک میں سیکولر جمہوری نظام کو پوری طرح فعال بنایا جائے تا کہ مسلمان اس نظام کی برکتوں سے فیضیاب ہوں۔ سیکولرازم اور جمہوریت کے استحکام کا غلغلہ کچھ اتنی شدت کے ساتھ بلند ہوتا رہا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اسلامی عقیدے کا جز ہو اور یہ کہ موجودہ ہندوستان میں ایک سیکولر آرڈر کا قیام گویا مسلمانوں کی مذہبی اور ملی ذمہ داری ہے۔ نوبت بہ ایں جارسید کہ مساجد کے جن منبروں اور مدارس کی جن چہار دیواریوں سے نظام خلافت کے قیام کی صدا بلند ہونی چاہیئے تھی وہاں سے ان کافرانہ عقائد کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں بعض اجنبی خیالات اور تصورات نے ہمارے فکری سانچے میں کچھ اس طرح اپنی جگہ بنالی ہے کہ اب یہ سب کچھ اسلامی عقیدے کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ان تصورات کے اسیر صرف سیکولر مسلم دانشور یا سیاسی قسم کے مسلمان نہیں بلکہ رتبہ والے علماء کرام اور حاملین دین اور شرع متین بھی ہیں۔ طوالت سے بچنے کی خاطر ہم صرف چند مروجہ تصورات کا ذکر کریں گے جس نے ہماری سیاسی فکر میں اہم ستون کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔

اسلام اور موجودہ سیکولر ڈیموکریسی

کیا سیکولرازم سیاسی فلسفے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہوسکتا ہے؟ ہندوستانی سیکولرازم جو دراصل اس بات سے عبارت ہے کہ ریاست امور زندگی چلانے میں کسی بھی مذہبی رہنمائی سے آزاد ہوگی۔ فرد کی ذاتی زندگی تک ہر شخص کو اس بات کی آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اپنی پسند کا مذہب اختیار کرسکے۔ البتہ کاروبار حکومت کو چلانے یا زندگی کے اجتماعی مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں کسی مذہبی احکام کی پاسداری نہیں کی جائے گی۔ یہ ہے ہندوستانی سیکولرزم کا سیدھا سا مفہوم۔ ایک بین المذہبی ملک میں یہ تاویل خواہ کتنی ہی خوش کن کیوں نہ معلوم ہوتی ہو شرعی اعتبار سے مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں ہوسکتا کہ وہ دین کو فرد کی زندگی کا ایک پرائیویٹ معاملہ قرار دے لیں۔ شریعت کی نظر میں زندگی کے کسی بھی گوشے میں اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے عمداً پہلو تہی یا اسے پلیٹ کر رکھ دینا دراصل کفر کے مترادف ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ سیکولرازم کی بظاہر

اس بے ضرر تعریف کو بھی نظری طور پر ایک فلسفے کی حیثیت سے قبول کرلے۔

رہا جمہوری نظام تو اسلام کسی ایسی جمہوریت کا سرے سے قائل ہی نہیں جس میں اقتدار اعلیٰ خالق کائنات کے بجائے بندوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہو اور جس میں اکثریت کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جب چاہے جس طرح چاہے زندگی جینے کے لئے اپنی پسند کا ایک نظام مرتب کرلے۔ اسلام میں شورائیت کا تصور جمہوریت سے مختلف ہے کہ وہاں شوریٰ کا کام شریعت کے بنیادی فریم ورک میں کسی مخصوص صورت حال کے لیے ہدایات مرتب کرنا ہوتا ہے جہاں بڑی سے بڑی اکثریت بھی شریعت کے بنیادی فریم ورک میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ جب کہ مغربی طرز کی جمہوریت جب چاہے اکثریت کے بل پر نئی شریعت ترتیب دے سکتی ہے۔ مروجہ جمہوریت دراصل بندوں پر بندوں کی حکمرانی کی ایک شکل ہے۔ اسلام بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر خدائے واحد کی عبودیت میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ پھر کیا ہماری موجودہ جمہوریت شرعی اعتبار سے مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہے؟ افسوس کہ ہمارے بزرگوں نے اس سوال کو شرعی بنیادوں پر فیصل کرنے کے بجائے صرف یہ کہنا کافی سمجھ لیا کہ "جمہوریت کے متعلق زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب ساری دنیا نے جمہوری نظام کو ضروری سمجھ لیا ہے۔"
(ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی ج۔ ۵ ص ۲۰۰)

سیکولر، لبرل قسم کے مسلمان ہوں یا ہماری دینی اور مذہبی قیادت، سیکولرازم کی تبلیغ میں ہر ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش میں ہے۔ عام بے شعور مسلمان یا اسلامی احکام سے غافل سیاست داں اگر اپنی ذاتی منفعت کی خاطر سیکولرازم کے علمبردار کی حیثیت سے خود کو پیش کریں تو کہا جاسکتا ہے کہ بے چاروں کو مسئلہ کی نزاکت کا اندازہ نہیں۔ البتہ اگر معتبر علمائے کرام ان ہی خیالات کے مبلغ بن جائیں تو سمجھ لیجیے کہ خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے میں فی زمانہ ملک کے سب سے معتبر عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندوی کی مثال پیش کررہا ہوں جو بد قسمتی سے اس ملک کے معاشرے کو قرآنی بنیادوں پر منظم کرنے کے بجائے سیکولرازم کے اصولوں پر مستحکم کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

> لیکن ہمارا ملک (ہندوستان) ایک وسیع اور عظیم ملک ہے۔ یہاں کم سے کم ایسے تین پودے تھے جن کا باقی رہنا ضروری تھا اور ان کے ختم کردینے سے اس ملک کے رقبہ اور

وسعت کے تناسب سے تین بڑے زہریلے سانپ نکل آئے۔ ایک عدم تشدد (Non-voilence) کا پودا، دوسرا نامذہبیت (Secularism) کا پودا اور تیسرا جمہوریت (Democracy) کا پودا۔

(کاروان زندگی، ابوالحسن علی ندوی، ج ۵، ص ۱۹۶)

آپ کے خیال میں اس ملک کی بقا اور سلامتی کے لئے ضروری ہے کہ یہاں عدم تشدد، نامذہبیت اور جمہوریت کو استحکام بخشا جائے۔ اپنی ایک دوسری تقریر میں ان اصولوں پر زور دیتے ہوئے متنبہ فرمایا کہ:

"اگر سیکولرازم (نامذہبیت) عدم تشدد (non-voilence) کا پودا یہاں سے اکھاڑ پھینک دیا گیا تو پھر تشدد اور مذہبی تعصب کا اژدہا نکل آئے گا اور وہ کوئی رعایت نہیں کرے گا۔"

(کاروان زندگی، ج ۵، ص ۱۵)

ایک ایسی فضا میں جہاں ہر طرف سیکولر جمہوریت کا سکہ چل رہا ہو اور عامۃ الناس میں اسے ایک بہتر قدر کی حیثیت حاصل ہو گئی ہو، کم از کم معتبر علمائے دین سے تو یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ کتاب و سنت کی روشنی میں ان تصورات کا محاکمہ فرمائیں گے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے سب سے معتبر عالم دین نے بھی ان تصورات کا کتاب و سنت کی روشنی میں جائزہ لینے کے بجائے اس کی صحت کی سند کے لئے یہی کافی سمجھا کہ "جلسے میں ان خیالات کو قبولیت حاصل ہوئی اور ملک کے مرکزی وزراء غلام نبی آزاد، سلمان خورشید اور مادھوراؤ سندھیا نے تائیدی تقریریں کیں۔"

سیکولر جمہوری ہندوستان میں ابھی اس سوال کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جانا باقی ہے کہ مسلمان مسلمان رہتے ہوئے ان اجنبی تصورات کو کس حد تک قبول کر سکتے ہیں۔ کیا ہندوستان کی سلامتی اور بقا کے لئے سیکولرازم، جمہوریت اور عدم تشدد کے اصولوں کو استحکام بخشنا لازمی ہے؟ کیا اسلام اس ملک کے مسائل کا حل نہیں پیش کر سکتا؟ کیا اسلام ملک کی موجودہ صورت حال میں اپنا Relevance کھو چکا ہے اور کیا قرآن صرف مسلم اکثریتی ممالک کے لئے ہی رہنما اصول فراہم کرتا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو قرآنی اصول کو یکسر لپیٹ کر رکھ دینے اور گاندھیائی اصولوں کے انطباق اور اس کے استحکام پر اتنا زور کیوں ہے؟

عام مسلمان ہی نہیں بلکہ ہمارے معتبر علماء اور دینی جماعتیں یہ سمجھنے لگی ہیں کہ ہندوستان

جیسے بین الملی ملک کے نظام کو چلانے کے لئے سیکولرازم ہی کوئی قابل عمل متبادل پیش کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دینی جماعتیں بھی اقامت دین کے بجائے اب سیکولر جمہوریت میں زیادہ کشش محسوس کرتی ہیں۔ البتہ ان کے یہاں اب تک یہ سب کچھ ایک وقتی اسٹریٹیجی کے طور پر سمجھا اور سمجھایا جارہا ہے۔ لیکن یہ خیال کہ اس ملک کے لئے سیکولرازم ہی ایک قابل عمل سیاسی متبادل ہے مسلمانوں کے درمیان اب کوئی نیا خیال نہیں رہ گیا ہے۔ ہمارے معتبر علماء بہت پہلے اس نظریے پر اعتبار کی مہریں ثبت کرچکے ہیں چنانچہ امت اسلامیہ ہند کے بطل جلیل مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی معروف کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں لکھتے ہیں:

> "جمہوریہ ہند کے سیکولر دستور میں تمام فرقوں اور قوموں کے مذہب، کلچر اور عقیدہ کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس دستور کی نظر میں ملک کے مختلف فرقے اور آبادی کے مختلف العقیدہ عناصر برابر ہیں۔ یہ دستور ایک ایسے ملک کے لئے جہاں متعدد قومیں، مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے لوگ رہتے ہیں موزوں ترین دستور ہے۔ (ص ۱۸۶)

پوچھا جاسکتا ہے کہ اگر جمہوریہ ہند کا سیکولر دستور "موزوں ترین" ہے تو پھر قرآن حکیم کا کیا Relevance باقی رہ جاتا ہے؟ اور اگر ہندوستان نے اپنی مخصوص صورت حال کے مطابق ایک موزوں ترین دستور تدوین دینے میں کامیابی حاصل کرلی ہے تو پھر آسمانی ہدایات کی طرف کسی کو توجہ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ حیرت ہے کہ ایک باخبر عالم دین ایک ایسے دستور کو جو حاکمیت الٰہ کے بنیادی تصور کی نفی پر ترتیب دیا گیا ہو کیسے موزوں ترین دستور گردانتا ہے حالانکہ شریعت کی رو سے قرآنی دستور کے علاوہ کسی اور دستور حیات کو اعتبار بخشنا مسلمان کا ایمان ساقط کردیتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ قرآن کے منشور سے ذرہ برابر بھی انحراف کرے کجا کہ کسی انسانی دستور کو قرآن کی موجودگی کے باوجود "موزوں ترین" دستور قرار دے۔ شریعت کی نظر میں یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے۔

ملک میں حالات جتنے بھی خراب ہوں، مسلمانوں کی عملی زندگی جس قدر بھی منتشر ہو یہ معاملہ مسلمان کے بنیادی عقیدے سے تعلق رکھتا ہے کہ اس کی نظر میں زندگی جینے اور ہر صورت حال میں اجتماعی زندگی کا نظم و نسق چلانے کیلئے اگر کوئی دستور حیات ہے تو وہ صرف اور صرف قرآن ہے۔ دوسرا دستور حیات اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے یا بعض حالات کی وجہ سے قابل انگیز تو ہوسکتا ہے

موزوں ترین نہیں اور نہ ہی مسلمان اس بات کے لئے مکلف ہیں کہ وہ قرآنی نظام کے علاوہ کسی اور نظام حیات کے استحکام کے لئے جدوجہد کریں۔ بلکہ ایسا کرنا شریعت کی نظر میں انہیں گنہگار ٹھہراتا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی سے پہلے بعض ان بنیادی سوالوں کے جواب فراہم کریں جن پر بوجوہ ہماری ملی اور دینی قیادت گزشتہ پچاس برسوں سے مداہنت کا شکار ہے۔ جب تک ایک بے تکلف سنجیدہ گفتگو کا آغاز نہیں ہوتا نظری طور پر کنفیوژن میں اضافہ ہوتا جائے گا اور اگر بنیادی مسائل پر کتاب وسنت کے حوالے سے گفتگو کا رواج بند کردیا گیا تو عامۃ الناس ہی نہیں بلکہ دین و شریعت کے حاملین بھی پروپیگنڈے کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے اور ایک ایسی ہی سنگین صورت حال پیدا ہوگی جس سے آج ہم دوچار ہیں۔ کبھی ہم متحدہ قومیت کے اسیر ہوجاتے ہیں تو کبھی سیکولر ڈیموکریسی ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے، بے سمتی کے اس سفر میں ہم اس شعور سے یکسر خالی ہوچکے ہیں کہ ہمارے لئے کرنے کا کام کیا ہے اور مسلمان کی حیثیت سے ہم کس قرآنی لائحہ عمل کے حامل ہیں۔

جب قیادت علیا ہی فکری کج روی کا شکار ہو، جب امت کی مخلص قیادت پر اجنبی تصورات نے اپنے پنجے سخت کردیئے ہوں تو اس بات کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہوجاتی ہے کہ کتاب وسنت کو اپنی فکر کا مرکز و محور بنایا جائے۔ علماء سے وفاداری کو امت کی وفاداری پر ترجیح دیا جائے اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے وفاداری ملک سے وفاداری پر سبقت لے جائے۔

ملکی اور ملی وفاداری

عام انسانی زندگی میں جہاں فرد مختلف قسم کی وفاداریوں میں گھرا ہوتا ہے اسلام کا مطالبہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے وفاداری ہر قسم کی وفاداریوں پر سبقت لے جائے یہاں تک کہ اپنے قریبی رشتہ داروں، ماں باپ اور بال بچوں کی محبت کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت پر غالب آنے سے روکا گیا ہے۔ یہ بات وضاحت کے ساتھ کہہ دی گئی ہے کہ تم میں کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے اعزہ و اقارب اور ماں باپ سے کہیں زیادہ رسولؐ سے محبت نہ کرتا ہو۔ خاندان ہو یا قبیلہ، ملک ہو یا وطن مومن کے لئے وفاداری کی فہرست میں یہ سب ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور اگر مختلف وفاداریوں میں

ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوجائے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ اللہ سے وفاداری کے مقابلے میں دوسری تمام وفاداریوں کو یکسر ٹھکرا دیا جائے۔ اب اگر مسلمان کے لئے دینی ملی وفاداری اسی قدر اہم ہے تو وطنی گروہی عصبیتوں کی اس کے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ پھر متحدہ قومیت کا نعرہ ہو یا وطن پرستی کی دعوت یہ سب چیزیں اجنبی ایجنڈے کا حصہ قرار پاتی ہیں۔ لیکن گزشتہ پچاس برسوں سے ہم جس سیاست کے اسیر ہیں اور ہمیں جس قسم کی دینی قیادت میسر آتی رہی ہے اس نے ہمیں ایک بین الاقوامی امت کی سطح سے بہت نیچے لاکر ایک وطن پرست گروہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہر لمحے خود کو ملکی اور ملی مفاد کے بیچ پھنسا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ ہماری اس کیفیت نے ہم سے حق گوئی و بے باکی کے جوہر بھی چھین لئے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ہمارا ایک بالغ النظر عالم دین اس کیفیت میں اپنے آپ کو کس کشمکش سے دوچار پاتا ہے:

> لیکن ہندوستان جو اپنی امن پسندی، انسانیت دوستی اور اہنسا کے لئے باہر کی دنیا میں مشہور تھا وہاں آئے دن ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جو اس ملک کے نام کو بٹہ لگاتے ہیں اور ملک سے باہر جانے والوں کو شرمندگی سے سر جھکا لینا پڑتا ہے۔ میں آپ سے بے تکلف کہتا ہوں کہ ۹/ جنوری ۱۹۹۲ء کو میری ملک کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ جی سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ انہی تاریخوں میں مجھے اسلامی دنیا کی سب سے بڑی نمائندہ اور معزز تنظیم رابطہ عالم اسلامی واقع مکہ مکرمہ کی طرف سے جس کا میں فاؤنڈر ممبر ہوں دعوت نامہ موصول ہوا تھا اور سفر کے سب انتظامات تھے میں نے جانے سے اس لئے معذرت کردی کہ اگر ۶/ دسمبر کے واقعہ اور اس کے بعد کے فسادات کا ذکر آیا اور مجھ سے سوال کیا گیا تو میں کیا جواب دوں گا؟ جھوٹ بول نہیں سکتا، سچ کہہ نہیں سکتا اس لئے میں نے نہ جانے کو ترجیح دی۔
>
> (کاروان زندگی، علی میاں ندوی، ج ۵، ص ۱۹۸-۱۹۷)

ملک سے وفاداری کا تقاضا تھا کہ ملک میں حالات کتنے بھی خراب ہوں، مسلمانوں پر جو کچھ بھی گزرتی ہو، باہر کی دنیا میں اس کا کوئی تذکرہ نہ کیا جائے بلکہ یہ بتایا جائے کہ ہمارے ملک میں سب خیریت سے ہے، مسلمان بڑے امن و سکون کی زندگی جی رہے ہیں تاکہ بیرونی ممالک میں ہندوستان کی شہرت کو بٹہ نہ لگے۔ لیکن امت سے وفاداری کا تقاضا تھا کہ اس ملک میں پیش آنے والی اذیت ناک

صورت حال سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو مطلع کیا جاتا کہ وہ دینی حوالے سے اس ملک کے مسلمانوں سے ایک جسد واحد کا تعلق رکھتے ہیں۔ گویا امت کا وسیع مفاد ملک کے مفاد سے براہ راست ٹکرا رہا تھا۔ اب دو وفاداریوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا، ملک یا ملت۔ ہماری قوم پرست مذہبی قیادت نے اول الذکر کا انتخاب کرلیا۔

ایسا نہیں کہ ملک اور ملت کے مفاد میں یہ ٹکراؤ پہلی بار سامنے آیا ہو۔ گزشتہ پچاس برسوں میں ملی اور ملکی مفاد میں قدم قدم پر ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہوتی رہی ہے۔ ہماری قیادت چونکہ ہمیں مسلسل وطن پرستی کا درس دیتی رہی ہے بلکہ بسا اوقات یہ باور کرانے کی کوشش ہوتی رہی ہے کہ ملی اور ملکی مفاد گویا ساتھ ساتھ چلتے ہوں۔ حالانکہ ایک ایسی دینی امت جو موجودہ وطن پرست معاشرے سے بالکل مختلف ایک دوسرا نظام برپا کرنا چاہتی ہو، اس کا مفاد اس ملک کے مفاد سے ٹکرانا لازمی ہے جس کی ایک مثال ہم نے ابھی ایک عالم دین کے شش وپنج کی کیفیت میں ملاحظہ کی۔ ابھی ہماری دینی قیادت کو صرف یہی فیصلہ نہیں کرنا ہے کہ ملکی اور ملی وفاداریوں میں کس وفاداری کو ترجیح دیا جائے بلکہ ابھی تو اس مسئلے پر گفتگو کا آغاز ہونا باقی ہے کہ ایک متبادل دستور رکھنے والی امت کے لئے شریعت کی نظر میں مروجہ دستور کا کون کون سا حصہ قابل قبول ہے اور کون سا نہیں اور یہ کہ مسلمانوں کو اس ملک کا باقاعدہ نظریاتی شہری بننے کے لئے دستور میں کون کون سی بنیادی ترمیمات کی ضرورت ہوگی۔ مسلمان اس ملک میں اب تک نظری اعتبار سے اپنی حیثیت واضح نہیں کرپائے ہیں۔ ہم پہلے بھی یہ بات کہتے رہے ہیں کہ دستور اس ملک کو ایک طرف لے جانا چاہتا ہے تو قرآن بالکل مختلف سمت میں ایک مختلف نظام عدل کے قیام کا داعی ہے۔ دستور کا اصرار ہے کہ اس ملک میں سیکولر بنیادوں پر ایک متحدہ اور Common Civil Code کا معاشرہ قائم ہو تو دوسری طرف قرآن کا اس سے بھی کہیں شدت کے ساتھ مطالبہ ہے کہ اس ملک کے کارواں کا رخ قرآنی سول کوڈ کی طرف موڑ دیا جائے۔ اب مسلمانوں کو یا تو ان دو مطالبوں کے درمیان تطابق پیدا کرنا ہوگا اور اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو کسی ایک کو اپنے لئے منتخب کرلینا ہوگا۔ اسلام صرف افراد کو ہی قرآنی دستور حیات کا پابند نہیں بناتا بلکہ مسلم معاشرے اور مسلم حکومتوں سے بھی اس کا مطالبہ ہے کہ وہ قرآن کے علاوہ کسی اور دستور حیات کو اعتبار نہ بخشیں، حتی کہ قرآن کی رو سے کسی مسلم ملک کے لئے یہ جائز نہیں ہوسکتا کہ وہ یو این چارٹر کے Signatory کی حیثیت سے اقوام متحدہ

میں اپنی شمولیت پر اصرار کرے۔ مسلمان اور مسلمان حکومتیں ایک الٰہی چارٹر پر پہلے ہی دستخط کر چکی ہیں۔ اس لئے اب ان کے لئے کسی اور متبادل یا متضاد چارٹر پر دستخط کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

ملکی اور ملی وفاداری کی کشمکش نے بڑے بڑے اہل فکر کے حواس گم کر دیئے ہیں۔ اگر ایک طرف ہندوستان میں مولانا اسعد مدنی اور ان کے متقدمین کو اس بات پر فخر ہے کہ "ملک سے غداری کرنے والے بہت سے ہندوستانی ملیں گے لیکن ہندوستانی مسلمان نہیں ملیں گے۔" (الجمعیۃ، تحفظ شریعت نمبر ۱۲ نومبر ۹۰ء، ص ۱۳۱) تو دوسری طرف پڑوسی ملک پاکستان میں ملکی وفاداری ملی وفاداری پر کچھ اس طرح غالب آئی ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ جیسے صاحب فکر پاکستان اور اس کے مستقبل کی فکر میں ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل سے خود کو یکسر لاتعلق محسوس کرتے ہیں۔ منیر کمیشن کو ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے، جب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے یہ پوچھا گیا کہ اگر آپ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں تو کیا آپ ہندوؤں کو اس بات کی اجازت دیں گے کہ وہ اپنا دستور اپنے مذہب کے اصولوں پر بنائیں تو مولانا مودودی نے کہا کہ "یقیناً"، اور مجھے اس بات پر قطعی اعتراض نہیں ہوگا کہ اگر منو کے شاستروں کے مطابق ان کی حکومت میں مسلمانوں کو شودر اور ملیچھ کے طور پر رکھا جائے اور انہیں حکومت کا حصہ دار بننے سے روکا جائے اور بطور شہری انہیں کوئی حقوق نہیں دیئے جائیں۔" ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ جواب حسین احمد مدنی کے اس خیال سے کچھ مختلف نہیں ہے، جب تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا حل پیش کرتے ہوئے انھوں نے صاف صاف اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ "اب ہم پر پاکستانی مسلمانوں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی" اور یہ کہ "تقسیم ہند نے مسلم مفادات بھی تقسیم کر دیئے ہیں۔" حالانکہ یہ بات اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ ایک لجنڈار کھنے والی امت کا مفاد تقسیم نہیں ہو سکتا۔ پھر ملی وفاداری اور امت سے وابستگی کا تقاضا ہے کہ مسلمان قومی یا علاقائی حد بندیوں سے آگے نکل کر امت کے وسیع تر مفاد میں کام کریں۔ ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا یہ خیال کہ انہیں ہندوستانی مسلمانوں کو شودر اور ملیچھ کا درجہ دینے پر کچھ اعتراض نہ ہوگا ملی اور ملکی وفاداریوں میں اسی ٹکراؤ کو ظاہر کرتا ہے جس میں ملکی وفاداری ملی وفاداری پر سبقت لے گئی ہے، ورنہ ایک مسلمان کی غیرت کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے ہم مذہبوں کے ایک قابل ذکر گروہ پر ذلت کی دردناک کیفیت طاری کر دی جائے اور اسے اس بات پر "قطعی اعتراض نہ ہو"۔ پاکستانی قوم پرستی کی یہ لے جسے اب اسلامی

حوالے سے کسی قدر تقدس حاصل ہوگیا تھا، اتنی شدید تھی کہ یہ حقیقت بھلادی گئی کہ ہندوستان شرعی اعتبار سے ایک سابق دارالاسلام تھا جہاں مسلمانوں کے لئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ نئے نظام میں شودر اور ملیچھ کی حیثیت پر قناعت کرلیں۔

قومیت، وطن پرستی، سیکولرازم، ڈیموکریسی اور اس کے زیر اثر چھوٹے بڑے اجنبی تصورات نے ہماری فکر میں کچھ اس طرح اپنی جگہ بنالی ہے کہ اب زندگی کے ہر موڑ پر کوئی فیصلہ لیتے ہوئے ہم خود کو مسلسل شش وپنج میں محسوس کرتے ہیں۔ جذباتی طور پر ہم نے اب تک اسلام کو سینے سے لگائے رکھا ہے۔ ہم اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن ہمارے درد کا مداوا کرسکتا ہے لیکن عملی زندگی میں رہنمائی کے لئے اس کی طرف رخ کرنے کا رجحان مفقود ہے۔ جذباتی طور پر تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام اس ملک میں ایک قرآنی نظام کا قیام ہے لیکن عملی طور پر ہماری ساری قوت موجودہ نظام کفر کو استحکام بخشنے میں صرف ہورہی ہے۔ ہماری قابل ذکر اکثریت اب یہ سمجھنے لگی ہے کہ اس ملک میں ہمارا وجود اسی وقت تک باقی ہے جب تک سیکولر جمہوری نظام برقرار ہے حالانکہ پچاس سالوں کے تجربے نے ہمیں بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس نظام کے اندر رفتہ رفتہ ہم سے ہمارا سب کچھ کھویا جاتا رہا ہے۔

ان اجنبی تصورات کو شرعی بنیادوں پر جواز بخشنا تو مشکل ہے اس لئے ہمارے قائدین جب ان تصورات کی کھلم کھلا تبلیغ کرتے ہیں تو ان کی گفتگو سے شرعی اصطلاحات اور قال اللہ و قال الرسول کا انداز یکسر غائب ہوجاتا ہے۔ البتہ موجودہ صورت حال کو شرعی اعتبار بخشنے اور انہیں مسلمانوں کے درمیان قابل قبول بنانے کے لئے نئے تجدد پسند دانشوروں کا ایک گروہ ان دلائل کے ساتھ میدان میں آیا ہے کہ اب چونکہ دنیا مختصر ہوگئی ہے، لوگوں کی نقل مکانی کی وجہ سے معاشرے کا قدیم نظام کمزور پڑگیا ہے اور دنیا کے بیشتر حصوں میں Plural سوسائٹی وجود میں آرہی ہے اس لئے اب نئے عہد میں مسلمانوں کو نئی صورت حال کا خیال رکھتے ہوئے لبرل جمہوری اقدار کے درمیان سے ہی راہ بنانی ہوگی۔ بظاہر جدید تجدد پسندوں کے ان دلائل میں وزن محسوس ہوتا ہے لیکن اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ ایک ایسی صورت حال نہیں ہے جو تاریخ میں پہلی مرتبہ پیدا ہوگئی ہو۔ یقیناً دنیا ماضی کے مقابلے میں ایک چھوٹے سے گاؤں کی حیثیت اختیار کرگئی ہے جہاں ایک تہذیب دوسری تہذیب پر مسلسل اثرانداز ہورہی ہے، طاقتور تہذیبوں میں سبقت اور غلبے کے لئے ہر آن معرکہ برپا ہے اور یہ

بھی سچ ہے کہ کسی خطے میں انسانوں کے کسی گروہ کے لئے باقی دنیا سے یکسر لاتعلق ہوکر جینا اب خاصا مشکل ہوگیا ہے۔ لیکن یہ ساری صورت حال اگر غالب تہذیب کے لئے مثبت عوامل کے طور پر کام کر سکتی ہے تو اسلامی تہذیب کے غلبے کے لئے اس صورت حال کو کیوں نہیں استعمال کیا جاسکتا ہے؟ پھر یہ کہ اگر تاریخ کے کسی مرحلے میں دنیا بھر میں ایسے معاشرے وجود میں آنے لگیں جہاں مسلم اقلیات کے مسائل غالب تہذیب کے گرداب میں آکر شدت اختیار کرلیں تو کیا صورت حال کی سختی اس بات کا جواز فراہم کر سکتی ہے کہ مسلمان قرآن کو لپیٹ کر رکھ دیں اور اسلامی نظام کے قیام کا ایجنڈا ملتوی کردیا جائے۔

موجودہ ہندوستان میں جہاں اجنبی تصورات نے اسلامی فکری چوکھٹے میں اپنی جگہ کچھ اس طرح بنالی ہے کہ اب یہ سب کچھ مروجہ اسلامی فکر کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ امت کو اجنبی تصورات کے طلسم سے نجات دلایا جائے اور یہ جبھی ممکن ہے جب ہم اپنے پچاس سالہ فکری سفر کا معروضی ناقدانہ جائزہ لینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

تین فتوے۔ ایک سوال

مسلمانوں کو اب یہ فیصلہ کر لینا ہوگا کہ ان کا قائد کون ہے؟ ملائم یا محمدؐ

ہندوستانی مسلمانوں کا قائد کون ہے؟ ایک آواز شاہی امام عبداللہ بخاری اور شاہی امام کا قائد کون ہے؟ شری کانشی رام۔ ہندوستانی مسلمانوں کا قائد کون ہے؟ دوسری آواز مولانا توصیف رضا خان بریلوی اور مولانا توصیف کا قائد کون ہے؟ شری کانشی رام۔ ہندوستانی مسلمانوں کا قائد کون ہے؟ تیسری آواز ملی کونسل کے قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور قاضی مجاہد الاسلام کا قائد کون ہے؟ شری ملائم سنگھ یادو۔

ایک سوال کے یہ تین مختلف جواب ہمیں تین مختلف فتووں سے حاصل ہوئے ہیں جو گزشتہ سال اتر پردیش میں اسمبلی انتخابات کے موقع پر امام جامع مسجد عبداللہ بخاری، بریلی شریف کے مولانا توصیف رضا خان اور ملی کونسل کے علماء کرام کے دستخطوں سے جاری ہوئے تھے۔ ان فتووں کی چھوٹی تصویریں آپ کی سہولت کی خاطر ہم نے شریک اشاعت کر لی ہے۔

فتووں کی اس بھیڑ بھاڑ میں عام مسلمان پریشان ہے کہ آخر وہ کیا کرے؟ وہ کس کا کہا مانے اور کس کی رائے کو مسترد کر دے؟ ہر طرف جبہ و دستار والے لوگ اور تقدس والی شخصیتیں ہیں لیکن ان سب کے جواب الگ الگ ہیں۔ عام مسلمان کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ان سبھی علمائے کرام کی ہدایات کا ماخذ ایک ہے تو آخر ان کے جوابات اتنے مختلف کیونکر ہیں۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد نہیں ہے اور ہماری مذہبی قیادت اتحاد کے سارے جتن کر لینے کے باوجود عملاً اس کے حصول میں ناکام ہے۔ کسی معمولی شد بد رکھنے والے عالم دین سے پوچھئے تو وہ بتائے گا کہ اتحاد کے حصول کا نسخہ بڑا آسان ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "**واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا و لاتفرقوا**" یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور آپس میں تفرقے میں نہ پڑو" پھر آخر کیا وجہ ہے کہ یہ فتوے جاری

کرنے والے حضرات اس سیدھی سی ترکیب کے استعمال سے عاجز ہیں۔ کہنے کو تو مسلمانوں کے قائدین جبہ و دستار والے معتبر علمائے کرام ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان تمام حضرات نے اپنی قیادت کسی مشرک سیاسی قائد کے قدموں میں ڈال دی ہے۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کے بجائے ان میں سے کسی نے ملائم سنگھ کی دم پکڑ رکھی ہے تو کوئی مایاوتی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہے۔ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کی قیادت پر علمائے کرام فائز ہیں لیکن ذرا گہرائی سے جائزہ لیجئے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بالواسطہ طور پر امت مسلمہ کی باگ ڈور کفار و مشرکین کے ہاتھوں میں آگئی ہے گویا انہوں نے Proxy لیڈرشپ کے ذریعے ہمیں اپنے کنٹرول میں لے رکھا ہے۔

ان فتووں میں جو چیز سب سے زیادہ تشویشناک ہے وہ یہ کہ مختلف سیاسی پارٹیوں کو اقتدار سونپنے کا فیصلہ کتاب و سنت کے بجائے اپنے ذاتی رجحانات کی بنیاد پر کافی سمجھا گیا ہے۔ ان تینوں فتاووں میں دستخط کنندگان میں حضرت مولانا جیسے القاب و آداب کی کمی نہیں۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان تمام حضرات نے مسلمانوں کے لئے کوئی سمت متعین کرتے وقت کتاب و سنت سے رجوع کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی کسی ایسے اسلامی حکم کا تذکرہ کیا جس کے مطابق مخصوص صورت حال میں کسی مخصوص سیاسی پارٹی کو اقتدار بخشنا اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطالبہ تھا۔ چنانچہ عبداللہ بخاری صاحب اور مولانا توصیف رضا خاں سماجی انصاف کا معرکہ کانشی رام کی قیادت میں سر کرنا چاہتے ہیں تو دوسری طرف قاضی مجاہدالاسلام، سید کلب صادق، مجیب اللہ ندوی اور خلیل الرحمن سجاد ندوی وغیرہ حضرات شری ملائم سنگھ کی قیادت میں "سیکولرزم کے ذریعہ اپنے ملک کو صحیح خطوط پر لے چلنے" پر مصر ہیں۔ ایک عام مسلمان سخت حیرت میں مبتلا ہے کہ آخر وہ کون سے "صحیح خطوط ہیں" جن پر ملائم سنگھ کی قیادت میں ہمارے علمائے کرام اس ملک کے لے جانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

گزشتہ پچاس برسوں میں امت پر جو نظریاتی زوال آیا ہے اور ہماری مذہبی قیادت نے اہم نازک مسائل پر جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے کبھی یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اب اس امت کے قائد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ ملائم سنگھ یادو ہیں، اس لئے کہ اب ہمارے بہترین لوگ اس ملک کو محمدؐ کی قیادت میں ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر لے چلنے کے بجائے ملائم سنگھ جی کے سیکولر اصولوں پر اسے گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔













مولانا سید عبداللہ بخاری

شاہی امام جامع مسجد دہلی

اپیل

سید عبداللہ بخاری

27-9-1996

بہوجن سماج پارٹی

منوادی نظام کو ختم کر کے انسانیت نواز اور مساوات پر مبنی معاشرہ کا قیام کرنا۔

غنڈہ گردی، مافیا گردی، اور غیر سماجی عناصر کا خاتمہ کرنا۔

فرقہ پرستی کو فروغ دینے والی طاقتوں کو اقتدار میں آنے سے روکنا۔

ترقی کے تقاضوں کو فروغ دینا



بہوجن سماج پارٹی

مولانا محمد توصیف رضا خان

کے نام آل انڈیا ملی کونسل

خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی

ہندوستانی مسلمانوں کے فکری بحران کو دیکھنا ہو تو الیکشن کے موقع پر جاری ہونے والے مسلم قائدین کے بیانات پر نظر ڈالیں اور ان مہموں کے دوران کی جانے والی ان کی خطابت سے لطف اندوز ہوں۔ نہ کسی کو یہ پتہ ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ کسی کو اس بات کا احساس کہ اپنی ہوا و ہوس اور ذاتی رجحان کی بنیاد پر بڑے بڑے فیصلے لے کر وہ کس جرم عظیم کا مرتکب ہو رہا ہے۔ ان فتووں کی سطحیت اور ان میں پائی جانے والی خالص غیر دینی فکر اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے کہ فی الواقع اس ملک میں مسلمانوں کے پاس کوئی دینی قیادت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سیکولر فکر اور خیال کے افراد مذہبی حوالے سے ہماری دینی قیادت پر قابض ہو گئے ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ دین سے نابلد ایک عام سیاسی لیڈر کی رائے میں اور عمر بھر کتاب و سنت کا ورد کرنے والوں کے فیصلے میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اگر مستقبل کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے، تو وہ صرف کتاب و سنت کے ذریعہ۔ کتاب و سنت کی موجودگی کے باوجود انہیں کسی مزید رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ گمراہ کن فتووں پر اعتبار کرنے یا سیکولر ذہن رکھنے والے علماء سے رہنمائی کی توقع کرنے کے بجائے ہم اس رجحان کو رواج دیں کہ کسی خاص مسئلے پر اللہ کی کتاب کیا کہتی ہے اور اس بارے میں رسول اللہ کی سنت سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے۔ ورنہ ہوگا یہ کہ رسول اللہ کی نیابت کا دم بھرنے والی یہ امت عملاً کفار و مشرکین کی ہدایات کی اسیر ہو جائے گی۔ افسوس کہ بڑی حد تک ایسا ہو چکا ہے۔ اگر مسلمان اس ملک میں اپنے لئے کوئی روشن مستقبل چاہتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ بلا تاخیر دو راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں، ملائم یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

مسلم نسل کشی کے پچاس سال

کیا ہندوستانی مسلمان خوف کی نفسیات سے باہر آسکیں گے؟

ہندوستانی مسلمانوں کی پچاس سالہ زندگی کا کوئی احتساب اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ فرقہ وارانہ فسادات کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ لیکن ٹھہریے، عام طور پر جسے فرقہ وارانہ فساد سمجھا جاتا ہے یا حکومت کی رپورٹیں، سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کی تحقیقات اور اقلیتی کمیشن کے گوشوارے جسے فرقہ وارانہ فسادات باور کراتے ہیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات میں مختلف قومیں باہم دست بہ گریباں ہوتی ہیں۔ اگر یہ صورت حال سنگین نوعیت اختیار کرلے تو نسبتاً کم حوصلہ یا کمزور قوموں کا نقصان زیادہ ہوتا ہے، البتہ ہندوستان میں مسلمانوں کو جس صورت حال کا سامنا رہا ہے اس میں انہیں براہ راست حکومت کی منظم مشنری، پولیس اور فوج کے دستوں سے واسطہ پیش آتا رہا ہے۔ اس لئے یہ کہنا دراصل حقیقت کو جھٹلانا ہوگا کہ اس ملک میں مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی نسل کشی کے بڑے بڑے بازار جو تواتر اور تسلسل کے ساتھ سجتے رہے ہیں ان کی نوعیت محض فرقہ وارانہ فسادات کی ہے۔

جب پولیس کنٹرول روم سے جوانوں کو باقاعدہ یہ ہدایت مل رہی ہو کہ مسلمانوں کے گھروں کو جلائے جانے سے نہ روکا جائے اور ان تک کسی بھی قسم کی مدد نہ پہنچنے دی جائے، جیسا کہ مابعد انہدام فساد کے موقع پر بمبئی میں پیش آیا، یا جب مسلم نوجوانوں کو باقاعدہ ٹرک میں بھر کر پولیس کے جوان یکے بعد دیگرے ان کو گولیوں کا نشانہ بنا کر نہر میں پھینک کر جلد از جلد اپنا کام نمٹانا چاہتے ہوں، جیسا کہ ملیانہ اور ہاشم پورہ کے واقعات سے ثابت ہے، یا جب پولیس کی امان میں مسلمان بچوں اور عورتوں سے بھری بس کو آگ لگادی جاتی ہو، جیسا کہ جمشید پور میں پیش آیا، یا نہتے نمازیوں پر منظم پولیس زور و شور سے فائر کا

دہانہ کھول دیتی ہو جیساکہ مراد آباد میں عید کے دن پیش آیا، تو ان صورت حال کو محض فرقہ وارانہ فساد کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو مسلسل ریاستی دہشت گردی کا سامنا رہا ہے۔ ان کا مقابلہ مختلف سطحوں پر منظم پولیس اور پارا ملٹری فورسز سے ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فساد کے بعد جانی مالی نقصانات اور پولیس حراست میں جھوٹے مقدمات بھی مسلمانوں کے حصے میں دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ آئے ہیں۔ کبھی یہ ریاستی دہشت گردی منظم طریقے سے پولیس کے ذریعہ انجام پاتی ہے تو کبھی قوانین کا سہارا لے کر ٹاڈا جیسے سیاہ ایکٹ کا اطلاق ہوتا ہے، جس کی اذیت بڑی حد تک صرف مسلمانوں کے حصے میں آتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ملک بھر میں اتنے بڑے پیمانے پر فسادات کون کراتا ہے اور یہ کہ اس کے پیچھے اصل مقصد کیا ہے؟ مسلمانوں کے دل و دماغ میں اب دور دور تک بھی پاکستان کی طرف ہجرت کا کوئی ارادہ نہیں ہے، لہٰذا ہندو احیاء پرستوں کا یہ نعرہ کہ "مسلمانوں کے لئے دو استھان، پاکستان یا قبرستان" عملی طور پر ممکن نظر نہیں آتا۔ پھر فسادات کرانے والے آخر چاہتے کیا ہیں؟ فسادات کی تھیوری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ فسادات ان شہروں میں برپا ہوتے ہیں جہاں مسلمان معاشی طور پر یا تو مستحکم ہوگئے ہیں یا تجارت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان کا مقابلہ مقامی تاجروں سے ہوتا ہے اور مقامی ہندو تاجر چونکہ ان ابھرتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے لئے خطرہ تصور کرتے ہیں اس لئے وہ مقامی غنڈوں اور زہریلے دماغ کے ہندوؤں کی مدد سے فساد برپا کرتے ہیں تاکہ مسلم تاجروں کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ پھر وہ بہت دنوں تک مسابقت کے لائق نہ رہیں۔ یقیناً اس تجزیئے میں جزوی صداقت موجود ہے البتہ اگر فسادات صرف ان مقامی تاجروں کی رسہ کشی کا نتیجہ ہوتے تو ان کا دائرہ کار بھی چند شہروں یا قصبات تک محدود ہوتا۔ پھر ملک گیر سطح پر فسادات کے برپا ہونے کی آخر کیا وجہ ہے؟ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک بھر میں جس شدت کے ساتھ فسادات بھڑک اٹھے اس سے بھی اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ملک بھر میں مسلمانوں کے خلاف حکومتی سطح پر کوئی خاموش پالیسی پائی جاتی ہے۔ ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ مسجد کے انہدام کے بعد ایک مظلوم اور بے بس قوم پر ملک بھر میں حکومت کی مشیزی بلا دریغ فائر کے دہانے کھول دے۔ سوال یہ ہے کہ اگر فسادات اور نسل کشی کے ان واقعات سے مسلمانوں کا وجود اس ملک سے ختم ہونا ممکن نہیں تو آخر نسل کشی کے پالیسی ساز اس بربریت سے کیا

حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

حکومتی پالیسی سازوں اور ہندو احیاء پرستوں کو مشترکہ طور پر مسلمانوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ مسلمان اس ملک میں اپنے عزائم سے دست بردار ہو جائیں، وہ بڑی بڑی باتیں کرنا چھوڑ دیں اور یہ بھول جائیں کہ کبھی وہ اس ملک میں سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ مسلمانوں کو ان کے عزائم سے دست بردار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان پر مسلسل خوف کی کیفیت طاری رکھی جائے، انہیں ہر لحہ اپنی جان و مال کے تحفظ کا خوف ہو، ماں بہنوں کی آبرو لٹ جانے کا ڈر ہو اور ہر لحہ انہیں ایسا لگتا ہو کہ کوئی خطرناک بات زبان سے نکالنے پر کسی بھی لحہ ان کی زندگی کا چراغ گل ہو سکتا ہے۔ تحفظ کی زندگی اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ ایک سمجھ دار اقلیت کی حیثیت سے ہمارے رحم و کرم پر جینا قبول کرلیں اور یہ کہ تحفظ کے لئے بار بار ان ہی باتوں کا حوالہ دیں جو ہم نے ان سے کی ہیں۔ دیکھا جائے تو مسلمانوں کو خوف کی نفسیات سے دوچار کرنے میں ہمارے پالیسی ساز خاصے کامیاب رہے ہیں۔ ہم مسلمانوں کی قابل ذکر اکثریت صرف اپنی جان و مال کے تحفظ کی فکر میں مصروف ہے۔ اسے بڑی باتیں کرنے یا اہم مسائل پر غور و فکر کے لئے فرصت ہی کب ہے۔

Ken Kesey کے ناول One Flew over the Cuckoo's Nest میں کمیونزم کے جبر کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک سرپرست نرس کا ذکر کیا گیا ہے جس کے خوف سے ہاسپٹل کے سارے مریض کانپ جاتے ہیں۔ سرپرست نرس کا تذکرہ آتے ہی سبھوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں، سبھوں کو اس نرس سے خوف بھی ہے لیکن معاملہ جب آزادی کے حصول کا آتا ہے یا جب یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح ان نرس کی سرپرستی کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکا جائے تو ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ آخر وہ آزاد ہو کر جائے گا کہاں، جیسا بھی ہے بھلا یا برا اس جبر تلے زندگی تو بسر ہو رہی ہے، معلوم نہیں آگے کیا ہو۔ کچھ یہی حال ہندوستانی مسلمانوں کا ہے۔ ان کے اردگرد خوف نے کچھ اس طرح اپنا گھیرا تنگ کرلیا ہے کہ انہیں اس صورت حال سے نکلتے ہوئے بھی خوف آتا ہے۔ انہیں اس نظام جبر سے حد درجہ شکایت ہے لیکن وہ ان شکایتوں کو بھی اس نظام جبر سے فدویانہ درخواستوں کے ذریعہ حل کرانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیکولر ڈیموکریسی کے ہاتھوں مسلسل زخم کھانے کے باوجود وہ بار بار اسی سیکولر ڈیموکریسی کے استحکام کے لئے عرض گزارتے ہیں۔

فسادات چھوٹے ہوں یا بڑے اس کی پلاننگ ہندو احیاء پرست کرتے ہوں یا حکومت کے پالیسی ساز ادارے، ان سب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں پر خوف کے ماحول کو مزید گہرا کیا جائے اور اسے مزید طول دیا جائے۔ ورنہ اگر مسلمانوں کو اپنی صحیح عددی قوت کا اندازہ ہوگیا اور خوف کی نفسیات سے نکل کر ان کے قائدین نے مستقبل کی منصوبہ بندی کا کام شروع کردیا تو قوت کے موجودہ میزانیے میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوجائے گی۔ مسلمانوں کو خوف کی نفسیات سے دوچار کرنے کا یہ منصوبہ آزادی سے بہت پہلے مرتب کیا گیا تھا، جس پر کمال عیاری کے ساتھ اس وقت کے غیر مسلم قائدین نے عمل کرنا شروع کردیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیات میں حیرت انگیز تبدیلی آگئی تھی۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا ایک طویل داستان ہے۔ البتہ ہم یہاں اشارتاً صرف اتنا کہنا چاہیں گے کہ خلافت تحریک میں مسلمان ایک فیصلہ کن قوت کی حیثیت سے ہندوستان کے مستقبل کے فیصلے کی بات کررہے تھے، لیکن ۱۹۳۵ء کے بعد ان کی ساری سرگرمیوں کا مرکز مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ بن گیا اور اس مقصد کی خاطر ایک الگ ملک کا مطالبہ بھی سامنے آگیا۔ تاریخ کی کمان مسلمانوں کے ہاتھوں سے کس طرح پھسلتی گئی اس کا ذرا اندازہ کیجیے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات ہوئی جس کی حکومت اس ملک میں قوت اسلامی کا علامیہ سمجھی جاتی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں مغلیہ حکومت کا چراغ گل ہوگیا۔ ٹھیک ۹۰ سال بعد ۱۹۴۷ء میں جب انگریز اقتدار کی منتقلی کا فارمولہ ترتیب دے رہے تھے مسلمانوں کے ذہن پر جو چیز سب سے زیادہ حاوی تھی وہ یہ کہ انگریز جانے سے پہلے ان کے تحفظ کا کام کرجائے۔ قرارداد پاکستان سے پہلے اور بعد میں بھی کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ انگریزوں نے اس ملک کا اقتدار جن ہاتھوں سے لیا تھا جاتے وقت انہی ہاتھوں کو اقتدار منتقل کرنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس ہوا یہ کہ مسلمان خوف کی نفسیات میں اس بری طرح مبتلا ہوگئے کہ انہیں اپنے ہی ملک میں اپنی حفاظت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ بقول ابوالکلام آزاد انہیں اپنے سائے سے ڈر لگنے لگا۔ ظاہر ہے کہ جب پوری قوم پر خوف کا غلبہ ہو، قویٰ مضمحل اور ہمتیں جواب دے چکی ہوں تو ایسی صورت حال میں وہ قوموں کی سیادت کا کام انجام نہیں دے سکتی۔ اسے تو صرف اس بات کی فکر تھی کہ ہماری جان و مال کے تحفظ کا انتظام ہوجائے۔ خواہ ایسا ملک کے ایک چھوٹے سے حصے ہی میں کیوں نہ ہو اور خواہ اس کے لئے اسلاف کی دلی کو کیوں نہ خیرباد کہنا پڑے۔

پچاس سالہ مسلم نسل کشی

(ایک نامکمل جدول)

سال	فسادات کی تعداد	مقتولین	دائرہ اثر
1947			
1948		5,00,000	
1950	564	2,00,000	شمالی ہند
1960	2689	2,000	
1961	92	3146	شمالی ہند
1962	60		
1963	61		بہار / گجرات
1964	1170		
1965	676		
1966	133		
1967	220		
1968	346		
1969	519		
1970	521		
1971	321		
1972	240	70	
1973	242	72	
1974	248	87	
1975	205	33	
1976	169	39	
1977	188	36	
1978	230	110	
1979	304	261	
1980	427	375	
1981	319	196	ملک بھر میں
1982	309	118	
1991-92	4300	3350	خصوصاً
1993	2292	952	
1994	179	78	ممبئی / سورت
1995	99 (جون تک)	36	

مکمل اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ ہم نے مختلف ماخذ سامنے رکھ کر یہ جدول تیار کیا ہے جن میں پارلیمانی استفسارات اور وقتاً فوقتاً سرکاری اور نیم سرکاری اداروں سے شائع ہونے والی رپورٹیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اقلیتی کمیشن، نیشنل انٹگریشن کاؤنسل اور وزارت داخلہ کی سالانہ رپورٹیں بھی شامل ہیں۔ بعض مشمولات مسلم انڈیا اور بزنس اسٹینڈرڈ سے بھی لئے گئے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد حکومت کے وہ پالیسی ساز جو ملک میں بہت سے چھوٹے چھوٹے پاکستان کے بجائے ایک بڑا پاکستان بن جانے پر اطمینان کا سانس لے رہے تھے انہیں اس بات سے سخت مایوسی ہوئی کہ پاکستان بن جانے کے باوجود مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لہٰذا تقسیم کے ابتدائی دنوں میں عین حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں کی جان و مال پر حملے شروع ہوگئے، جس کا تذکرہ مولانا آزاد نے اپنی تحریروں میں جا بجا کیا ہے۔ ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگئی جس پر گاندھی جی بھی خود کو بے بس محسوس کرتے تھے۔ اس سارے ہنگامے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے عزائم پست ہوجائیں۔ اولاً یا تو وہ اس ملک سے ہجرت کر جائیں۔ ثانیاً، اگر وہ رہنا بھی چاہیں تو ہندوؤں کے رحم و کرم پر فدویانہ اور ملتجیانہ انداز سے زندگی گزاریں تاکہ مستقبل میں مسلم سیاسی قوت کے احیاء کا کوئی امکان نہ رہے۔ تب سے اب تک فرقہ وارانہ فسادات کے نام پر مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کرنے اور ان کو خوف کی نفسیات میں مبتلا رکھنے کا کام جاری ہے۔

آزادی کے بعد سے اب تک جن علاقوں میں کثرت سے فسادات ہوئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فسادات کا بنیادی مقصد خوف کا ماحول طاری کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہر فساد میں ایک نئی وحشت ناک اسٹریٹیجی بروئے کار لائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بمبئی کے مابعد انہدام فسادات میں مسلمانوں کے ان طبقوں کو نشانہ بنایا گیا جو مال و دولت یا مناصب کی وجہ سے اب تک خود کو محفوظ تصور کرتے تھے۔ لہٰذا وہ لوگ بھی جو فسادات میں غریب مسلمانوں کی ہمت بڑھانے کے لئے ہمدردی کے دو بول کہہ دیتے تھے انہیں بھی اتنا خوف زدہ کیا گیا کہ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے اداکار اور اداکارہ عام مسلم جلسوں میں پھوٹ پھوٹ کر روتے نظر آئے۔ حیدر آباد میں کرکٹ کیپٹن محمد اظہرالدین کے گھر پر حملہ کیا گیا اور دلی یونیورسٹی کے معروف کمیونسٹ پروفیسر مونس رضا کو کیمپس چھوڑ کر پرانی دلی میں پناہ لینی پڑی۔ راہی معصوم رضا جنہیں مہابھارت کی ٹی وی کہانی لکھنے کا اعزاز حاصل ہے ان کی اہلیہ پناہ کی تلاش میں بھنڈی بازار کے علاقے میں نظر آئیں اور شبانہ اعظمی جب جے این یو کے ایک جلسے میں اپنی داستان سنانے کھڑی ہوئیں تو اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ سورت میں مسلمانوں کا مورل پست کرنے کے لئے مسلم خواتین پر ظلم کا ایک نیا باب رقم کیا گیا۔ مسلمان غریب ہوں یا امیر، جاہل ہوں یا پڑھے لکھے، سرکار دربار سے ان کا تعلق ہو یا نہ ہو اس بات کی بھرپور کوشش

کی جاتی رہی ہے کہ انہیں خوف اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا رکھا جائے۔ یہ کسی طرح اس پوزیشن میں نہ ہوں کہ اپنے طور پر کچھ سوچ سکیں۔

گزشتہ پچاس برسوں کے فرقہ وارانہ فسادات پر ایک نگاہ ڈالنے سے ان فسادات میں ایک تسلسل کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۹۶۱ء کے جمشید پور، جبل پور اور راوڑ کیلا کے فسادات پر ۱۹۶۴ء کے فسادات کیفیت کے اعتبار سے سبقت لے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں رانچی کا فساد مسلمانوں کو یہ سبق سکھاتا ہے کہ وہ اپنی زبان کے تحفظ کا خواب ترک کر دیں اور ۱۹۶۹ء میں احمد آباد کا فساد ان کے اندر سخت احساس محرومی اور بے بسی پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں ترکمان گیٹ کا قتل گویا اس بات کی وضاحت ہے کہ مرکز کے اہم عہدیداران کی نظروں میں مسلمانوں کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ۱۹۸۰ء کے مراد آباد کے فساد سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اب اس ملک میں مسلمانوں کا بڑی تعداد میں ایک جگہ جمع ہونا، خواہ ایسا کرنا عید کی نماز کے لئے ہی کیوں نہ ہوں، تحفظ کے نقطہ نظر سے انتہائی خطرناک ہے۔ ۱۹۸۳ء میں نیلی (آسام) میں ایک وحشیانہ رسم کے ساتھ قتل عام کا بازار لگایا جاتا ہے تو ۱۹۸۴ء میں بھیونڈی میں نئے ابھرتے مسلم تاجروں سے ان کا اعتماد چھین لیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں میرٹھ کے واقعات ان سب پر بازی لے جاتے ہیں پھر بھاگلپور کا واقعہ ہے اور اس کے بعد ایڈوانی کی رتھ یاترا کے جلو میں چھوٹے بڑے فسادات کا ملک بھر میں ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ جو بالآخر بابری مسجد کے انہدام پر منتج ہوا اور جس کے بعد پورا ملک کئی ہفتوں تک مقتل بنا رہا۔ ان تمام فسادات میں ایک بات جو مشترک نظر آتی ہے وہ یہ کہ ہر موقع پر خوف زدہ کرنے کے لئے نئے نئے طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ کہیں مسلمان بہنوں کی آبروریزی ہے تو کہیں نوجوانوں کا قتل، کہیں مسلمانوں کے بااثر حلقوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش ہے تو کہیں حکومت کی طرف سے یہ تاثر عام کیا جارہا ہے کہ مسلمانوں کی حفاظت کا کام ایک واقعتاً سیکولر حکومت ہی انجام دے سکتی ہے اور جس کے بہت سے دعویدار اس ملک میں پہلے ہی سے موجود ہیں۔

قوانین نافذ کرنے والے حکومت کے عالی عہدیدار اور پالیسی ساز اس مسئلے پر واقعی کس طرح سوچتے ہیں اس کا بہت کچھ اندازہ ذیل کے ان اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے جو وقتاً فوقتاً غیر مسلم اہل قلم نے لکھے ہیں:

۱۱ اور ۱۲ / اپریل فساد کے ابتدائی دو دنوں میں بہار پولیس اور ریاستی دستوں کو کھلی چھوٹ

ملی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے بہار ملٹری پولیس کی کمان کسی آر ایس ایس آفیسر کے ہاتھ میں ہو۔ فساد کے شروع ہونے کے چند ہی گھنٹوں کے بعد بی ایم پی حرکت میں آگئی۔ وہ مسلمانوں کی بستیوں میں اس طرح داخل ہونے لگے جیسے انہیں چن چن کر نشانہ بنا رہے ہوں۔"

(اکنامک اینڈ پولیٹکل ویکلی، ۱۹/ مئی ۱۹۷۹ء، ص ۸۷۰)

"حتیٰ کہ آج بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز بہت سے ہندو مسلمانوں کو ممکنہ پاکستانی تصور کرتے ہیں۔ کوئی ربع صدی پہلے جب میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا، مجھے آج بھی یاد ہے کہ ہمیں حکومت سے جو خفیہ ہدایات ملتی تھیں ان میں کہا جاتا تھا کہ امن و امان کے درہم برہم ہونے کی کسی بھی نازک گھڑی میں مسلمانوں پر خاص نظر رکھی جائے۔ بلکہ اگر ضروری معلوم ہو تو ان کے لائسنس یافتہ ہتھیار بھی ضبط کرلئے جائیں جبکہ ممکنہ ہندو فسادیوں کے بارے میں ایسی کوئی ہدایات نہیں دی جاتی تھیں۔"

(ایم این بچھ، انڈین ایکسپریس، ۱۳/ دسمبر ۱۹۹۰ء، ص ۵)

"پولیس نے انتہائی منصوبہ بند طریقے سے مصطفیٰ اور عثمانی مسجد کا محاصرہ کرلیا جو شمالی مشرقی دہلی میں ہے۔ اس نے لوگوں پر گولیاں چلائیں، انہیں مار ڈالا، انہیں دہشت زدہ کیا اور نمازیوں کو اذیت پہنچائی۔ منظم گروہوں نے دو طرف سے حملہ کیا۔ تیسری طرف سے پولیس آگئی جس نے قتل، لوٹ مار اور عورتوں کی آبروریزی کا سلسلہ شروع کردیا۔ مختصر یہ کہ یہاں ایک طرف مسلح پولیس تھی تو دوسری طرف بے بس مسلمان۔"

(ڈاکٹر انوپ سراپا، ریڈینس، ۱۷۔۲۳/ جنوری ۱۹۹۳ء)

"جو کچھ میں نے دیکھا اس کی بنیاد پر پہلا تاثر تو یہی قائم ہوتا ہے کہ پی اے سی نے مسلمانوں کی گھنی آبادیوں والے علاقے میں بہت سے مسلمان مردوں کو بلاوجہ قتل کیا ہے۔ میں نے عورتوں اور بچوں سے ملاقاتیں کیں، وہ سب غم سے ٹوٹے جاتے تھے۔ میرے لئے اپنے آنسو روکنا مشکل ہوگیا۔ بہت سے نوجوان لیکن سب کے سب مسلمان، سب کے سب غریب اور نہتے، ان سبھوں کو پی اے سی نے ان کے گھروں سے نکال کر مار ڈالا۔ ان مصیبت زدہ لوگوں کی تعزیت کیسے کی جائے۔ جو مارے گئے وہ بے گناہ تھے، پولیس کی زیادتی

کا شکار ہوئے ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ فرقہ وارانہ جھڑپوں پر قابو پانے کے لئے پولیس کے ایکشن میں آجانے کی وجہ سے یہ قتل نہیں ہوئے ۔ میں نے وہ دردناک کہانیاں سنی ہیں کہ کس طرح پولیس والوں نے لوگوں کو ان کی جھونپڑیوں سے نکال نکال کر مارا ... میں نے کلکٹر سے پوچھا کہ کیا کوئی ہندو بھی مارا گیا ہے کہ اگر یہ فرقہ وارانہ فساد ہوتا تو ایسا ہونا ضروری تھا۔ میں نے مسلم علاقوں میں جاکر ہندوؤں سے پوچھا۔ وہ گھنی مسلم آبادی کے علاقوں میں محفوظ تھے ۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ مارے جانے والے سب کے سب ایک ہی فرقے کے لوگ تھے اور درد کے مارے یہ لوگ جن جگھوں پر آباد تھے وہاں اکا دکا ہندو بھی پوری طرح محفوظ تھا۔"

(وی آر کرشنا آیر، سابق جج سپریم کورٹ، مکتوب بنام وزیر داخلہ، ۱۱ / نومبر ۱۹۸۲ء)

یہ اور اس قسم کے بے شمار اقتباسات اس بات پر دال ہیں کہ اس ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کے نام پر جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ دراصل ریاستی دہشت گردی ہے ۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک بھر میں پیش آنے والے دردناک واقعات پر ہندو صحافیوں نے جتنا کچھ لکھا ہے اس سے بھی اس تھیوری کو تقویت ملتی ہے۔ اب اگر کسی وجہ سے حکومت کی مشنری میں ایسے لوگ گھس آئے ہوں جو مسلمانوں کے وجود کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں یا یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی پالیسی کے نتیجے میں ہو، بہرحال مسلمانوں کے ارباب حل و عقد کو اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کہ خوف کی نفسیات میں مبتلا رکھنے کی اس کوشش کا سدباب کیسے کیا جائے کہ جب تک امت خوف کی صورت حال سے باہر نہیں نکلتی کسی بڑے انقلابی منصوبے کو کسی عوامی تحریک کا حصہ بنانا ممکن نہیں ہوسکتا۔

ملک بھر میں فساد زدہ علاقوں کی ایک اجمالی فہرست
(۱۹۴۷ء - ۱۹۹۷ء)

آندھرا پردیش : عادل آباد، حیدر آباد، کریم نگر، کرنول، میڈک، نلگنڈا، نظام آباد، رنگا ریڈی۔
آسام : کچھار، درانگ، گول پارہ، کام روپ، نوگونگ۔
بہار : بھاگل پور، بھوج پور، چمپارن (مغربی و مشرقی) در بھنگہ، گیا، گریڈیہ، گوپال گنج، ہزاری باغ،

مدھوبنی، مونگیر، نالندہ، پٹنہ، پورنیہ، رانچی، سنتھال پرگنہ، سیوان، سنگھ بھور اور سیتھا مڑھی

دہلی : سنٹرل دہلی، مشرقی دہلی اور شمالی دہلی۔

گجرات : احمد آباد، بڑودا، بانس کنٹا، بھروچ، جام نگر، جوناگڑھ، کھیدا، پانچ محل، سابر کنتھا اور سورت۔

کیرالہ : کنانور، ملام پورم، ٹریچوی، تریوندرم۔

کرناٹک : بنگلور، بیدر، دھارواڑ، گلبرگہ، کولار، میسور، ساؤتھ کنارا۔

مدھ پردیش: بھوپال، چھندواڑہ، داموہ، جبل پور، کھنڈوا، کھارگون، منڈسور، رائے گڑھ، رائے سن، رتلام، ساگر، سیہور، سیونی، شاجاپور، اجین اور ویدیشا۔

مہاراشٹر : احمد نگر، آکولا، امراوتی، گریٹر بمبئی، بلڈانہ، ناسک، پربھنی، پونے اور تھانے۔

اڑیسہ : بالاسور اور کٹک۔

راجستھان : بھلواڑہ، چتور گڑھ، جودھ پور، جے پور، کوٹہ، ناگپور، پالی، اودے پور۔

تامل ناڈو : آرکوٹ (شمال و جنوب) کوئمبٹور، دھرماپور، مدورائی، رغنتاپورم، تیرونلویلی، ٹریچی۔

یوپی : آگرہ، علی گڑھ، الہٰ آباد، اعظم گڑھ، بدایوں، بہرائچ، باندہ، بارہ بنکی، بریلی، بستی، بجنور، بلند شہر، دیوریا، فیض آباد، فتح پور، غازی پور، غازی آباد، گونڈہ، گورکھپور، جونپور، کان پور، لکھنو، متھرا، میرٹھ، مراد آباد، مظفر نگر، نینی تال، پیلی بھیت، پرتاب گڑھ، رائے بریلی، رام پور، سہارنپور، شاہ جہاں آباد، سیتاپور، وارانسی۔

مغربی بنگال : کلکتہ، مرشد آباد، ندیا، ۲۴ پرگنہ۔

تحفظ شریعت سے نفاذ شریعت تک

شاہ بانو قضیہ دوبارہ سر اٹھا رہا ہے

ابھی حال ہی میں سپریم کورٹ نے مسلم خواتین کے سلسلے میں ایک نیا فیصلہ صادر کیا ہے۔ اس فیصلے میں یہ کہا گیا ہے کہ طلاق یافتہ ماؤں کے بچوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ بلوغت تک اپنے مصارف کے لئے اپنے باپ سے رقم طلب کریں۔ کورٹ کا کہنا ہے کہ بچوں کو اپنی کفالت کے لئے باپ سے رقم طلب کرنے کا قانونی حق حاصل ہے۔ جہاں تک ماں کا تعلق ہے ۱۹۸۶ء میں پاس ہونے والے مسلم خواتین ایکٹ کی رو سے طلاق یافتہ عورت کو اپنے شوہر سے صرف عدت کے دوران نان نفقہ کی طلبی کا حق حاصل ہے۔ کورٹ کا کہنا ہے کہ اگر ملک کے دوسرے بچے 125 Cr Pc کے تحت اپنے باپ سے کفالت کے لئے رقم طلب کرنے کا حق رکھتے ہیں تو مسلم بچوں کو صرف اس لئے اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوگئے ہیں۔ رہا مسلمانوں کے لئے علیٰحدہ مسلم خواتین ایکٹ ۱۹۸۶ء کا مسئلہ تو کورٹ کا کہنا یہ ہے کہ اس ایکٹ میں مطلقہ خواتین کو اپنے سابق شوہر سے نان نفقہ کی طلبی سے ضرور منع کیا گیا ہے، البتہ اس میں یہ بات نہیں کی گئی ہے کہ ان بچوں کو جو اپنی مطلقہ ماؤں کے ساتھ رہ رہے ہیں انہیں اپنے باپ سے اخراجات کی طلبی کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس لئے سپریم کورٹ نے ابھی تازہ تازہ فیصلے میں یہ حکم جاری کیا ہے کہ بچوں کو ان کے باپوں سے اخراجات کے لئے باضابطہ رقم دلوائی جائے یہاں تک کہ لڑکا بلوغت کی عمر کو پہنچ جائے اور لڑکی شادی کے بعد اپنی سسرال کو رخصت ہوجائے۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے نے شاہ بانو قضیہ کو گویا دوبارہ تازہ کردیا ہے۔ امت کے اہل فکر حضرات کے سامنے ایک بار پھر یہ سوال پوری شدت کے ساتھ آگیا ہے کہ وہ جس مسلم خواتین بل کے پاس ہوجانے کو آزاد ہندوستان میں شریعت کی فتح سے تعبیر کررہے تھے، اب اسی ایکٹ میں عدالت عالیہ

نے ایک نیا نکتہ دریافت کرلیا ہے۔ اسلامی نظام عدل کے حوالے سے دیکھا جائے تو بچے کی تربیت کی ذمہ داری ماں سے کہیں زیادہ باپ پر عائد ہوتی ہے۔ پھر بچوں کی پرورش و پرداخت کی ساری ذمہ داری ماں کے سرڈال دینا کہاں کا انصاف ہے۔ باپ طلاق دے کر اپنی بیوی سے علیحدگی تو اختیار کرسکتا ہے لیکن وہ اپنے بچوں کے مستقبل سے کیسے لاتعلق ہوسکتا ہے۔ ۱۹۸۶ء کے مسلم خواتین ایکٹ میں باپ پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ عورت کو صرف عدت کی مدت تک نان نفقہ ادا کرے۔ البتہ دو سال سے چھوٹے بچوں کے اخراجات کی ادائیگی کی ذمہ داری باپ کے سرڈالی گئی ہے۔ اب سپریم کورٹ کے ایک حالیہ فیصلے نے نور صبا خاتون بنام محمد قاسم کے مقدمے کے حوالے سے، بچوں کے لئے دو سال کی مدت بڑھا کر بلوغت کردی ہے۔ گویا اب طلاق دینے والے باپ کے لئے صرف یہ کہہ کر پیچھا چھڑانا ممکن نہ ہوگا کہ یہ بچے ہماری طلاق یافتہ بیوی سے ہیں، جس کو ہم نے دوران عدت کفالت کی رقم دے دی ہے اور ان بچوں کے لئے دو سال کے اخراجات کی رقم بھی چکادی ہے بلکہ اب باپوں کو اپنی سابق بیویوں کے بچوں کو بھی بلوغت تک پرورش کی ذمہ داری نبھانی ہوگی۔ انصاف کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس فیصلے میں ان تمام ناآسودہ بچوں کی آرزوؤں کی تکمیل کا سامان ہے جن کے خواب ماں باپ کی خانگی زندگی کے تباہ ہونے سے بکھر جاتے ہیں اور جنہیں صرف اس لئے ایک اذیت ناک زندگی سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ ان کی ماں ایک بھرپور ماں نہیں بلکہ ایک مطلقہ ماں ہے۔

البتہ جو لوگ مسلم خواتین بل کو آزاد ہندوستان میں شریعت کی فتح گردانتے ہیں یا جو یہ سمجھتے رہے ہیں کہ مسلم خواتین بل پاس ہوجانے سے اس ملک میں شریعت کو تحفظ حاصل ہوگیا ہے انہیں یقیناً اس فیصلے سے دھچکا لگے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جس بل کو بڑے جوش و خروش سے پارلیمنٹ سے پاس کرایا گیا وہ اتنا کمزور اور بے جان سا قانون ہے جس کی مختلف انداز سے تعبیر کی جاسکتی ہے اور جس کا نمونہ اس مذکورہ فیصلے میں سامنے آیا ہے۔ پھر اس ایکٹ میں مسلم خواتین کے لئے عملی انصاف کی گنجائش کم رکھی گئی ہے۔ مطلقہ خواتین سے یہ تو ضرور کہا گیا ہے کہ عدت کے بعد سابق شوہر سے وہ نان نفقہ طلب نہیں کرسکتی اور یہ بات صحیح بھی ہے کہ شرعی نقطہ نظر سے سابق شوہر مطلقہ عورت کے لئے ایک اجنبی مرد ہوجاتا ہے۔ البتہ موجودہ مسلم معاشرے میں جہاں کسی اسلامی ریاست اور اخلاقی نظام کی عدم موجودگی میں بے شعور اور خوف خدا سے خالی مسلمان مرد، عورتوں پر ظلم روا رکھے ہوئے ہیں اور جہاں ایک

مطلقہ عورت کے لئے دوبارہ اس کی شادی ہونا آسان نہیں، اس قانون میں بے بس عورت کے سہارے کی گنجائش بہت کم ہے۔ اس قانون کے مطابق وقف بورڈ پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہے کہ وہ مطلقہ بے سہارا عورتوں کی کفالت کا انتظام کرے۔ جو لوگ اس ملک میں اوقاف کی موجودہ صورت حال سے واقف ہیں، انہیں خوب معلوم ہے کہ عام طور پر وقف بورڈ کو اپنے ملازمین کی تنخواہ کے لئے پیسے نہیں جٹ پاتے پھر بھلا وہ کسی بے سہارا عورت کو کیا سہارا دے گا۔ وقف کا موجودہ نظام ملک بھر میں انتہائی تباہ حال ہے۔ اس کی آمدنی انتہائی قلیل ہے اور جہاں تھوڑی بہت ہے بھی تو وہ منتظمین کی دست برد سے محفوظ نہیں۔ پھر ایک ایسے تباہ حال ادارے کے سر بے سہارا عورتوں کو ڈالنا کیا معنی رکھتا ہے۔ مطلقہ مسلم خواتین کو وقف بورڈ کا راستہ دکھاکر ہم کس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں؟ ایک ایسا بے جان قانون پاس کرا کے جس کے نتیجے میں انصاف قائم نہ ہو ہم نے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ ہم نے شریعت، اس کے تحفظ اور تحفظ کی ترکیبوں کے سلسلے میں دنیا کے سامنے مضحکہ خیز نمونے پیش کئے ہیں۔

دیکھا جائے تو شریعت (جس سے بالعموم پرسنل لاء مراد لیا جاتا ہے) کے تحفظ کا جو نعرہ منقسم ہندوستان کے ابتدائی دنوں میں لگایا گیا تھا، آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ہم وہی نعرہ اتنی ہی بے شعوری کے ساتھ بلند کر رہے ہیں۔ اس شعور سے یکسر خالی کہ شریعت ہے کیا اور اس کے نفاذ کا کام اس ملک میں کیسے انجام پاسکتا ہے؟ مسلمانوں نے اس ملک میں سب سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ شریعت کے تحفظ کی تحریک چلائی اور اس تحریک کو سب سے بڑی کامیابی شاہ بانو کیس میں ملی ہے۔ لیکن اس معرکۃ الآراء کامیابی کا حال یہ ہے کہ اس سے نظام عدل کے قائم ہونے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ یقیناً حاملین تحریک کو کسی حد تک یہ اندازہ تھا کہ اس طرح کی جزوی کاروائی مسلم معاشرے کو دوبارہ اپنی اصل بنیادوں پر قائم نہیں کر سکتی۔ اس لئے اصلاح معاشرہ کے نام سے کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور ملک کے طول و عرض میں بڑے بڑے جلسے منعقد ہوئے، شرعی عدالتوں کے قیام کی بات بھی سامنے آئی لیکن جلد ہی ایسا محسوس ہوا کہ یہ ساری جدوجہد امت بیمار کا اصل علاج کرنے کے بجائے مریض کے چہرے پر رنگ و روغن ملنے کی مصنوعی کوشش ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام میں نہ تو مسلم معاشرہ پروان چڑھ سکتا ہے اور نہ ہی مسلم اخلاق و اطوار کو بھرپور نشوونما حاصل ہو سکتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس

ملک میں شریعت کے تحفظ کے لئے بے جان قوانین بنوانے کے بجائے شریعت کے نفاذ کے لئے تیاری کی جاتی کہ اگر ایسا ہوتا تو کم از کم یہ تاثر تو اس ملک میں یقیناً عام ہوگیا ہوتا کہ اسلام کے پاس ایک مکمل انسانی زندگی کے لئے رہنما اصول موجود ہیں، جن کی بنیاد پر ایک عادلانہ معاشرے کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بے سہارا مسلم خواتین کو زوال زدہ اور قلاش وقف بورڈ کا راستہ دکھانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جو لوگ اس ملک میں گزشتہ پچاس برسوں کے دوران شریعت کے تحفظ کی تحریک چلاتے رہے ہیں ان کی نظر میں شریعت سے مراد صرف عائلی قوانین، نکاح، وراثت اور طلاق کے مسائل ہیں۔ رہے زندگی کے دوسرے شعبے تو یا تو یہ حضرات اسے شریعت سے آزاد سمجھتے ہیں یا ان کے اندر اتنا حوصلہ نہیں کہ پوری زندگی شریعت کی اتباع میں گزارنے کا کوئی منصوبہ بنائیں۔ خوف کا عالم یہ ہے کہ جب شرعی عدالتوں کے قیام کی بات پر قومی پریس نے واویلا مچایا کہ مسلمان ملک میں متوازی عدالتیں قائم کر رہے ہیں تو حاملین شریعت کی طرف سے انتہائی ملتجیانہ اور مدافعانہ انداز سے یہ کہا گیا کہ چونکہ ملک کی عدالتوں میں بڑے پیمانے پر مقدمات التواء میں پڑے ہیں اس لئے ان عدالتوں میں مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مقدمات فیصل کرانے سے دراصل حکومت کی عدالتوں پر کام کا دباؤ کم ہوجائے گا۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کے پاس قضا کا ایک بہتر نظام موجود ہے تو مدافعت کی جنگ لڑنے والوں کو یہ کہنے کا یارانہ تھا۔ پھر شرعی عدالتوں کی کارگزاری نے بھی بہت جلد یہ بات واضح کردی کہ جن عدالتوں کے پاس قوت نافذہ نہ ہو ان کی حیثیت طفل تسلی سے زیادہ نہیں۔ یہ نکتہ ہماری نگاہوں سے اوجھل رہا کہ اسلامی نظام قضا اسلام کے سیاسی نظام کے اندر ہی مؤثر ہوسکتا ہے اور یہ کہ شریعت کی برکات سے اسی وقت ہم پوری طرح فیضیاب ہوسکتے ہیں جب اسے پوری زندگی میں برتنے کا سامان فراہم کیا جائے۔ پچاس سالہ سفر کے بعد تحفظ شریعت کی مہم کا حاصل یہ ہے کہ آئے دن چھوٹے چھوٹے مقدمات میں عدالتوں کی نکتہ آفرینیاں ہماری ساری سابقہ جدوجہد پر پانی پھیر دیتی ہے۔ مسلمانوں کو دستور کے رہنما اصول دفعہ ۴۴ سے مستثنیٰ کردینے کا معاملہ آج بھی محض ایک مطالبہ ہے۔ 125 CrPc کا ان کے اوپر اطلاق نہ ہونے دینے کا مطالبہ بھی بدستور برقرار ہے۔ تب سے اب تک ملک کا ہر وزیر اعظم یہ وعدہ کرتا رہا ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لاء میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ لیکن عدالت کے وقتاً فوقتاً فیصلوں نے مسلمانوں کو پرسنل لاء کے تحفظ کے لئے بڑی بڑی تحریکیں چلانے پر مجبور کیا ہے۔

کہنے کو اس ملک میں شریعت کے تحفظ کے لئے مسلم پرسنل لاء بورڈ کا مؤقرادارہ موجود ہے اور اس ملک میں پچاس سالوں سے پرسنل لاء کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی تحریک بھی چل رہی ہے، پھر مسلمانوں کی طرف سے عائلی قوانین کا ایک بہتر مسودہ پیش کئے جانے کا وعدہ بھی برقرار ہے۔ لیکن اس ساری چلت پھرت کے باوجود عائلی قوانین میں عدالت کی موشگافیاں جاری ہیں اور پچاس سال گزرنے کے باوجود مسلمان پرسنل لاء کا ایک بہتر مسودہ پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ یہ ہے تحفظ شریعت کے محاذ پر ہماری پیش رفت کا حال۔ یعنی ۱۹۴۷ء میں ہم جہاں تھے وہیں آج بھی کھڑے ہیں، البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ شریعت کے نام سے آج عام مسلم ذہنوں میں جو تصور ابھرتا ہے وہ صرف مسلم پرسنل لاء کا۔ مسلمانوں کا سواداعظم یہ سمجھنے لگا ہے کہ شریعت صرف پرسنل لاء تک محدود ہے بقیہ زندگی میں وہ جو چاہیں کریں۔

صورت حال انتہائی سنگین ہے۔ بے انصافی کی ماری بے شمار مسلم خواتین وقف بورڈ کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے طوائف خانوں کی طرف رخ کررہی ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے ایک سروے کے مطابق بہار، یوپی، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش میں جسم فروشی کا دھندہ کرنے والی خواتین میں مسلم خواتین کی شرکت بڑھ رہی ہے۔ اور ان میں سے بیشتر وہ خواتین ہیں جو مسلم سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں، جنھیں شوہروں نے طلاق کے بعد دھکے دے کر گھروں سے نکال دیا ہے۔ زندہ رہنے کے لئے اس پیشے میں انہیں امید نظر آئی ہے۔ ابھی گزشتہ دنوں کوزی کوڈے سے ایک خبر آئی ہے کہ وہاں مطلقہ مسلم خواتین نے "نساء" کے نام سے ایک انجمن بنائی ہے۔ ان خواتین کا کہنا ہے کہ دین اور شریعت کے حوالے سے مسلم خواتین پر ظلم کیا جارہا ہے۔ چونکہ ملک میں کوئی اسلامی نظام قضا یا اسلامی ریاست نہیں ہے اس لئے طلاق کا دھڑلے سے استعمال کرنے والے مردوں کے خلاف وہ اپنا مقدمہ داخل نہیں کرسکتیں۔

"نساء" جیسی بے شمار انجمنیں اہل فکر مسلمانوں کو دعوت دے رہی ہیں کہ اس ملک میں تحفظ شریعت کی مہم سے کنارہ کش ہوکر نفاذ شریعت کی مہم کا حوصلہ پیدا کریں کہ شریعت کا تحفظ یوں بھی ایک غیر اسلامی خیال ہے۔ اللہ کی شریعت تحفظ کے لئے نہیں بلکہ نفاذ کے لئے اتاری گئی ہے۔ مستقبل اسی رویے کے ساتھ وابستہ ہے۔

سرکاری ملازمتوں میں مسلمان

کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟

ہندوستان جہاں مسلمان کوئی ہزار سال تک ملک کے سیاہ و سفید کے مالک رہے ہیں، دہلی اور آگرہ کی عمارتیں زبان حال سے کہتی ہیں کہ یہ سب کچھ بہت زیادہ پرانا واقعہ نہیں ہے۔ اسی ہندوستان میں اب صورت حال یہ ہے کہ نئے نظام کے اندر اعلیٰ عہدوں پر ڈھونڈنے سے بھی کوئی مسلمان نہیں ملتا۔ گزشتہ پچاس برسوں میں سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں پر مسلمانوں کی تعداد مسلسل روبہ زوال رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "آزادی" کے بعد حکومت ہند نے بعض ایسے خصوصی خفیہ سرکلر جاری کیے جس کے نتیجے میں اہم حساس عہدوں پر مسلمانوں کا تقرر روک دیا گیا۔ یہ سرکلر چونکہ خفیہ نوعیت کے تھے اس لئے اس پر عوامی حلقوں میں کوئی کھلی بحث نہ ہو سکی۔ البتہ وہ مسلمان جو ان ہدایات کی زد میں براہ راست آگئے تھے انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنی اس محرومی کا تذکرہ کیا ہے۔ کوئی دو سال پہلے مغربی بنگال کے ایک آئی اے ایس آفیسر ایس ایم مرشد نے ٹائمز آف انڈیا کی بعض اشاعتوں میں اس راز سے پردہ اٹھایا تھا کہ کس طرح حکومت کی مسلم دشمن پالیسی کے نتیجے میں ان کی نسل کے بہت سے سرکاری ملازموں کو مطلوبہ ترقیوں سے محروم ہونا پڑا۔ کچھ اسی قسم کے احساسات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر سید ہاشم علی نے اپنے قیام علی گڑھ کے دوران کیا تھا۔ سید ہاشم کا کہنا تھا کہ پٹیل نے اپنے دور وزارت میں مسلمانوں کو حساس عہدوں پر مقرر نہ کئے جانے کا جو خفیہ حکم جاری کیا تھا وہ خود اس کی زد میں آگئے تھے۔ البتہ چوں کہ اس طرح کی پالیسی امور سے متعلق فیصلے حکومت کی خفیہ دستاویزات کا حصہ بنے رہے اس لئے اس بارے میں عوامی حلقوں کو کوئی تفصیلی معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ البتہ گاہے بہ گاہے اس طرح کی باتوں کے منظر عام پر آنے سے اس خیال کو تقویت ملی کہ نہ جانے اس طرح کے کتنے فیصلے

حکومت کی خفیہ فائلوں میں محفوظ ہیں، جن کے اثرات کا نتیجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک وزارت دفاع میں کسی اہم عہدے پر تو درکنار معمولی ملازمتوں میں بھی مسلمانوں کو داخلہ نہیں مل سکا ہے۔ مسلمانوں کے تئیں حکومت ہند کے جانبدارانہ رویے کے لئے صرف یہی ایک مثال کافی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں سے ساؤتھ بلاک کی عمارت مسلمانوں کے وجود سے خالی ہے؟

سرکاری ملازمتوں سے مسلمانوں کو محروم کرنے کا رجحان تب ہی شروع ہو چکا تھا جب ملک کے مختلف حصوں میں آزادی سے کچھ پہلے کانگریسی حکومتیں وجود میں آگئی تھیں۔ تب سے اب تک اس رجحان نے ایک کلیے کی حیثیت حاصل کرلی ہے اور اب پچاس سالوں کے بعد اس مسلم دشمن پالیسی کے نتیجے میں جو چیز سامنے آرہی ہے وہ یہ ہے کہ آپ حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے متعلق ڈائرکٹری کے صفحات کے صفحات الٹ جائیے مگر کوئی مسلم نام ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ حالانکہ ۱۹۳۹ء میں جب کانگریسی حکومتوں کی مسلم دشمن پالیسیوں پر مسلم لیگ نے شور مچایا تھا تب بھی مسلمان آج کے مقابلے میں بدرجہا بہتر تھے۔ ۱۹۳۹ میں یوپی میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۴ فیصد تھا جو کم و بیش آج بھی وہی ہے تب پنڈت گووند ولبھ پنت جو اس وقت یوپی کے وزیر اعظم تھے، نے سرکاری ملازمتوں سے متعلق اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کی تعداد کچھ اس طرح بتائی تھی۔

آزادی سے قبل سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب

مناصب	ہندو	مسلمان
صوبائی ایگزیکیٹیو ملازمت	52.5	39.6
تحصیل دار	54.9	43.6
نائب تحصیل دار	55.9	41.4
صوبائی جوڈیشیل ملازمت	72.0	25.0
ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس	56.0	28.0
پولیس انسپکٹر	54.2	43.8
ہیڈ کانسٹبل	35.3	64.4
یوپی ایگریکلچرس سروس کلاس ون	64.0	21.0

مناصب	ہندو	مسلمان
ایگریکلچرس سروس کلاس ٹو	76.0	12.0
سب آرڈینیٹ ایگریکلچرل سروس	73.0	25.0
ویٹریزی انسپکٹر	24.0	52.0
ویٹریزی اسسٹنٹ سرجنس	35.0	58.0
گزیٹڈ آفیسر کوآپریٹیو ڈپارٹمنٹ	62.0	37.5
یوپی فارسٹ سروس	57.0	19.0
فارسٹ رینجرس	80.5	18.5
ڈپٹی رینجرس	74.4	25.0
اسسٹنٹ ایکسائز کمشنر	57.0	14.0
ایکسائز انسپکٹر	55.0	31.0
یوپی ایجوکیشن سروس کلاس ون آفیسر	15.0	4.0

اب اس صورت حال کا مقابلہ ۱۹۸۱ء میں سرکاری ملازمتوں میں مسلم نمائندگی سے کیجیے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

سرکاری ملازمتوں میں مسلمان
(۱۹۸۱ء)

ملازمت	مجموعی تعداد	مسلمان	مسلم تناسب
آئی اے ایس ۱۹۸۱ء میں	3,883	116	2.99
آئی پی ایس ۱۹۸۱ء میں	1,753	50	2.85
انکم ٹیکس ۸۱-۱۹۷۱ء کے دوران	881	27	3.06
ریلوے ٹریفک اور اکاونٹ	415	11	2.65
بینک	1,13,77275,951	2,479	2.18
مرکزی حکومتوں کے دفاتر میں	8,26,669	3,346	4.41
صوبائی حکومتوں کے دفاتر میں		49,718	6.01

نمونے کے لئے ہم نے دو عہد کی ایک اجمالی تصویر آپ کے سامنے پیش کی ہے تاکہ آپ خود اس بات کا اندازہ لگاسکیں کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

چونکہ اس مسئلے پر باقاعدہ اعداد و شمار حکومت فراہم نہیں کرتی اور نہ ہی مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ اتنے بڑے ملک میں چھوٹے سے بڑے ہر عہدے پر اپنی نمائندگی کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اس لئے صورت حال کا کسی قدر صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ مختلف مواقع پر حاصل Sample سروے سے کام چلائیں۔ اس وقت ہمارے سامنے تعلقدار کمیشن ۱۹۷۱ء کی رپورٹ کھلی ہے جس میں مغربی بنگال کیڈر کے ۲۶۴ آئی اے ایس افسران میں صرف دو مسلمان دکھائی دیتے ہیں۔ گوپال سنگھ رپورٹ کے مطابق مسلم آبادی والی تین اہم ریاستوں آسام، بہار اور مغربی بنگال میں ایک بھی کلاس ون آفیسر مسلمان نہیں ہے۔ مجموعی طور پر ۲۲۳۲ کلاس ون آفیسروں میں صرف ۳۶ مسلمان ہیں جن میں ۲۲ کا تعلق کیرالہ سے ہے۔ کچھ اسی طرح کی انتہائی مایوس کن صورت حال دوسری چھوٹی بڑی ملازمتوں کی بھی ہے۔ سرکاری ملازمتوں سے متعلق ہم جس رپورٹ کے صفحات بھی پلٹتے ہیں ہماری مایوسی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ سرکاری بینکوں سے متعلق ایک رپورٹ ہمارے سامنے ہے جس میں ہم نے مسلمانوں کے نام تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح لائف انشورنس کارپوریشن کی ایک سالانہ رپورٹ ۸۲ ۔ ۱۹۸۱ء میں ۲۶۵ اسامیوں پر بڑی مشکل سے صرف چار مسلم ناموں کا سراغ لگ پایا ہے۔ سخت مایوس ہوکر اب ہم نے مرکزی حکومت کے کلیدی دفاتر کا رخ کیا ہے اس امید میں کہ شاید مرکز سے قربت اور سیکولر سیاست دانوں کی براہ راست نگہداشت کی وجہ سے دلی کے اہم سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کا وجود محسوس ہو لیکن یہاں بھی ناظر کے حصے میں مایوسی کے علاوہ اور کچھ نہیں آیا۔ وزیر اعظم کا دفتر ہو یا دوسرے اہم اداروں کے دفاتر یہاں بھی سکریٹری، ایڈیشنل سکریٹری حتیٰ کہ جوائنٹ سکریٹری کی سطح پر بھی مسلمانوں کا سراغ نہیں ملتا۔ کہیں کہیں جا بہ جا اگر ایک آدھ نام نظر بھی آتا ہے تو اس لمبی چوڑی فہرست میں اس کی حیثیت علامتی بھی نہیں کہی جاسکتی۔

۱۹۸۰ء میں حکومت ہند نے ایک اعلیٰ اختیاراتی پینل تشکیل دیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ اقلیات کے سلسلے میں یہ معلومات فراہم کرے کہ سرکاری ملازمتوں میں انہیں کتنا حصہ مل رہا ہے۔ اس پینل نے صورت حال کا پتہ لگانے کے لئے Sample سروے کا طریقہ اختیار کیا۔ اگست ۱۹۹۰ء میں

پارلیمنٹ میں پینل کی رپورٹ پیش کردی گئی جس میں اقلیات کے سلسلے میں مختلف تجاویز اور مشورے تھے۔ اس رپورٹ میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ اقلیات کی خصوصی کوچنگ کا انتظام کرنے کا مشورہ بھی تھا۔ گزشتہ دنوں جب حکومت نے مسلمانوں کو تعلیمی طور پر ایک پس ماندہ قوم قرار دیا تب یہ تاثر بھی عام ہوتا گیا کہ اگر مسلمان ملازمتوں میں اپنے تناسب سے بہت پیچھے ہیں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں تعلیم یافتہ لوگوں کا فقدان ہے۔ پھر حکومت کی وقتاً فوقتاً جاری ہونے والی کاغذی اسکیموں سے بھی اس تاثر کو تقویت پہنچی کہ حکومت تو اس سلسلے میں مخلص ہے کہ مسلمانوں کو ملازمتوں میں جائز حصہ دیا جائے، البتہ خود مسلمان اس طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ اس تاثر سے تحریک پاکر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد صاحب نے مسلمان نوجوانوں کو آئی اے ایس کے امتحانات میں بیٹھنے کی ترغیب دی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر منصوبہ بند طریقے سے مسلم نوجوانوں کو ان مقابلہ جاتی امتحانات میں بیٹھنے کی ترغیب دی جائے گی تو جلد ہی اس کے بہتر نتائج سامنے آجائیں گے۔ موصوف نے یونیورسٹی کے وسائل اور اپنی ذاتی لیاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر ممکن کوشش کرڈالی، طلباء کو سہولتیں فراہم کی گئیں، رہنمائی کے انتظامات کئے گئے لیکن دس بارہ سال کی زبردست جدوجہد کے باوجود آئی اے ایس میں مسلم نوجوانوں کا تناسب وہی مقررہ دو ڈھائی فیصد رہا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اب ان نوجوانوں میں بیشتر وہ لوگ تھے جو حامد صاحب کی کوچنگ اور رہنمائی سے مستفید ہورہے تھے۔ رہی مسلمانوں کے تناسب گھٹنے یا بڑھنے کی بات تو اس میں کوئی واضح فرق واقع نہ ہوسکا۔ اس تجربے سے کچھ اور ثابت ہوا ہو یا نہیں، اتنا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ ان سرکاری عہدوں پر تقرر کا فیصلہ مقابلہ جاتی امتحانات نہیں بلکہ پالیسی ساز کرتے ہیں۔ اب اگر حکومت کے پالیسی ساز مسلمانوں کے تناسب کو ایک خاص سطح تک برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو کوئی تعلیمی تحریک اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ سیاسی سازشوں کا توڑ تو سیاسی عمل کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے۔

نظام جبر نے مسلمانوں کی ایک مجہول نسل کو جنم دیا ہے

سیکولر، پروگریسیو اور معتدل مسلمانوں کی کہانی

ہندوستان میں مسلمانوں کی نسل کشی ایک ٹھہرا ٹھہرا دھیما دھیما نا محسوس عمل ہے۔ یہاں بوسنیا جیسی شدت نہیں جس پر پوری دنیا چیخ اٹھے اور ہر خاص و عام مسلمان کو یہ محسوس ہونے لگے کہ اس کی ملی زندگی اب محفوظ نہیں رہ گئی ہے، بلکہ یہاں مسلمانوں سے ان کا نظریاتی سرمایہ، انبیائی حوصلہ اور آخری رسول ؐ کی امت ہونے کا احساس رفتہ رفتہ سلب کیا جاتا رہا ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں سے اس عمل کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے اندر مختلف مجہول نسلوں کی نشوونما دیکھی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ابتدائی دنوں میں ایک ایسی نسل پیدا ہوئی جو خواہ مخواہ پاکستان بنانے کے احساس جرم میں مبتلا تھی۔ زندگی جینے کے لئے ان حضرات کو فدویانہ اور خوشامدانہ رویہ اختیار کرنا پڑا۔ پھر ان کے درمیان پرورش پانے والی نسبتاً نئی قیادت نے سیکولر آرڈر کے قیام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ علماء ہوں یا دانشور اب یہ تمام حضرات حکومت وقت سے التجا و فریاد میں سیکولرزم اور جمہوریت کے تقدس کی دہائی دیتے تھے۔ رہے وہ لوگ جو براہ راست حکومت کی مشنری سے فیضیاب ہو رہے تھے تو ان بے چاروں کو بار بار دستور، جمہوریت اور ملک کے تئیں اپنی وفاداری کا اعادہ کرنا ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے فدویانہ رویے کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ڈاکٹر ذاکر حسین کانگریس کی طرف سے صدر جمہوریہ کے امیدوار تھے اور اس موقع پر جن سنگھی پریس نے انہیں رجعت پسند ثابت کرنے کے لئے مسلم پرسنل لاء کا حامی بتایا تو ذاکر صاحب کو انتہائی مدافعانہ انداز میں اپنی صفائی دیتے ہوئے کہنا پڑا کہ میں نے حکومت ہند سے صرف یہ کہا تھا کہ پرسنل لاء میں مداخلت سے ہندوستان کے دشمنوں کو موقع مل جائے گا کہ وہ مسلم ممالک میں ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈہ کریں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ پہلے خود مسلمانوں کے اندر سے یہ مطالبہ

اٹھنا چاہئے کہ پرسنل لاء میں تبدیلی ہو" (بحوالہ الفرقان، مئی ۱۹۶۷ء)

اسی طرح مولانا اسعد مدنی نے مسلم مجلس مشاورت سے صرف اس لئے علیٰحدگی اختیار کرلی کہ مجلس نے ہندو پاک جنگ کے نازک موقع پر اپنا کوئی اجلاس طلب نہیں کیا۔ مولانا اسعد مدنی نے مشاورت کے بانی صدر سید محمود کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا کہ "ہندو پاک جنگ کے دوران آپ نے ذاتی طور پر اپنی خدمات محاذ جنگ کے لئے پیش فرمائیں، مگر مجھے تعجب ہے کہ اس سلسلے میں مسلم مجلس مشاورت نے معمولی توجہ دینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی" (بحوالہ الجمعیۃ ۲۴/اکتوبر ۱۹۶۰ء) کچھ اسی قسم کی صورت حال اس وقت پیش آئی جب انہدام کے نتیجے میں ممبئی میں ہونے والے دھماکوں کے بعد مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تین اہم اراکین کے دستخط سے روزنامہ انقلاب میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں یہ بتایا گیا کہ مسلمان اس ملک کے دستور میں پورا یقین رکھتے ہیں اور ان تینوں حضرات نے گویا ملک کے ساتھ اپنی وفاداری کی تجدید کا عہد کیا تھا۔

اس نظام کے اندر مسلمانوں کا سا نام رکھنے والا جو شخص بھی کسی اہم عہدے پر نظر آتا ہے سمجھ لیجئے کہ اس نے اس کی اتنی ہی بڑی قیمت ادا کی ہے۔ جو بات سب سے زیادہ تشویش ناک ہے وہ یہ کہ اس نظام نے مسلمانوں کی ایک ایسی مجہول نسل کو جنم دیا ہے جو اپنے اسلامی ورثے پر شرمندہ ہے۔ چنانچہ آئے دن اس قسم کے بیانات آتے رہتے ہیں جس میں ایک مسلمان امت کی شناخت پر دوسری مجہول شناخت کو مقدم گردانتا ہے۔ چنانچہ سیاست ہو یا سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدوں پر نظر آنے والے اکادکا مسلمان، وزراء ہوں یا گورنران کے فعل کو تو چھوڑیئے کہ دلوں کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔ البتہ ان کے قول ہی اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ ان مسلم نما لوگوں کی نسل اپنا تعلق آخری رسولؐ کی امت سے بتانے میں شرم محسوس کرتی ہے۔ عبدالکریم چھاگلہ نے تو صاف طور پر فخریہ اعلان کیا تھا کہ "میری رگوں میں ہندو خون دوڑ رہا ہے" اور معروف آرٹسٹ ایم ایف حسین برملا اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ "میں ہمیشہ سے اسلام کے مقابلے میں ہندوازم سے زیادہ قریب رہا ہوں۔" (بحوالہ السٹریٹڈ ویکلی۔ ۴/دسمبر ۱۹۸۳ء) یہاں تک کہ جن لوگوں کو ملی سیاست کے حوالے سے مسلمانوں میں کسی زمانے میں اعتبار حاصل رہا ہے ان بے چاروں کا بھی حال یہ ہے کہ انہیں اپنے سیاسی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً ایسے بیانات دینے پڑے ہیں جس سے ان کی اسلامی شناخت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ بابری مسجد کو

آرڈینیشن کمیٹی (مرحوم) کے صدر سید شہاب الدین کو جب قومی اخبارات نے جناح ثانی لکھنا شروع کیا تو انہوں نے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ جناح ثانی بننے کے بجائے نہرو ثانی بننا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے اگر کسی مسلم قائد کے لئے نہرو آئیڈیل کی حیثیت سے سامنے آتا ہے تو یہ ایک انتہائی تشویشناک بات ہے۔ انصاف پارٹی کے تجربے کی ناکامی کے بعد جب بڑی سیاسی پارٹیوں نے سید شہاب الدین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اپنے سیکولر کردار کو نکھارنے کے لئے سید صاحب کو اسلامی انتہاپسندوں کے خلاف کئی مضامین لکھنے پڑے۔

نظام جبر کا دباؤ اتنا سخت ہے کہ آپ اپنی صحیح مسلم شناخت کے ساتھ اس نظام کے اندر اپنی جگہ نہیں بنا سکتے، حتیٰ کہ ملی قائدین بھی جب جب مختلف وزراء اعظم کے پاس مسلمانوں کا مقدمہ لے کر گئے ان کی گفتگو میں فدویانہ، ملتجیانہ اور خوشامدانہ لب و لہجہ غالب رہا۔ مسلمانوں کی ملی زندگی ہو یا سیاسی سرگرمی، مناصب کے حصول کی کوشش ہو یا مراعات طلبی کی التجاء، یہ سب کے سب حاکم وقت کی مکمل نگاہ التفات کے محتاج رہے۔ مسلمانوں کے اندرون میں ان کی اصل ملی اسلامی شخصیت نے دم توڑ دیا، لہٰذا وہ دل دوز مناظر دیکھنے میں آئے جب بہار کے سابق گورنر اخلاق الرحمان قدوائی بھگوان کے مجسمہ کے آگے آداب بجالانے میں مصروف دکھائی دئے۔ اخبارات میں یہ تصویر چھپی، گورنر موصوف کو اس پر شرمندگی کیا ہوتی عام مسلمانوں میں بھی کوئی اضطراب پیدا نہ ہو سکا۔ کچھ اسی قسم کا سنگین جرم سابق ریلوے وزیر شری جعفر شریف نے بر سرِ عام انجام دیا۔ ان کے ہندو مندر میں جانے اور وہاں گل پوشی کرنے کی خبر بھی اخبارات کی زینت بنی، لیکن ان کا اسلام جوں کا توں برقرار رہا۔ ابھی حال ہی میں مسلم وزیر داخلہ جب حج کے بعد دہلی کے اندرا گاندھی ہوائی اڈے پر اترے تو ان کی باقاعدہ آرتی اتاری گئی۔ اخبارات میں یہ تصویر بھی شائع ہوئی لیکن علماء کی طرف سے اس قسم کے اعلانیہ مشرکانہ فعل کی کوئی مذمت نہ ہوئی۔ حد تو یہ کہ تامل ناڈو میں ایک مسلم وزیر اس وقت کی وزیر اعلیٰ جے للتا کو باقاعدہ سجدہ کرتے ہوئے دیکھے گئے، لیکن اسلام اور مسلمانوں کی تذلیل کے اس منظر کو بھی مسلمانوں نے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا۔ اس قسم کے واقعات نے عام مسلمانوں میں دین کی وقعت ختم کر دی ہے۔ دین کے تئیں ہم اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ معمولی معمولی مراعات کے لئے اعلانیہ کفر اور شرک کا ارتکاب کرنا ہمارے معمول کا حصہ بن گیا ہے۔ جب کسی امت سے باحوصلہ لوگوں کی نسل ختم ہو جائے، سخت حالات میں اعلائے کلمۃ اللہ کی صدا بلند

کرنے والی زبانیں خاموش ہو جائیں اور معمولی فائدوں کے لئے دین وایمان بیچ دینا مقبول عام رویہ قرار پائے تو سمجھ لیناچاہئے کہ نظری طور پر وہ امت زندگی کی آخری سانس لے رہی ہے۔

۱۹۸۶ء میں جب ملک کے طول و عرض میں ہندوستانی مسلمان شریعت کے حوالے سے اپنی ملی زندگی کی سب سے بڑی تحریک چلا رہے تھے اور جب پوری امت اس بات پر متفق تھی کہ پرسنل لاء کی تفہیم و تشریح کا حق کسی غیر اسلامی عدالت کو نہیں دیا جاسکتا اور اس وقت شاہ بانو قضیئے نے حکومت اور مسلمانوں کے مابین ایک فیصلہ کن معرکہ برپا کر رکھا تھا۔ عین اسی لمحے مجہول مسلمانوں کی پروگریسو نسل نے حکومت کے نام یہ اپیل جاری کی کہ 125CrPc سے مسلمانوں کو مستثنیٰ نہ کیا جائے۔ یعنی جس وقت پوری امت ایک مسئلے پر مجتمع تھی عین اسی نازک لمحے پروگریسو مسلمانوں نے امت کے خلاف ایک منشور جاری کر دیا۔ اس فہرست میں وہ سارے نام شامل ہیں جو اس نظام سے فوائد کشید کرنے میں آگے آگے رہے ہیں، آپ کی دلچسپی کی خاطر اور ریکارڈ درست رکھنے کے لئے ہم وہ فہرست جوں کی توں شائع کئے دے رہے ہیں تاکہ امت کے اصحاب فکر نظام جبر کی پیدا کردہ اس مجہول نسل کے سلسلے میں بھی کوئی موقف اختیار کر سکیں۔

ملاحظہ کیجئے مجہول مسلمانوں کی یہ فہرست

پروگریسو مسلمانوں کی اپیل

ہم دستخط کنندگان مطالبہ کرتے ہیں کہ

(۱) دفعہ 125CrPc میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔

(۲) مطلقہ مسلم خواتین کا یہ حق کہ وہ اپنے سابق شوہروں سے نان و نفقہ وصول کر سکیں، برقرار رکھا جائے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ :

(۱) مطلقہ عورتوں کے سلسلے میں مرد کو نان ونفقہ کی ذمہ داری سے بری کر دینا دراصل CrPc کی دفعہ 125 کی روح سے متصادم ہے جس کا مقصد بے سہارا عورتوں کو تحفظ دینا ہے۔

(۲) حکومت اس بات کو یقینی بنائے کہ عورتوں کو دستور میں دیئے گئے حقوق محفوظ رہیں۔

(۱) خواجہ احمد عباس۔ فلم ساز اور رائٹر
(۲) شبانہ اعظمی۔ فلمی اداکارہ
(۳) جاوید اختر۔ فلم رائٹر
(۴) علی سردار جعفری۔ شاعر
(۵) سعید مرزا فلم ساز
(۶) ای۔ القاضی اسٹیج ڈائرکٹر
(۷) شہریار۔ شاعر
(۸) سلیم پیرادینا۔ شاعر
(۹) مظفر علی۔ فلم ساز
(۱۰) فیصل القاضی۔ تھیٹر ڈائرکٹر
(۱۱) امل الانہ۔ تھیٹر ڈائرکٹر
(۱۲) شوکت کیفی۔ فلم اداکارہ
(۱۳) وی ایم عدیل۔ فلم رائٹر
(۱۴) سلیم علی ارینتھولوجسٹ۔ ایم پی
(۱۵) مونس رضا وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی
(۱۶) عذرا قدوائی۔ لکچرر دہلی یونیورسٹی
(۱۷) سکینہ حسن۔ ریٹائرڈ ریڈر دہلی یونیورسٹی
(۱۸) سید زیدی ریڈر دہلی یونیورسٹی
(۱۹) صہبا حسین۔ آئی پی کالج دہلی یونیورسٹی
(۲۰) معصوم علی۔ لکچرر دہلی یونیورسٹی
(۲۱) عابد حسین۔ ممبر پلاننگ کمیشن
(۲۲) عبید صدیقی۔ سائنس داں
(۲۳) ظہور قاسم۔ سائنس داں
(۲۴) اے رحمان۔ سائنٹسٹ
(۲۵) بشیر الدین احمد۔ سوشل سائنٹسٹ
(۲۶) علی باقر۔ سوشل سائنٹسٹ
(۲۷) رئیس احمد۔ ماہر تعلیم
(۲۸) رشید الدین خان۔ پروفیسر جے این یو
(۲۹) نجمہ ظہیر باقر۔ پروفیسر جے این یو
(۳۰) ضویا حسن ریڈر جے این یو
(۳۱) عمرانہ قدیر ریڈر جے این یو
(۳۲) اعجاز الدین احمد پروفیسر جے این یو
(۳۳) عطیہ حبیب ریڈر جے این یو
(۳۴) ایم ایس آگوانی پروفیسر جے این یو
(۳۵) عرفان حبیب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۳۶) مقبول احمد پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۳۷) زاہدہ زیدی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۳۸) ساجدہ زیدی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۳۹) اقتدار عالم خان پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۴۰) اسلم قدیر پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۴۱) عابدہ سمیع الدین ریڈر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۴۲) شاد بانو احمد پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۴۳) عمر حسن پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۴۴) سائرہ حبیب ریڈر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۴۵) کشور شبیر خان پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۴۶) میمونہ جعفری ریڈر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۴۷) فوزیہ مجیب ریڈر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۴۸) کیو۔ ایم عثمانی ریڈر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

(۴۹) فرحان مجیب ریڈر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۵۰) محمودالحق پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۵۱) عارف رضوی ریڈر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۵۲) بلقیس موسوی ریڈر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۵۳) شیریں موسوی ریڈر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۵۴) ایس حسین پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۵۵) مظفرعالم ریڈر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۵۶) ایم اے حلیم سابق اسپیکر مغربی بنگال اسمبلی
(۵۷) بدرالدین طیب جی آئی سی ایس ریٹائرڈ
(۵۸) اصغرعلی انجینئر مصنف
(۵۹) شفیق نقوی مصنف
(۶۰) نسیم حسن سوشل سائنٹسٹ
(۶۱) علی اشرف مصنف
(۶۲) سیدہ سیدین مصنف
(۶۳) رشید طالب جرنلسٹ
(۶۴) سعید نقوی جرنلسٹ
(۶۵) سیما مصطفیٰ جرنلسٹ
(۶۶) انور عظیم مصنف
(۶۷) انیس جنگ جرنلسٹ
(۶۸) حسن سرور جرنلسٹ
(۶۹) ضیاء الحسن جرنلسٹ
(۷۰) دانیال لطیفی ایڈوکیٹ
(۷۱) کاملہ طیب جی ایڈووکیٹ
(۷۲) غلام شیخ پینٹر
(۷۳) اے جے قدوائی ریٹائرڈ آئی اے ایس
(۷۴) سلمان حیدر آئی ایف ایس
(۷۵) محب الحسن پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ
(۷۶) مشیرالحسن پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ
(۷۷) صغریٰ مہدی ریڈر جامعہ ملیہ اسلامیہ
(۷۸) حبیب الرحمن قدوائی ریڈر جامعہ ملیہ اسلامیہ
(۷۹) آر اے خان لکچرر جامعہ ملیہ اسلامیہ
(۸۰) شمشاد حسین پینٹر
(۸۱) روشن القاضی ڈائرکٹر آرٹ گیلری
(۸۲) معین شاکر پروفیسر مراٹھواڑہ یونیورسٹی
(۸۳) جعفر ظہیر ریڈر ہماچل یونیورسٹی
(۸۴) جاوید عالم ریڈر ہماچل یونیورسٹی
(۸۵) سلیم طیب جی اڈیٹر کیو یوپی
(۸۶) حسن کٹی دستاویزی فلم ساز
(۸۷) مزمل حسین آرٹسٹ
(۸۸) فاطمہ الطالب ڈائرکٹر ایڈورٹائزنگ ایجنسی
(۸۹) سمیرا آغا پرسنل اکزیکٹیو
(۹۰) ذکیہ ظہیر سماجی کارکن
(۹۱) سعدیہ دہلوی ایڈیٹر شمع
(۹۲) طاہرہ حسن اے آئی آر براڈکاسٹر
(۹۳) ہندل طیب جی آئی اے ایس
(۹۴) صبا زیدی ٹی وی پروڈیوسر
(۹۵) شہلا حیدر گورنمنٹ آفیشیل
(۹۶) عسکری امام بزنس اکزیکٹیو

(۹۷) ایس اے قیوم ڈائرکٹر عرب کلچرل سینٹر
(۹۸) تسنیم عثمانی لائبریرین امریکن سینٹر
(۹۹) رفعت ظہیر سماجی کارکن
(۱۰۰) اسماء منظر سول سرونٹ

اس کے علاوہ ۱۷ مزید "ترقی پسند" اور "دانشور" افراد کے اسمائے گرامی اس فہرست میں شامل ہیں۔

(بحوالہ مسلم انڈیا، مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۵)

ہندوستانی مسلمانوں پر وندے ماترم کا عذاب

گذشتہ پچاس برسوں سے ہندوستانی مسلمان ایک اجنبی ثقافت کے نرغے میں ہیں۔ ان کے اردگرد جو دنیا وجود میں آئی ہے وہ ان کے اپنے ملی اسلامی مزاج سے اتنی مختلف ہے کہ انہیں ہر لمحہ ایک دل آزار اجنبی ماحول میں رہنے کا احساس ہوتا ہے۔ طرفہ یہ کہ قوم پرستی کے حوالے سے جو مظاہر سامنے آئے ہیں وہ ہر لمحہ اس ملک میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کی نفی کرتے ہیں۔

بنیادی طور پر ہندوستانی قومیت کا خمیر اسلام دشمنی سے تیار کیا گیا ہے اور قومیت کے حوالے سے ایک اجنبی جارح ہندو تہذیب کو کچھ اس انداز سے ہمارے اوپر مسلط کر دیا گیا ہے کہ اب اس کے انکار کی صورت میں مسلمانوں کو ملک دشمن اور قوم دشمن باور کرایا جانا انتہائی آسان ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک غیر اسلامی ثقافت کو قومی ثقافت کا نام دیا جائے اور پھر جو لوگ اس ثقافت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں انہیں ملک دشمن باور کرایا جائے۔ منقسم ہندوستان میں سرکاری اور نیم سرکاری شخصیات کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کو مسلسل ملک دشمن باور کرائے جانے کا پروپیگنڈہ اسی مہم کا ایک حصہ ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اب اس پروپیگنڈے کی تاب نہ لاکر مسلمانوں کے بعض حلقے رفتہ رفتہ قومی علامتوں کو اپنی ملی شناخت میں جذب کرتے جارہے ہیں تاکہ ان پر بنیاد پرستی اور ملک دشمنی کا الزام نہ لگ سکے۔ گزشتہ دنوں وندے ماترم کے قومی نغمے کو زندہ کرنے کی جو مہمیں چلائی گئیں اس کی مخالفت میں مسلم حلقوں میں وہ پہلے سا جوش و خروش اور غم و غصہ دیکھنے میں نہ آیا بلکہ بعض معروف مسلم لیڈران تو یہ بھی کہتے پائے گئے کہ ہمیں وندے ماترم کا نغمہ گانے میں کوئی قباحت نہیں البتہ ہمیں غصہ اس بات پر آتا ہے کہ بال ٹھاکرے زبردستی ہم سے یہ نغمہ سننا چاہتے ہیں۔ اب اگر باخبر مسلم حلقوں اور معروف مسلم قائدین کے درمیان وندے ماترم کے نغمے کو اعتبار مل جائے

تو سمجھ لیجئے کہ خطرے کی گھنٹی بجنے لگی ہے۔ نظری اعتبار سے اگر مشرکانہ عقائد اور کافرانہ خیالات ہماری ملی فکر کا حصہ بننے لگیں تو سمجھ لیجئے کہ غیر محسوس طریقے سے مسلمانوں کے ہندوکرن کا کام چل رہا ہے۔ ایک ایسے لمحے میں جب نظام جبر کے سخت دباؤ کے تحت ہماری ملی سیاسی قیادت ہر ناپسندیدہ مکروہ شے کو رفتہ رفتہ اعتبار عطا کرتی جارہی ہے، جب مدافعت کی جنگ میں ہمیں ہر لمحہ پسپائی کا احساس ہوتا ہو اور ایسا لگتا ہو گویا ایک اجنبی ثقافت ہمارے ملی وجود کو تحلیل کئے دیتی ہے تو کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ قومی اور ملی سرحدوں کے درمیان ایک خط تنسیخ کھینچ دی جائے تاکہ عام مسلمانوں کو یہ پتہ چل سکے کہ ایک اجنبی قومی دنیا کہاں سے شروع ہوتی ہے اور ہماری ملی اسلامی دنیا کی حدود کیا ہیں۔ پھر واضح انداز میں یہ بھی بتایا جائے کہ مختلف قومی علامتوں کے سلسلے میں اسلام ہمیں کیا ہدایت دیتا ہے اور یہ کہ ہندوستانی قومیت کا کون سا پہلو ہمیں گوارا ہو سکتا ہے اور کون سا حصہ یکسر مسترد کئے دینے کے قابل ہے۔

جن گن من کے قومی ترانے کے برعکس وندے ماترم کا قومی نغمہ انتہائی تنگ نظر، متعصب مشرکانہ اور کافرانہ خیالات سے عبارت ہے۔ نغمہ کا مرکزی خیال جس میں مادر وطن کی پرستش کی مختلف اسالیب میں تبلیغ کی گئی ہے اسلام کے عقیدہ توحید سے یکسر متصادم ہے۔ اگر مادر وطن کی پرستش ہندوستانی قومیت ہے تو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایسی کسی قوم پرستی کا قبول کرنا ممکن نہیں۔ پھر وندے ماترم جس متعصب، تنگ نظر اور مسلم دشمن ناول سے ماخوذ ہے اس سے معمولی سی واقفیت رکھنے والا مسلمان بھی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس نغمہ کے کسی لفظ کو زبان سے ادا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں کی طرف سے اس نغمہ کی مخالفت ہوتی رہی ہے۔ تقسیم سے قبل اور بعد بھی مسلم نقطہ نظر کے حامی وضاحت کے ساتھ یہ کہتے رہے ہیں کہ وندے ماترم نظری اعتبار سے ان کے لئے سوہان روح ہے، پھر آخر کیا وجہ ہے کہ بار بار کی مخالفت کے باوجود اس نغمہ کو نہ صرف یہ کہ دستوری حیثیت دی گئی بلکہ اب اسے بزور بازو مسلمانوں کے حلق سے اتارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مسئلے کے اس پہلو کی تفہیم کے لئے لازم ہے کہ ہم اس تاریخی پس منظر سے بھی واقف ہوں جس میں اس متعصب نغمہ کی زبان نے پرورش پائی ہے۔

وندے ماترم کا پس منظر

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی ناکامی سے جہاں ہندوستانی مسلمانوں میں مستقبل کے سلسلے میں عمومی مایوسی کا احساس پیدا ہوا وہیں احیاء پرست ہندوؤں میں اس خیال کو تقویت ملی کہ مسلم سیاسی قوت کے کھنڈر پر ایک ہندو ریاست کے قیام کا وقت اب آپہنچا ہے۔ احیاء پرستوں کے وہ گروہ جو اب تک دہلی میں مسلم حکومت کی موجودگی سے خوف کھاتے تھے اور جن کے لئے مستقبل بعید میں بھی کسی علاقائی ہندو ریاست کے قیام کا امکان ایک ناقابل عمل تصور معلوم ہوتا تھا انہوں نے قوت کے نئے سیاسی میزانیے سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ پنجاب میں سکھ قوم پرستی نے اپنی منتشر قوت کو منظم کرنے کا منصوبہ بنایا تو مہاراشٹر اور بنگال میں ہندو احیاء پرستی کی تحریک کو فروغ حاصل ہوا۔ ہندو مفکرین نے سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کرنا شروع کیا کہ مسلمانوں کی سیاسی قوت کے خاتمے کے بعد انگریزوں کی سیاسی قوت بھی ختم ہوگئی تو پھر مستقبل کس کے ہاتھ میں ہوگا۔ ان حضرات کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ انگریزوں کی سیاسی قوت کمزور ہوگی تو مسلمان دوبارہ اقتدار پر قابض ہو جائیں گے لہٰذا بنگال اور مہاراشٹر میں احیاء پرستوں کے منظم گروہوں نے مابعد انگریز ہندوستان میں ایک ہندو ریاست کے قیام کی منصوبہ بندی تیز تر کردی۔ مہاراشٹر میں پونا کو مستقبل کی ہندو ریاست کے نظری ہیڈکوارٹر کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ تلک نے شیواجی کی شخصیت میں نئے ہندو ہیرو کی دریافت کی کوشش کی اور اس کے یوم پیدائش کو ایک مذہبی قومی تہوار کی حیثیت دے دی۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ "خدا نے ملیچھوں کے ہاتھوں میں ہندوستان کی قسمت کا دائمی فیصلہ نہیں دے رکھا ہے۔" نئی ہندو قوم پرستی اس بات کا برملا اظہار کرنے لگی کہ اب شیواجی کے دشمنوں کے سیاسی زوال کے بعد ملک کا مستقبل شیواجی کے پرستاروں کے ہاتھوں میں ہے۔ بنگال میں ہندو قوم پرستی کی تحریک نے اسٹیج ڈراموں، قصے کہانیوں اور عوامی گیتوں پر مشتمل ایک بڑے ادب کو جنم دیا۔ اسی ادب نے مادر گیتی کے نظریے کو ایک فلسفے کی شکل دی۔ بھارت ماتا کا تصور عام ہوا، جا بجا بھارت ماتا کی حمایت میں ڈرامے اسٹیج ہوئے اور عوامی نغمے وجود میں آئے۔ مہاراشٹر کے ہندو احیاء پرستوں کی طرح بنگالی ہندوؤں نے بھی مسلم حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرنے اور انگریزوں کے بعد ایک خالص ہندو ریاست کے قیام کی آرزو کو عام کرنے کی کوشش کی۔ اسی تبلیغی کوششوں کا ایک حصہ

بنکم چندر راچٹرجی کا ناول آنند مٹھ ۱۸۸۲ء میں منظر عام پر آیا جس میں ناول کا ہیرو وطن کو ماں کا تقدس عطا کرنے کا منصوبہ بناتا ہے اس مقصد کے لئے وہ لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرتا ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات مہندر سے ہوتی ہے اور وہ اسے وندے ماترم کا نغمہ سناتا ہے۔ یہ پوچھے جانے پر کہ اس کا مطلب کیا ہے، ہیرو کہتا ہے "ہمارا مذہب ختم ہوگیا، ہماری ذات ہم سے چھین لی گئی، ہماری عزت رخصت ہو چکی ہے کیا مسلمانوں کو ملک سے نکالے بغیر ہندو اپنا ہند تو محفوظ رکھ سکتے ہیں" لیکن مہندر کو یہ دلائل متاثر نہیں کرتے، وہ مسلمانوں کے خلاف بغاوت میں شریک ہونے سے ہچکچاتا ہے، تب اسے آنند مٹھ کے مندر میں لے جایا جاتا ہے جہاں اسے وشنو کے ایک مجسمے کا درشن ہوتا ہے جس کے چار ہاتھ ہیں اور جس کے سامنے دو خون آلودہ انسانی سر پڑے ہوتے ہیں۔ پجاری پوچھتا ہے کیا تمہیں معلوم ہے یہ کون ہے ؟ پھر وشنو کی گود میں ایک مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ خود ہی کہتا ہے "یہ ماں ہے، ہم سب اس کے بندے ہیں۔ کہو وندے ماترم! پھر اسے کالی اور درگا کے مجسموں کا درشن کرایا جاتا ہے اور ہر موقع پر اس سے کہا جاتا ہے کہ وندے ماترم کا نغمہ الاپے۔ اسی کہانی میں ایک دوسری جگہ مارو مارو ان نیرو (مسلمانوں) کو مارو کی صدا بلند ہوتی ہے اور اسی منظر میں وندے ماترم کا نعرہ بھی بلند ہوتا ہے اور اس خواہش کا اظہار بھی کہ آخر وہ دن کب آئے گا جب ہم مساجد کو منہدم کر کے اس کی جگہ مندر تعمیر کر سکیں گے۔ ذیل میں ہم اس کہانی سے جستہ جستہ چند جملے نقل کئے دیتے ہیں جس سے کسی حد تک کہانی کے اس ماحول کا اندازہ ہو سکے گا جس میں وندے ماترم کے نغمے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے :

> تمہارا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ مسلم سیاسی قوت تباہ ہو چکی ہے، اب تمہارے لئے کرنے کو کچھ بھی نہیں۔

> یقیناً مسلم سیاسی قوت کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن ہندوؤں کی بالادستی بھی ابھی تک قائم نہیں ہو سکی ہے۔ کلکتہ اب تک انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔

> ہے بھگوان اگر ہندوؤں کی بالادستی قائم نہیں ہوئی تو حکومت کون کرے گا؟ کیا دوبارہ مسلمان بادشاہ برسر اقتدار آجائیں گے؟

> میں اپنی ماں (وطن) کو دشمنوں کے خون سے سیراب کردوں گا۔ دشمن کون ہے ؟ کوئی نہیں

انگریز دوست بھی ہیں اور حکمراں بھی۔

ہم نے ہمیشہ یہ چاہا کہ مسلم حکومت کا گھونسلہ تباہ کر دیا جائے۔ بھگوڑوں کے شہروں کو تاراج کر دیا جائے اور انہیں دریا میں پھینک دیا جائے۔ ان سور کے بچوں کو خاک میں ملا دیا جائے اور مادر گیتی کو ایک بار پھر دشمنوں سے آزاد کرایا جائے۔ دوستو! اب وہ وقت آچکا ہے۔

یہ ہے وہ زہریلی قوم پرستی اور وحشیانہ مسلم دشمنی جس کے خمیر سے مل کر وندے ماترم کا نغمہ تیار ہوا ہے۔ جن نیروؤں اور ملیچھوں کے خلاف یہ نغمہ لکھا گیا ہے ان ہی سے یہ مطالبہ بھی ہے کہ وہ خشوع خضوع سے اپنی موت کا یہ نغمہ گاتے رہیں۔ دستور ساز اسمبلی میں مسلم اراکین کی جانب سے اس نغمہ کے مسلم دشمن پہلوؤں پر اعتراض کیا گیا تو اس وقت یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی گئی کہ وندے ماترم کا نغمہ ناول کے سیاق و سباق سے الگ اپنی اہمیت رکھتا ہے اور یہ کہ ہم نے صرف اس نغمے کو اپنایا ہے، اس ناول کے پیغام کو نہیں۔ اور تب سے مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ وہ کھلے دل سے اس قومی نغمہ کو قبول کر لیں۔ لیکن کیا ناول کے سیاق و سباق سے الگ وندے ماترم کا نغمہ فی نفسہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہوسکتا ہے۔ اس سوال کا جواب فراہم کرنے کے لئے لازم ہے کہ ہم وندے ماترم کے بنیادی پیغام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ مکمل نغمہ جہاں سے وندے ماترم ماخوذ ہے کچھ اس طرح ہے:

वन्दे मातरम्

اے ماں! تیرے آگے سر ہوتا ہے خم
سرسبز و شاداب، پھلوں کی بہتات
جنوب سے اٹھنے والی ہواؤں کی تازگی
فصلوں کی دبیز چادر میں لپٹی
اے ماں!

सुजलां सुफलां मलयज-शीतलां
शस्य-श्यामलां मातरम्।

शुभ्र-ज्योत्स्ना-पुलकित-यामिनीम्
फुल्ल-कुसुमित-द्रुमदल-शोभिनीम्
सुहासिनीं सुमधुर-भाषिणीम्
सुखदां वरदां मातरम्॥

تیری راتیں چاندنی کے تقدس میں نہائی
تیری زمینیں نمودار درختوں کے خوبصورت لباسوں میں لپٹی

قہقہوں سے بھرپور آوازوں سے معمور
اے ماں تیرے دم سے راحت، تجھ سے سب آرام

بھاری تجھ پر سات کروڑ لرزاں ترساں چیخیں
چیخوں کے ہر دو ہاتھوں میں لہراتی تلواریں
کس کی جرات تجھ کو بتائے بے بس اور مجبور
تیرے اندر قوت ہے بھرپور
سر جھکتا ہے تیرے آگے تو ہے میری محافظ
تیری قوت پسپا کرتی دشمن کی ہر چال
اے ماں؛ تیرے آگے سر ہوتا ہے خم

सप्तकोटी-कण्ठ-कलकल-निनाद-कराले
द्विसप्तकोटी भुजैर्धुत-खरकरवाले
के बले मा तुमि अबले! *

बहुबल-धारिणीं नमामि तारिणीं
रिपुदल-वारिणीं मातरम् ।।

تو ہی علم اور تو ہی اخلاق
تو ہی دل، تجھے ہی کہتے روح
تجھی سے ملتی جسموں میں ہے جان
اے ماں! تیرے بازو قوت سے بھرپور
تیرے دل میں دھرم محبت کا طوفان
ہر مندر میں تیری مورت تیری شان
تو درگا ہے تیرے دس ہاتھوں میں جنگی اسلحے
کنول کے پھولوں میں تو کملا ہے
تو گویائی کی دیوتا ہے تمام نغموں سے بھرپور
تیرے آگے میرا سر جھکتا ہے

سر جھکتا ہے تیرے آگے اے دولت کی دیوی
تو مقدس ہے اور بے مثال

तुमि विद्या तुमि धर्म्म
तुमि हृदि तुमि मर्म्म
त्वं हि प्राणाः शरीरे ।
बाहुते तुमि मा शक्ति
हृदये तुमि मा भक्ति
तोमारइ प्रतिमा गड़ि
मन्दिरे मन्दिरे ।

त्वं हि दुर्गा दशप्रहरण-धारिणी
कमला कमल-दल-विहारिणी
वाणी विद्यादायिनी
नमामि त्वां
नमामि कमलां अमलां अतुलां
सुजलां सुफलां मातरम्,

تیری زمین سرسبز و شاداب تیرے باغ پھلوں سے لدے

اے ماں !

वन्दे मातरम् ।
श्यामलां सरलां सुस्मितां भूषितां
धरणीं भरणीं मातरम् ॥

اے ماں! تیرے آگے میرا سر خم

رنگ و نور کی آماجگاہ

خوشگوار مسکراہٹ سے سجی پرستاروں کی آماجگاہ

جیسے دولت سے نہائی حسن و افراط سے سیراب کوئی عورت

وہ تو ہی تو ہے اے ماں !

یوں تو پوری نظم غلیظ و مشرکانہ عقائد کا مجموعہ ہے البتہ ہم نظم کے صرف اس حصے تک اپنی گفتگو کو محدود رکھیں گے جسے بوجوہ قومی نغمے کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ اس نظم میں مادر گیتی سے مراد بنگال کی سرزمین ہے جسے بعد میں کھینچ تان کر بھارت ماتا کا مفہوم دیا گیا ہے۔ اسلام کی رو سے وطن کو تقدس کا درجہ نہیں دیا جاسکتا کجا کہ اس کی تعظیم میں ہمارے سر جھکنے لگیں۔ شریعت کی رو سے بھارت کو ماتا کا درجہ دیا جانا ایک لغو خیال ہے۔ اسلامی عقیدے کی رو سے دنیا انسانوں کے لئے مسخر کی گئی ہے۔ انسان کی حیثیت اس کائنات میں خلیفۃ اللہ فی الارض کی ہے۔ اسے ایک احساس جوابدہی کے تحت اس دنیا کو برتنے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ بظاہر ابلتے چشمے، بل کھاتی موجیں ہماری کھیتیوں کو سرسبز و شاداب کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور ہر لحہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فطرت میں پائی جانے والی ہر چیز ہر لمحے ہمیں فائدہ پہنچا رہی ہے لیکن مومن جانتا ہے کہ ان تمام برکتوں کے نزول کے پیچھے اسی ایک ہستی کی کرم فرمائی ہے اور یہ کہ عبادت کی مستحق صرف اور صرف اسی کی ذات ہے۔ ہم نہ تو کسی خاص خطہ ارض کو اپنی پرستش کے لئے منتخب کرسکتے ہیں اور نہ ہی اس کی تعظیم میں اپنا سر جھکا سکتے ہیں۔ پھر بھارت کی سرزمین کو مخاطب کرتے ہوئے وندے ماترم کہنا اور اس بات کا اقرار کرنا کہ اس کی عظمت اور احساس تلے ہمارا سر جھکا جاتا ہے کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

نغمے کا اگلا حصہ اسی خیالی ماں کی تقدیس کو مختلف انداز میں نمایاں کرتا ہے، پھر بین السطور میں یہ سوال خود بخود سامنے ابھرتا ہے۔ سو جلم سو خالم ملایا جاستیانم سا سایا سیا ملتم ماترم یعنی وہ ماں جس کا پانی میٹھا اور جس کے پاس میٹھے پھل ہیں جو جنوب سے آنے والی ٹھنڈی ہواؤں سے معمور

ہے اور جس کا منظر نامہ مختلف فصلوں نے سرسبز بنادیا ہے۔ شاعر پھر کہتا ہے ماترم یعنی یہی ہماری ماں ہے، یہی ہمارا مادر وطن ہے، یہی ہماری دیوی ماں ہے جس کے تقدس کے نغمے میں گاتا ہوں۔ آگے شاعر کہتا ہے سو بھرا جیوتسنا تلا کیتایامی نین یعنی وہ ماں جس کی راتیں سفید چاندنی نے خوشگوار بنادی ہے۔ پھر بتایا جاتا ہے فلا کسومیتا دروماوالا سو بھی نیم یعنی جیسے نمودار درختوں کی موجودگی نے خوبصورت بنادیا ہے۔ مزید کہتا ہے سوہاسنی یعنی جس کی مسکراہٹ میٹھی ہے اور سوما دھورا بھاسنیم یعنی جو شیریں مقال ہے۔ آگے کہتا ہے سوکھاوام وارا دام ماترم یعنی جو ہمیں خوشی دیتی اور راحت پہنچاتی ہے وہی ہماری ماں ہے۔ یہ سب اسی ماں کا فضل ہے۔

آگے چل کر مادر وطن دیوی ماں کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ صاف لفظوں میں بتایا جاتا ہے کہ بھارت ماتا ہی کا دوسرا روپ کالی اور درگا کی شکل میں جلوہ گر ہے۔ اس طرح وطن کی تقدیس سے شروع ہونے والا یہ نغمہ ہندو دیوی کی حمد میں بدل جاتا ہے۔ وندے ماترم کے قومی نغمے کو اگر نظم کے پورے سیاق سے علیحدہ بھی کردیا جائے جب بھی نغمے کی اجنبی زبان ہندو میوزک کی مذہبی دھن اور بھارت ماتا کا غیر اسلامی مشرکانہ تصور ہندوؤں کے دلوں میں خواہ کتنی ہی تحریک کیوں نہ پیدا کرے مسلمانوں کے لئے اس کا حلق سے اتارنا دشوار ہے۔ ہندوؤں کے لئے تو اس مذہبی عقیدے کی گنجائش موجود ہے کہ مادر وطن کو ایک الوہی ماں کی حیثیت حاصل ہے جسے وہ پوری آمادگی کے ساتھ اپنی عبادت کا مرکز بناسکتے ہیں۔ درخت اور دریا پوجنے والی قوم کے لئے یہ تصور کچھ اجنبی نہیں کہ وہ کسی خاص خطہ زمین کو اپنا محافظ سمجھے، اس سے لو لگائے، اس سے راحت مانگے اور اسے اپنا قسمت ساز گر دانے۔ ہندو مذہبی ادب میں اس کی گنجائش پہلے سے موجود ہے۔ نغمے کی کچھ ایسی ہی لے ہمیں کالی داس کی اس حمد میں ملتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ جگتہ پیتاراؤ وندے پاروتی پرمیشورو۔ البتہ مسلمانوں کے لئے یہ تصور نہ صرف یہ کہ اجنبی ہے بلکہ کسی ایسے نغمے میں ان کی شرکت ان سے ان کا سارا نظریاتی سرمایہ چھین لیتی ہے۔ دنیا کی کوئی شے خواہ ہمیں کتنی عزیز کیوں نہ ہو ہم اس کی محبت میں اس کے آگے سر نہیں جھکا سکتے۔ مسلمان کا سر تو صرف ایک ہی جگہ جھکتا ہے اور وہ ہے خدائے واحد کی بارگاہ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اسلام کا مسلمانوں سے یہ بھی مطالبہ ہے کہ دنیا کو کفر اور شرک کی آلودگیوں سے پاک کیا جائے۔ توحید خالص کی نفی کرنے والے خیالات کی سرکوبی کی جائے اور شرک کے ہر نغمے کو خواہ وہ کتنے ہی پرسوز لے میں کیوں نہ

گایا گیا ہو بربط سے نکلنے سے پہلے ہی روک دیا جائے۔ ایک طرف اسلام کا یہ مطالبہ کہ مسلمان وندے ماترم جیسے مشرکانہ خیالات کے قلع قمع کے لئے میدان میں آجائیں اور دوسری طرف ارباب اقتدار کا یہ مطالبہ کہ وہ اس نغمے کو ذوق و شوق سے گائیں۔ گزشتہ پچاس برسوں سے مسلمان خود کو اسی کشمکش میں گھرا پاتے ہیں۔ اگر اسلام کے مطالبے پر کان دھرتے ہیں تو ان پر ملک دشمنی اور غداری کا الزام عائد ہوتا ہے اور اگر وندے ماترم کا نغمہ حلق سے اتارتے ہیں تو ایمان کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

اسلام، مسلمان اور قومی ترانہ

ایک نازک مسئلے پر کھلی بحث کا آغاز

کہا جاتا ہے کہ بھارت کے مسلمان قومی ترانہ کے سلسلے میں سرد جذبات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دوسری اہم قومی علامتوں کی طرح ملک کا قومی ترانہ بھی انہیں کچھ اجنبی اجنبی سا لگتا ہے۔ اجنبی لب و لہجہ، اجنبی بول اور ایک اجنبی از کار رفتہ زبان پھر اگر قومی ترانہ ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں کوئی ہلچل برپا نہیں کرتا تو شاید یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کی وجہ صرف زبان سے ناواقفیت ہے۔ لیکن جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کی روحانی نفسیات سے واقف ہیں اور جنہیں اسلام کے آفاقی پیغام کی تھوڑی بہت بھی ہوا لگی ہے ان کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ قومی ترانہ میں مسلمانوں کی عدم دلچسپی یا قومی علامتوں سے نامانوسیت کی بنیادی وجہ دراصل خود اسلام ہے۔ ہندوستان ہی کیا، پاکستان ہوں یا دوسرے مسلم ممالک ایک مسلمان کے لئے ان ممالک کے قومی ترانے اتنے ہی اجنبی معلوم ہوتے ہیں جتنا خود ہندوستان کا قومی نغمہ۔

جب کوئی پاکستانی پاکستان کی عظمت کا نغمہ گاتا ہے خواہ ایسا وہ اسلام کے حوالے سے ہی کیوں نہ کر رہا ہو لیکن جب وہ اسلام اور مسلم امت کو پاکستانی قومیت میں محدود کرتا ہے یا اسے پاکستانی جغرافیائی خطے کے حوالے سے ایک علیحدہ شناخت عطا کرتا ہے تو دراصل وہ ایک جرم عظیم کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے۔ یعنی ایک عظیم تر اسلامی شناخت کے اندر وہ ایک جغرافیائی لسانی اور سیاسی شناخت کو ترجیح دیتا ہے۔ قومیت پاکستانی ہو یا ہندوستانی، شریعت کی رو سے دونوں یکساں ناقابل اعتبار ہیں۔ لہٰذا نغمہ ہندوستانی قومیت کا گایا جا رہا ہو یا کسی کو پاکستانی قومیت کا راگ الاپنے پر اصرار ہو، اسلام کی نظر میں یہ دونوں یکساں نوعیت کے جرم ہیں۔

اسی پہلو پر ذرا ایک دوسرے انداز سے نظر ڈالئے۔ اسلام ایک عالمی نظام عدل کے قیام کا داعی

ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بنیادی مقصد اسلام کو دنیا کے دوسرے تمام ادیان پر غالب کر دینا ہے۔ اب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں پوری امت پر عالمی نظام عدل کے قیام کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ گویا امت کا لہ یجنڈا ایک ایسے عالمی نظام کا قیام ہے جو منہاج النبوۃ پر قائم کیا گیا ہو۔ اسے آپ خلافت کہئے یا نظام امامت، نظام مصطفیٰ کہئے یا عالمی اسلامی حکومت۔ شریعت کی رو سے مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس دنیا میں قرآنی نظریے کی بنیاد پر ایک عالمی معاشرہ قائم کر دیں۔ ایک ایسا نظام قائم ہو جائے جس میں نسلی اور لسانی امتیازات ختم ہو جائیں۔ رنگ اور وطن کی بنیاد پر قائم ہونے والا ہر تشخص اپنی اہمیت کھو دے۔ مومن کے لئے دنیا کا ہر وہ خطہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے جسے یا تو اللہ نے کسی وجہ سے خصوصیت عطا کر دی ہو یا جہاں لوگوں کے نیک اعمال اور علم و فضل کی وجہ سے اس نے خصوصی حیثیت حاصل کر لی ہو۔ یعنی پوری دنیا مومن کے لئے ایک چھوٹے سے گاؤں کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ خود کو اس زمین کا شہری سمجھتا ہے کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ اس کے لئے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی خاص ملک یا خطے میں پیدا ہو گیا ہے۔ جب پوری دنیا مومن کا وطن ٹھہری تو اسے نہ تو اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر ہو سکتا ہے اور نہ ہی غیر ہندوستانی ہونے پر احساس شرمندگی۔

آج اگر مسلم دنیا میں مصنوعی سیاسی سرحدوں کی بنیاد پر بے شمار مصنوعی شناخت پیدا ہو گئی ہے تو اس کی بنیادی وجہ خلافت کے نظام کا ختم ہو جانا ہے۔ مسلمان کے لئے اس بات کی قطعی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ ہندوستانی ہے یا پاکستانی، کویتی ہے یا عراقی، مصری ہے یا اردنی، فلسطینی ہے یا شامی۔ یہ سب کی سب چھوٹی شناختیں ہیں جو اسلام کے سیاسی نظام خلافت سے انحراف کے نتیجہ میں پیدا ہو گئی ہیں۔ ہمارے لئے تو صرف ایک شناخت کافی ہے اور وہ یہ کہ ہم مسلمان ہیں، آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر اہتمام لہ یجنڈے کے لئے شب و روز سرگرم۔ بھلا ایک ایسی بین الاقوامی امت کے لئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ کسی چھوٹی قومی شناخت کو اپنے لئے باعث فخر سمجھے۔

مرغ آتش خارا کے لذت شناسد دانہ را

یہ ہے وہ پس منظر جس میں ہندوستانی مسلمانوں کی ہندوستانیت کو سمجھنا چاہیے۔ جب اسلام کے روحانی نظام میں وطنی اور قومی تشخص کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو، جب اسلام وطنی تشخص کی نفی کرتا ہو تو بھلا ہندوستانی مسلمان کسی قومی یا وطنی علامت میں کیوں کر دلچسپی لے سکتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ

ہندوستان کے قومی ترانے کو مسلمان کس نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ کہ نظری و فکری اعتبار سے قومی ترانے کا وہ مقام ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان کیوں نہیں بن پایا ہے جو ملک کی دوسری تنگ نظر گنگا جمنا اور ہمالہ کی پرستش کرنے والی قوموں کے درمیان ہے تو اس کی وجوہات محض مذہبی نہیں بلکہ سیاسی بھی ہیں، جس پر ہم آگے روشنی ڈالیں گے۔

اس بات کے اظہار میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ مجموعی طور پر قومی ترانہ کے سلسلے میں کوئی واضح نقطہ نظر اختیار کرنے میں مسلمانوں نے اب تک تذبذب کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس طرح بعض اہم ملکی اور ملی مسائل پر سنجیدہ اور کھلی گفتگو سے اجتناب کیا گیا اسی طرح ان بنیادی قومی علامتوں کے سلسلے میں بھی کوئی واضح دوٹوک رویہ اپنانے سے ہم اپنا دامن بچاتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ہماری ملی اور اسلامی شناخت قومی اور ملکی شناخت سے کچھ اس طرح الجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ ہم اب تک یہ فیصلہ بھی نہیں کر پائے ہیں کہ ہمارے لئے ہندوستانی ہونا اہمیت رکھتا ہے یا مسلمان ہونا؟ آج جب مختلف قومی نوعیت کے پروگراموں میں جن گن من کے نغمے الاپے جاتے ہیں تو مسلمانوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس ثقافت سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ بعض لوگ بجھے دلوں سے اس نغمہ میں شریک تو ہو جاتے ہیں لیکن ان کے رویہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا اندرون اس قوم پرستی کی نفی کر رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بارے میں کھلی بحث کا آغاز کیا جائے اور ہر اعتبار سے مسلمانوں کے ارباب حل و عقد اس مسئلے کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ شریعت کی رو سے ہماری ملی زندگی میں کسی ایسے قومی ترانے کا کیا مقام ہونا چاہئے، پھر اللہ کی کتاب اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے جو ہدایت ملتی ہو اس پر کسی ذہنی تحفظ کے بغیر عمل کیا جائے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل جو اپنے بزرگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پر اعتماد انداز سے اردگرد کی صورت حال کا جائزہ لے رہی ہے اسے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ خالص اسلامی حوالے سے ہماری مذہبی قیادت قومی علامتوں کے سلسلے میں اب تک کوئی واضح رویہ اپنانے سے قاصر رہی ہے۔ اس کے لئے یہ سمجھنا بھی دشوار ہے کہ آخر ایک واضح اسلامی فریم ورک کی موجودگی کے باوجود قومی علامتوں کے سلسلے میں مسلمانوں میں مختلف رویے کیوں کر پائے جاتے ہیں۔ کوئی جذبہ قومی سے سرشار ہو کر قومی جھنڈے کو سلامی دینے کو باعث فخر سمجھتا ہے تو کسی کے نزدیک یہ عمل سراسر مشرکانہ عمل قرار

پاتا ہے۔ کوئی مسلمان بڑے ہی خشوع و خضوع سے جھوم جھوم کر قومی ترانہ پڑھتا ہے تو کسی کو یہ بھی گوارا نہیں کہ وہ اس کے احترام میں کھڑا ہو۔ پھر خود قومی ترانے کے متن کے سلسلے میں عام مسلم ذہنوں میں بے شمار غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ اسی ملک میں مسلمانوں کی ایک ایسی نسل بھی موجود ہے جس نے نہ تو آج تک قومی نوعیت کے پروگرام میں شرکت کی، نہ کبھی انہیں جھنڈا لہرانے یا اسے سلامی دینے کی آزمائش سے گزرنا پڑا اور نہ ہی کبھی انہیں قومی ترانے کے احترام میں کھڑے ہونے یا اسے گانے کی کوئی ضرورت پیش آئی۔ ان میں سے بیشتر وہ لوگ ہیں جنھوں نے درس و ارشاد کے حوالے سے ہماری مذہبی قیادت سنبھال رکھی ہے۔ یہ لوگ خود تو کبھی اس نوعیت کے پروگرام میں شریک نہیں ہوتے اور اس طرح کسی نہ کسی حد تک ان متنازعہ مسائل سے اپنا دامن بچالیتے ہیں۔ البتہ عام مسلمانوں کے لئے ان نازک مسائل پر ان حضرات کی طرف سے کوئی رہنمائی نہیں آتی۔ لہٰذا عام مسلمان یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ قومی ترانے، قومی جھنڈے اور قومی نوعیت کے تہواروں میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہئے؟ حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اگر ہندوستانی قومیت کا نغمہ گانا اسلام کے عین مطابق تھا تو ہماری اعلیٰ مذہبی قیادت بھی ذوق شوق سے اس عمل میں شریک ہوتی اور اگر ایسا کرنا اسلام کی روح سے متصادم تھا تو اس بارے میں امت کو ایک واضح رہنمائی فراہم کی جاتی خواہ ایسا کرنا نظام کفر کے حواریوں پر کتنا ہی شاق گزرتا۔

متن کے اعتبار سے جن گن من کے قومی ترانے میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جو اسلامی نقطہ نظر سے قابل گرفت ہو۔ گو کہ بعض مسلم حلقوں میں بھارت بھاگیہ ودھاتا کے الفاظ سے گاہے بگاہے یہ غلط فہمی جنم لیتی رہی ہے کہ شاید شاعر کا مطلب بھارت کو قسمت ساز کی حیثیت سے پیش کرنا ہے لیکن اصل متن سے واقفیت سے اس طرح کی غلط فہمی خود بخود دور ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہ نغمہ شہنشاہ انگلستان کی آمد کے موقع پر ان کی مدح میں پیش کیا گیا تھا اس لئے اسے تاریخی تناظر سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج جو لوگ اس نغمہ کو ذوق و شوق سے قومی ترانہ بنائے ہوئے ہیں ان کے ذہنوں میں یقیناً شاہ انگلستان کی مدح سرائی نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس نغمہ کے فکری پہلو کا محاکمہ کریں بہتر ہوگا کہ اس مکمل نظم کا مستند اردو ترجمہ آپ کے سامنے ہو۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی وہ نظم جس سے قومی نغمہ اخذ کیا گیا ہے اس کا مکمل ترجمہ اس طرح ہے :

اے وہ کہ جس کی حکومت لوگوں کے دل و دماغ پر ہے
تو ہی بھارت کا قسمت ساز ہے
تیرا نام دلوں میں جوت جگاتا ہے
پنجاب، سندھ، گجرات اور مراٹھا کے باسیوں میں
دراوڑ، اڑیسہ اور بنگال کے باشندوں میں
تیرا نام گونجتا ہے وندیا اور ہمالے کی چوٹیوں میں
اور یہی موسیقی ہے جو جمنا اور گنگا کی موجوں میں موجزن ہے
اور یہی نغمہ ہے جو شب و روز بحرہند کے تھپیڑوں میں سنائی دیتا ہے
یہ سب کے سب تیری تقدیس کا نغمہ گاتے اور تیری حمد بیان کرتے ہیں
تو ہی بھارت کا قسمت ساز ہے
بلند رہے، بلند رہے، بلند رہے تیرا نام

وہ تیری آواز ہے جو رات اور دن ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتی ہے
بلاتی ہے ہندوؤں، بدھوں، سکھوں اور جینیوں کو
تیرے عرش کی طرف اور جمع کرتی ہے پارسی، مسلمانوں اور عیسائیوں کو اپنے گرد
تیرے مقدس گھر میں مشرق اور مغرب ہر سمت سے نذرانے آتے ہیں
تاکہ مربوط ہو جائیں محبت کے ہار میں
تو ہی ہے جو لوگوں کے دلوں کو سکینت سے بھر دیتا ہے
تو ہی بھارت کا قسمت ساز ہے
بلند رہے، بلند رہے، بلند رہے تیرا نام

اے ازلی نگہ بان! تیرے ہی دم سے انسانی تاریخ کا سفر جاری ہے
اس راستے پر جو قوموں کے عروج و زوال سے پٹا ہے
تمام مصیبتوں اور خوف کے درمیان
تیرے پربت کا نغمہ بجھے دلوں میں زندگی کی جوت جگاتا ہے
اور بنی نوع انسان کو مشکل ترین سفر میں راہ دکھاتا ہے

تو جو بھارت کا قسمت ساز ہے
بلند رہے، بلند رہے، بلند رہے تیرا نام

جب شب تاریک مایوسی کے سائے گہرا کر دیتی ہے اور ملک پر سکوت کی چادر تن جاتی ہے
تب تیری ماں کی بانہیں اسے اپنے آغوش میں لیتی ہیں
تیری بیدار آنکھیں اس کے چہرے پر جھک جاتی ہیں
یہاں تک کہ خوفناک خوابوں سے اسے نجات مل جاتی ہے
جس نے دبا رکھا تھا اس کی روح کو
اے وہ کہ جو بھارت کا قسمت ساز ہے
بلند رہے، بلند رہے، بلند رہے تیرا نام

تیرے دم سے رات آتی اور مشرق سے سورج طلوع ہوتا ہے
چڑیاں چہچہاتی اور صبح کی خوشگوار ہوا نئی زندگی کا پیام دیتی ہے
تیری محبت کی سنہری کرنوں سے سرشار ہو کر
بھارت بیدار ہو اٹھتا ہے اور اپنا سر تیرے قدموں میں جھکا دیتا ہے
اے بادشاہوں کے بادشاہ
اے وہ کہ جو بھارت کا قسمت ساز ہے
بلند رہے، بلند رہے، بلند رہے تیرا نام

مجموعی طور پر اس نظم میں خدا کی تقدیس کا نغمہ مختلف پیرایوں میں بیان ہوا ہے۔ ایک آدھ جگہ شاعر کے ہاتھوں سے توحید خالص کا دامن چھوٹتا نظر آتا ہے اور چوتھے بند میں ماں کی طرف ایک مبہم اشارے سے یہ تاثر بھی قائم ہوتا ہے کہ شاید شہنشاہوں کے شہنشاہ کے لئے دوسری مروجہ تلمیح بھی یکساں معتبر ہے۔ البتہ نظم کا مجموعی ماحول یہ تاثر قائم کرتا ہے کہ بھارت کی سرسبز وادیاں، بلند پہاڑ اور رواں دواں ندیاں اسی ایک ہستی کے دم سے وجود میں آئی ہیں۔ وہی بھارت کا قسمت ساز ہے اور اسی کو یہ زیب دیتا ہے کہ اس کا نام بلند رہے اور چونکہ آخری بند میں شاعر اس بات کی وضاحت کر دیتا ہے کہ بھارت کا سر اس ہستی کے قدموں میں ہے جو شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے، بھارت کا قسمت ساز ہے اس لئے اس بات میں

کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس پوری نظم کا مرکز و محور ذات باری تعالیٰ ہے۔ اب آیئے اس نظم کے پہلے بند کی طرف جسے قومی ترانے کے طور پر منتخب کیا گیا ہے۔ نظم کا یہ حصہ ان تلمیحات سے بھی پاک ہے جس سے کسی درجے میں غیر اللہ کی طرف ذہن کے منتقل ہو جانے کا خطرہ ہو۔ یہاں اس ہستی کی تقدیس کا نغمہ گایا جارہا ہے جو انسانوں کے دلوں پر حکمراں ہے، بھارت کا قسمت ساز ہے اور جس کی تسبیح و تحمید میں ملک کا ذرہ ذرہ ہر وقت مصروف ہے۔ فکری اعتبار سے دیکھا جائے تو قومی ترانہ دراصل نغمہ توحید ہے۔ اللہ کی حمد کو جس زبان میں بھی گایا جائے اور اس کی تعریف جس انداز سے بھی کی جائے مسلمان جذباتی طور پر خود کو اس سے متعلق محسوس کرے گا اس لئے ہمارے نزدیک اس قومی ترانے میں فکری اعتبار سے کوئی ایسی بات نہیں جسے قابل اعتراض ٹھہرایا جاسکے۔ یہ تو ہے اس نظم کا فکری پہلو۔ رہی یہ بات کہ اسلام خدائے واحد کی تقدیس کا نغمہ گانے کا کیا طریقہ سکھاتا ہے تو ہم اس پہلو سے بھی کتاب و سنت سے الگ ہو کر کوئی راہ نہیں اپنا سکتے اور یہی وہ پہلو ہے جو ہمیں قومی ترانے میں والہانہ شرکت سے روکتا ہے۔ آیئے اب اس نغمہ توحید کے ان متعلقات پر ایک نگاہ ڈالیں جس کے بغیر قومی ترانے کا تصور ادھورا ہے۔

اصولی طور پر قومی ترانہ کو نغمہ توحید کی حیثیت سے تسلیم کرلینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس انداز سے اس نغمہ توحید کو ہماری قومی زندگی میں برتا اور گایا جارہا ہے وہ اسلامی نظریہ حیات سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔ اسلام جس کا بنیادی مقصد بندے سے اللہ کا رشتہ جوڑنا ہے اس کے یہاں اللہ واحد کی تسبیح و تحمید کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انفرادی اور اجتماعی عبادت کا جو طریقہ ہم تک پہنچا ہے اس کے بعد اب کسی نئے طریقہ عبادت یا کسی نئے انداز ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس لئے تاریخ کے کسی لمحے میں اگر دنیا کی کوئی قوم ذکر الٰہی کا کوئی نیا اجتماعی طریقہ ہمارے سامنے لائے تو ہمارے لئے شرعی طور پر اس نئے نظام ذکر کو قبول کرنا مشکل ہوگا۔ پھر خدائے واحد کی حمد و ثنا میں عاجزی اور گریہ و زاری کا جو طریقہ اسلام نے بتایا ہے اس میں غلو کرنا بھی ہمارے لئے ممکن نہیں۔ شریعت نے بندگی کی معراج کے لئے عبادات کے جن مظاہر کو متعین کیا ہے نماز اس کا ایک انتہائی نقطہ ہے جہاں بندے کی پیشانی رب کائنات کے حضور سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ بندہ کہتا ہے کہ ساری تعریف اے خدائے بزرگ و برتر تیرے لئے ہی ہے۔ یہ ہے اسلام میں ذات باری کی تسبیح کا طریقہ۔ اب اگر کوئی شخص اس طریقے سے الگ ہٹ کر کوئی اور اجتماعی نظام عبادت ایجاد کرتا ہے اور سجدے یا نماز کے بجائے محض احتراماً کھڑے ہو جانے کو کافی

سمجھتا ہے تو گویا وہ اپنے ہوا و ہوس کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ وہ اب اس بین المللی اور بین المذہبی ملک کے لئے قابل عمل نہیں رہ گیا ہے اور یہ کہ ایک نئے طریقہ عبادت کے ایجاد کی ضرورت ناگزیر ہو گئی ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لئے مشکل یہ ہے کہ ہم قومی ترانے کے مرکزی فکر سے اتفاق کے باوجود اسے ایک اجتماعی طریقہ عبادات کی حیثیت سے قبول نہیں کر سکتے۔ رہی یہ بات کہ خدا کی تقدیس کا نغمہ کھڑے ہو کر گایا جائے یا بیٹھ کر تو اس سلسلے میں بھی ہمارے یہاں حتمی ہدایات پہلے سے موجود ہیں۔ البتہ یہ سوال کہ ذات باری تعالیٰ کی حمد کا نغمہ اجتماعی طور پر کفار و مشرکین کے ساتھ مل کر گایا جا سکتا ہے یا نہیں تو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے کسی ایسے عمل کا جواز بھی فراہم نہیں ہوتا۔

دستور پر نظر ثانی کی مخالفت کیوں؟

اب وقت آگیا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے دستور پر اعتراضات وارد کئے جائیں

بھارتیہ جنتا پارٹی نے دستور ہند پر نظر ثانی کا جو مسئلہ اٹھایا ہے اس سے عام طور پر ہندوستانی مسلمان سخت خائف اور متوحش نظر آتے ہیں۔ مسلمان جواب تک سخت ترین لمحات میں آئینی اور جمہوری جدوجہد کے ذریعے داد رسی کی امید لگائے رہتے تھے انہیں ایسا لگ رہا ہے جیسے ان کی امیدوں کی آخری "پناہ گاہ" بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔ مسلمانوں کو یہ اندیشہ ستائے دیتا ہے کہ اب تک دستور میں موجود جن خوشنما الفاظ کے سہارے وہ مستقبل کا جواب بنتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ آنے والے دنوں میں جب کوئی فرشتہ صفت شخص اس ملک کی باگ ڈور سنبھالے گا تو دستور کے خوشنما الفاظ اچانک حقیقت کا روپ اختیار کرلیں گے اور تب ہماری ساری مصیبتوں کا ازالہ ہوجائے گا۔ وہ موہوم مستقبل اب طلوع ہونے سے پہلے ہی رخصت ہوا چاہتا ہے۔ مسلمان اب تک اسی حوالے سے آئینی اور جمہوری جدوجہد کے علمبردار کی حیثیت سے خود کو پیش کرتے رہے ہیں۔ ایسا اس لئے بھی کہ عام طور پر باشعور مسلمان بھی یہ سمجھتا رہا ہے کہ اس ملک میں اگر مسلمانوں پر ایام حیات تنگ ہیں اور انہیں ہر لمحہ ایک اذیت ناک زندگی کا سامنا ہے تو اس کی وجہ دراصل حکمرانوں کی بد نیتی ہے ورنہ ملک کا آئین تو مسلمانوں کو ایک ایسی جنت میں رکھنا چاہتا ہے جہاں ہر طرف امن ہی امن ہوگا۔ مسلمان گذشتہ پچاس برسوں سے لائق حکمرانوں کے انتظار میں عقوبت کی زندگی جیتے رہے۔ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ حقیقی سیکولرزم کے علمبردار جب اس نظام کو مل جائیں گے تو ایک پرسکون اور خوشحال زندگی کا خواب خود بخود شرمندہ تعبیر ہوجائے گا۔

پچاس سال گزر گئے لیکن اس ملک کو کوئی سیکولر حکمراں میسر نہ آسکا۔ دستور کے خوشنما الفاظ حقیقت کا روپ تو کیا اختیار کرتے اس کے برعکس ہوا یہ کہ دستوری اور جمہوری عمل کے نتیجے میں وہ

لوگ برسراقتدار آگئے جو اس خوشنما آئینی جنت پر نظر ثانی چاہتے ہیں یعنی مسلمان جس دستور پر اب تک تکیہ لگائے تھے خود وہ دستور اب تبدیلی کی زد میں ہے۔ ایسی صورت میں ان پر وہ کیفیت طاری ہے جو زمین پیروں سے نکلتے وقت ہوتی ہے۔ گویا دستور پر نظر ثانی کا مطالبہ ان کے وجود پر آرے چلانے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے دستور پر کسی نظر ثانی کی مخالفت کی جارہی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی بھی عجیب مشکل ہے جس نظام کے ہاتھوں انہیں مسلسل پچاس برسوں سے اذیت کا سامنا رہا ہے اسی نظام کے بنیادی آئین کی حفاظت کو وہ اپنا فرض جانتے ہیں حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جس جمہوری، دستوری، سیکولر نظام کے عذاب سے ان پر صبح و شام جہنم طلوع ہوتا رہا ہے اس نظام کے دستور پر نظر ثانی کا مطالبہ سب سے پہلے ان کی طرف سے اٹھایا جاتا اور وہ ملک کے انصاف پسند باشندوں کو اس بات پر قائل کرتے کہ اس جمہوری نظام میں ایک منصفانہ اور پرامن معاشرے کے قیام کا امکان نہیں پایا جاتا لہٰذا پچاس سالوں کے اذیت ناک تجربوں کے بعد اب وقت آگیا ہے کہ اس بنیادی دستاویز پر نئے سرے سے گفتگو کی جائے تاکہ اس ملک کے پچیس کروڑ مسلمانوں کو پرامن زندگی کی ضمانت مل سکے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب اس دستاویز پر کسی گوشے سے نظر ثانی کی آواز اٹھی ہے تو مسلمان دستور ہند کی محافظ کی حیثیت سے خود کو پیش کر رہے ہیں۔ یقیناً جو لوگ نظر ثانی کی بات کر رہے ہیں ان کی نیتیں درست نہیں ہیں لیکن کیا ہم بحیثیت مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دستور ہند ایک ناقابل تحریف دستاویز ہے اور یہ کہ اس کو موجودہ شکل و صورت میں برقرار رکھنا ہی ہمارے ملی مفاد کا تحفظ کرسکتا ہے۔

پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ دستور ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی عقیدے کا جز نہیں ہے جسے ناقابل تحریف سمجھا جائے یا جس پر نظر ثانی کی مخالفت کی جائے۔ پھر یہ کہ اگر ملک میں گذشتہ پچاس برسوں سے ہندوستانی مسلمانوں پر ہر لحہ ایک نیا جہنم طلوع ہوتا رہا ہے تو اس نظام اور اس کے بنیادی ڈھانچے میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی تو ضرور ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کو یہ بھی سوچنا ہوگا کہ کیا وہ سابقہ اذیت ناک زندگی کو اسی انداز سے جاری رکھنا چاہتے ہیں اور ان ہی بے جان خوشنما الفاظ کے سہارے مستقبل کی زندگی جینا چاہتے ہیں یا وہ ایک نئی صبح کے قیام کے آرزو مند ہیں؟ اگر سابقہ دردناک بے بس زندگی سے پیچھا چھڑانا مقصود ہے تو یقیناً ہمیں اس نظام اور اس کے اداروں کا احتساب کرنا ہوگا اور

ہمیں اپنے موقف سے دوسرے باشندگان ملک کو باخبر کرنا ہوگا تاکہ ایک نئے عادلانہ نظام کے قیام کے لئے اگر دوسری قوموں میں بھی کوئی آرزو پائی جاتی ہے تو مسلمان اسے ایک صحت مند رخ دے سکیں۔

گذشتہ دنوں کمیونسٹوں کی طرف سے اس اندیشے کا اظہار کیا گیا کہ بی جے پی آئین کے بہانے دراصل دو چیزوں کو دستور سے ختم کرنا چاہتی ہے۔ اولاً سیکولرزم ثانیاً درج فہرست ذاتوں کے لئے ریزرویشن کی سہولت۔ کمیونسٹ پارٹی کو اگر کوئی اعتراض ہے تو ان ہی دو بنیادوں پر۔ اگر یہ اندیشہ صحیح ہے تو ان دو باتوں میں سے کوئی بات ایسی نہیں جسے مسلمان اپنی لڑائی کا ایجنڈا بنائیں۔ اس لئے کہ مسلمان کی حیثیت سے یہ سرے سے ہمارا درد سر نہیں ہے کہ اس ملک میں سیکولرزم رہے یا غارت ہوجائے۔ ہم بشمول سیکولرزم دنیا کے تمام ازم کے مخالف ہیں۔ رہا موجودہ دستوری تحفظات میں درج فہرست ذاتوں کا مسئلہ تو اس کے خاتمے سے مسلمانوں کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان ان دو بنیادوں پر دستور ہند پر نظر ثانی کی مخالفت کریں۔

اب رہی یہ بات کہ چونکہ حکمرانوں کی نیت صاف نہیں ہے اور وہ دراصل نظر ثانی کے ذریعے مسلمانوں سے دستوری تحفظات چھین لینا چاہتے ہیں تو یقیناً یہ ایک تشویشناک مسئلہ ہے لیکن اس کا یہ حل نہیں کہ ہم موجودہ نظام کو جوں کا توں برقرار رکھنے پر اصرار کریں۔ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ بلی کے ساتھ اونٹ بھی باندھ دیا گیا ہے۔ دستور جہاں بعض تحفظات کی ضمانت دیتا ہے وہیں اس کے اندر بعض ایسی باتیں بھی ہیں جو ایک ملی اسلامی زندگی کا تار و پود بکھیرے دیتی ہیں۔ گویا خواہی نہ خواہی بلی کی طلب میں اونٹ کا بوجھ آپ کی گردن پر آپڑتا ہے۔ اس لئے یہ بات مسلمانوں کے حق میں نہیں کہ وہ چند خوشنما الفاظ کی خاطر دستور پر نظر ثانی کے مطالبے کو ٹھکرادیں بلکہ انہیں چاہئے کہ وہ اعتماد کے ساتھ پچاس سالہ تجربات کی روشنی میں دستور کی ایک ایک شق کا جائزہ لیں اور اس بارے میں اپنے موقف کو اہل ملک کے سامنے لائیں ورنہ ہوگا یہ کہ وقت آگے بڑھتا جائے گا، تبدیلیاں دبے پاؤں داخل ہوجائیں گی اور تب ہمارا احتجاج کچھ کام نہ آئے گا۔

دستور انسانوں کی مرتب کردہ ایک دستاویز ہے۔ یہ انسانوں کی ایجاد کردہ شریعت ہے اس لئے اسے آسمانی کتابوں جیسا تقدس حاصل نہیں ہوسکتا اور چونکہ انسانی فہم ہر لمحہ ارتقائی مراحل سے دوچار ہے اس لئے انسانوں کے بنائے ہوئے کسی بھی ضابطہ حیات کو حتمی حیثیت حاصل نہیں ہوسکتی۔ خود جن

لوگوں نے کوئی پچاس سال پہلے موجودہ دستور کو ترتیب دیا تھا انہیں بھی اس بات کا احساس تھا کہ موجودہ دستور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قطعیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ڈاکٹر ابمیڈکر نے اس نکتہ کی وضاحت کے لئے امریکی مدبر ٹامس جیفرسن کے دو اقتباسات کا سہارا لیا تھا :

ہمیں ہر نسل کو ایک منفرد قوم سمجھنا چاہئے اور یہ حق دینا چاہئے کہ وہ اکثریت کی رائے سے اپنے لئے خود پر کچھ پابندیاں نافذ کرے۔ لیکن اسے یہ حق نہیں دیا جانا چاہئے کہ وہ آنے والی نسلوں کو بھی اپنی عائد کردہ پابندیوں کے لئے مقید کردے اور نہ ہی اسے یہ حق دیا جانا چاہئے کہ وہ دوسرے ملک کے لوگوں پر اپنی رائے تھوپے۔

گویا خود دستور کے مرتبین کو اس بات کا خوب اندازہ تھا کہ وہ نئے ہندوستان کے لئے جو دستور مرتب کر رہے ہیں وہ صرف ایک مخصوص دور کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ رہے آنے والے ایام تو اس میں یقیناً دستور اپنی موجودہ صورت حال میں اہالیان ملک کی ضرورت پوری نہیں کر سکے گا۔ اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے ابمیڈکر نے جیفرسن کے اس اقتباس سے استدلال کیا تھا :

یہ خیال کہ جو ادارے کسی قوم کے فائدے کے لئے بنائے گئے ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی، اسے ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا خواہ اس سے وہ فوائد حاصل ہو رہے ہوں یا نہیں۔ صرف اس لئے کہ کل جن لوگوں نے ان اداروں کو قائم کیا تھا انہیں عوام کا اعتماد حاصل تھا۔ تو یہ بات جابر حکمرانوں سے ان اداروں کی حفاظت کے لئے تو مفید ہو سکتی ہے البتہ کسی قوم کو ان اداروں سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن نہ جانے کیوں ہمارے قانونی ماہرین اور مذہبی لوگ عام طور پر یہ عقیدہ بنا لیتے ہیں کہ پچھلی نسلوں کو اس زمین پر تصرف کا ہم سے زیادہ اختیار حاصل تھا۔ انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہم پر اپنے قوانین تھوپ دیں اور ہمیں ان قوانین میں ترمیم کا حق حاصل بھی نہ ہو اور اسی طرح ہم بھی مستقبل کی نسلوں کے لئے قوانین بنائیں جسے آنے والی نسلیں ناقابل ترمیم سمجھیں۔ پھر تو یہی بات ہوئی کہ اس زمین پر مردوں کی حکمرانی ہے زندوں کی نہیں۔

ڈاکٹر ابمیڈکر نے کانسٹی ٹوئنٹ اسمبلی میں بحث کے دوران بہت واضح الفاظ میں جیفرسن کے ان خیالات کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا کہ "کانسٹی ٹوئنٹ اسمبلی نے عمداً اس بات سے احتراز کیا ہے کہ موجودہ

دستور کو کوئی آخری اور قطعی دستاویز بتائے اور اسے غلطیوں سے یکسر پاک گردانے بلکہ اس کے برعکس ہم نے دستور میں تبدیلی کے لئے انتہائی آسان طریقے کی نشاندہی کی ہے۔"

گویا خود دستور کے اندر دستور پر نظر ثانی کی ضرورت کا احساس پایا جاتا ہے۔ دستور کی دفعہ ۳۶۸ میں ترمیم کے طریقے کی وضاحت کی گئی ہے اس لئے فی نفسہ دستور میں تبدیلی یا اس پر نظر ثانی کی خواہش کوئی ایسا عمل نہیں جس کی مخالفت کی جائے۔ البتہ جو چیز اس وقت مسلمانوں کو پریشان کر رہی ہے وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے اسلام دشمن عزائم ہیں۔ بی جے پی چاہتی ہے کہ اپنے دور حکومت میں ایک ہندو ہندوستان کے لئے اگر موجودہ صورت حال میں کچھ اور نہ کرسکے تو کم از کم قانونی سفارشات کی ایک بنیاد تو ضرور رکھ دے جس کو بنیاد بنا کر آنے والی حکومتیں مستقبل کا ہندو ہندوستان ترتیب دے سکیں۔ یہی وہ خوف ہے جو مسلمانوں کو دستور ہند پر نظر ثانی کی مہم کی مخالفت پر مجبور کر رہا ہے۔

ہمارے خیال میں وقت آگیا ہے کہ مسلمان دستور ہند کا اپنے نقطہ نظر سے جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ دستور میں کون کون سی باتیں ان کے مذہبی عقیدے سے ٹکراتی ہیں اور کن کن باتوں سے انہیں گذشتہ پچاس برسوں میں تکلیف پہنچتی رہی ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے دستور میں بعض بنیادی ترمیم کی ضرورت ناگزیر ہے تو انہیں چاہئے کہ اہل ملک کے سامنے اپنے اعتراضات کو رکھیں اور واضح طور پر بتائیں کہ دستور کی فلاں فلاں شق ان کی ملی زندگی کے تار و پود بکھیرتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر دستور کی دفعہ ۴۴ ریاستی پالیسی کے جو رہنما اصول متعین کرتی ہے اس میں وضاحت کے ساتھ ایک ایسے معاشرے کے قیام کی تلقین ملتی ہے جسے یونیفارم سول کوڈ کا معاشرہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کا مطالبہ ہے کہ اس ملک کے کارواں کو قرآنی سول کوڈ کے راستے پر گامزن کر دیا جائے۔ گویا قرآن اگر ایک طرف لے جانا چاہتا ہے تو دستور بالکل دوسری سمت۔ ہندوستانی مسلمان پچھلے پچاس برسوں سے اس مخمصے کا شکار رہے ہیں کہ وہ کریں تو کیا کریں؟ قرآن کی ہدایات کو یکسر فراموش کرنا ان کے لئے ممکن نہیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ایک غیر قرآنی سمت میں شرح صدر کے ساتھ سفر جاری رکھ سکیں۔ مسلمان کی حیثیت سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن ناقابل تنسیخ ہے اس پر نظر ثانی نہیں ہوسکتی۔ اگر دستور اور قرآن میں کوئی ٹکراؤ پایا جاتا ہے تو دستور پر نظر ثانی کے ذریعے اس ٹکراؤ کو ختم کرنا ہوگا جب ہی ہندوستانی مسلمان اس ملک کے مکمل نظریاتی شہری ہوسکیں گے۔ اب چونکہ خود حکومت کی طرف سے

دستور پر نظرِ ثانی کا مطالبہ سامنے آیا ہے اور بعض لوگ سنجیدگی کے ساتھ سفارشات مرتب کرنے میں مشغول ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کے یہاں بھی اہلِ فکر حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی دستور کا از سرِ نو جائزہ لے اور ایک ایسے نئے دستور کا مسودہ پیش کرے جس میں عدل کا وافر امکان پایا جاتا ہو اور جو نظری بنیادوں پر مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔

ایک نئی مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کی ضرورت

مسلمانوں کو اس ملک میں ایک علیحدہ سیاسی پارٹی کی ضرورت آخر کیوں محسوس ہوتی ہے؟ جب سب کچھ موجودہ سیاسی نظام میں انہیں مل رہا ہے تو الگ سے اپنی ڈفلی بجانے اور علیحدگی پسندی کا راگ الاپنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ حکومت کا کون سا عہدہ ہے جہاں اس سیکولر نظام نے مسلمانوں کو جگہ نہ دی ہو؟ اس ملک میں ماشاء اللہ دو مسلمان صدر جمہوریہ رہ چکے ہیں اور دو چار ریاستوں میں مسلمان گورنروں کو ڈھونڈھ نکالنا بھی مشکل نہیں۔ مسلمان وزارت کے عہدے پر بھی فائز ہیں اور اس ملک میں ہر سیاسی پارٹی اس بات کا خاص اہتمام کرتی ہے کہ چند مسلمانوں کو کسی نہ کسی حلقہ انتخاب سے ٹکٹ ضرور دیا جائے۔ مرکز میں اب تک کوئی ایسی وزارت بھی تشکیل نہیں دی گئی جس میں مسلمان شامل نہ کئے گئے ہوں پھر سیکولر ہندوستان اس بات کا بھی اہتمام کرتا ہے کہ مسلم ممالک میں مسلمان سفیروں کا تقرر کیا جائے۔ گویا کون سی ایسی جگہ ہے جہاں مسلمانوں کا عمل دخل محسوس نہ ہوتا ہو، پھر بھی جو لوگ ایک نئی مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ یقیناً وہ اس ملک کے امن و آشتی کو درہم برہم کرنے والے غیر ملکی ایجنٹ ہیں۔ یہ ہے وہ تصویر جو عام طور پر بھولے بھالے سادہ لوح مسلمانوں تک قومی میڈیا بڑے زور و شور سے پھیلا رہا ہے۔ پروپیگنڈے کا دباؤ اتنا سخت ہے کہ عام لوگ تو کجا بڑے بڑے علماء و دانشوروں کے قوی شل اور حواس منجمد ہو گئے ہیں۔

کسی نئی سیاسی مسلم پارٹی کے قیام پر گفتگو سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکاری پروپیگنڈے کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس ملک میں گزشتہ پچاس برسوں سے مسلمانوں کی سیاسی شرکت کا جو ڈرامہ اسٹیج کیا جاتا رہا ہے اس کی واقعی حقیقت کیا ہے؟ پہلی بات تو یہ کہ جو

لوگ اب تک مسلمانوں کے حوالے سے سیاسی شوکیس میں سجائے جاتے رہے ہیں وہ واقعی کون لوگ تھے یا ہیں؟ پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ یہ حضرات (الا ماشاء اللہ) اپنے چہروں پر مسلمانوں کا ماسک لگاکر کن قوتوں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے ہیں؟ ان کی ساری دوڑ دھوپ اور تگ و دو کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کی خبرگیری تھی یا یہ حضرات ہر قیمت پر اپنے ہندو آقاؤں کی خوشنودی کے لئے کام کر رہے تھے؟ پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ سیاست کی دنیا میں ان کی چلت پھرت ایک اسلامی لےجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے تھی یا نہیں؟ تجزیہ کے اس عمل میں نہ تو ہمیں کسی شخص سے کوئی ذاتی پرخاش ہونی چاہئے نہ ہی کسی کے لئے ہمدردی کا جذبہ۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ جو لوگ سیاسی میدان میں مسلمانوں کے نمائندے باور کرائے جاتے رہے ہیں وہ آخر کس بنیاد پر مسلم نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں؟ ان کی مسلم نمائندگی کو اعتبار کہاں سے ملتا ہے؟

یقیناً ہمیں اس بات کا حق حاصل نہیں کہ ہم کسی کے ایمان پر شبہ کریں البتہ اگر پچاس سالوں سے اس امت کو مکروہ پروپیگنڈے کے سہارے سیاسی غلامی میں مبتلا رکھا جائے تو ہم میں سے ہر باشعور مسلمان کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس مکروہ پروپیگنڈے کا پردہ چاک کردے۔ ہم پہلے بھی یہ بات کہتے رہے ہیں کہ مسلمانوں کی نمائندگی وہی حضرات کرسکتے ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لےجنڈے کو لے کر آگے چلنے کا حوصلہ رکھتے ہوں اور سیاست میں جن کی شرکت اس لئے ہو کہ وہ اسلامی نظام عدل کے قیام کے ذریعے اللہ کی رضا چاہتے ہوں اور یہ کہ زندگی کے ہر معاملے کو انھوں نے پوری طرح اللہ اور اس کے رسول کی اتباع میں دے رکھا ہو۔ گویا مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلم نمائندگی کے منصب پر وہی لوگ فائز ہوسکتے ہیں جو اپنی سیاسی زندگی کا سفر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں سر کرنا چاہتے ہوں۔ یہ چند موٹی موٹی اصولی باتیں ہیں جنہیں صراحت اور تکرار کے ساتھ بار بار کتاب وسنت میں بتایا گیا ہے اور جن کی صداقت پر دنیا کا بڑے سے بڑا سرکاری عالم بھی انگلی نہیں رکھ سکتا۔ پھر آخر کیا بات ہے کہ جو لوگ اس ملک میں مسلم نمائندگی کا دعوی کرتے رہے ہیں یا جنہیں نظام کفر کے عیار حکمراں مسلمانوں کا نمائندہ بتاکر سیکولرازم کے شوکیس میں اب تک سجاتے رہے ہیں سب کے سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے قولاً و عملاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی فلسفہ کو ٹھکرا کر سیکولرازم کو ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے قبول کر رکھا ہے۔ وزارت، گورنری یا صدر جمہوریہ کے اعلیٰ مناصب تک پہنچنے والا کوئی

بھی مسلمان ہو وہ اپنی ذاتی زندگی میں مذہبی سمجھا جاتا ہو یا غیر مذہبی، اس کے چہرے پر داڑھیاں اگتی ہوں یا وہ شیروانی پہنتا ہو، واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بلا استثنیٰ ہر ایک نے موجودہ نظام کفر کے استحکام کے لئے ہی کام کیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی سیاست میں اس لئے داخل نہیں ہوا ہے کہ اس عمل سے اسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل ہو جائے گی اور نہ ہی کبھی کسی نے اسلامی ایجنڈے کی بات تک کرنا گوارہ کی ہے۔ الثانیہ ضرور ہوا کہ جب کبھی مسلمانوں کی طرف سے اسلامی سیاسی ایجنڈے کی بات آئی یا ملک میں اہل ایمان کی سیاسی صف بندی کا سوال اٹھایا گیا تو نظام کفر کے یہ سیاسی مسلمان ایسی ہر مہم کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ مسلمانوں کو لعن طعن کرنے اور ان پر انتہا پسندی کا الزام لگانے میں یہ اپنے غیر مسلم سیاسی آقاؤں سے بھی کہیں آگے نظر آئے۔ پھر آخر یہ کیسے مسلمان ہیں اور کیسے مسلم نمائندے ہیں جن کی شب و روز کی جدوجہد کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اس ملک میں جاری موجودہ نظام کفر کو مزید استحکام بخشا جائے اور کبھی بھی کسی گوشے سے سابق دارالاسلام ہندوستان کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کی آرزو کا اظہار بھی ہو تو اسے پوری قوت سے کچل دیا جائے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ کفار و مشرکین کے سب سے زیادہ وفادار ایجنٹ ہیں آخر انہیں مسلمانوں نے اپنا نمائندہ کیسے سمجھ رکھا ہے

سیاست کی موجودہ بساط پر جو مسلم چہرے سجائے گئے ہیں ان بیچاروں کی بھی اپنی مجبوری ہے۔ یقیناً ان میں سے بیشتر مسلم حلقہ انتخاب سے آتے ہیں لیکن سیاسی پارٹیوں میں ان کا داخلہ اور انتخابی حلقوں میں ان کی نامزدگی کا معاملہ کلی طور پر غیر مسلم سیاسی آقاؤں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ سیاسی میدان میں سرگرم مسلمان اس تلخ حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ امت میں انتہائی چھوٹی آرزوؤں کے لئے دین و ایمان کا سودا کرنے والوں کی کمی نہیں۔ یعنی مقابلہ انتہائی سخت ہے۔ لہٰذا اگر اس نے دین و ایمان کا سودا کرنے، مسلم مفادات کو زک پہنچانے اور غیر مسلم سیاسی آقاؤں کے اشارہ ابرو کو سمجھنے میں ذرا بھی تساہل سے کام لیا تو کوئی دوسرا اس پر سبقت لے جائے گا۔ سیاسی مسلمانوں کے درمیان مسابقت کی اسی دوڑ نے نظام کفر کو بڑی آسانی سے وفادار خادموں کی فوج ظفر موج فراہم کر دی ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے لئے مسلمانوں میں اپنے ڈھب کے آدمیوں کی تلاش کا کام انتہائی آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست کے میدان میں جب ایک مسلم نام کثرت استعمال کے سبب اپنا اعتبار کھو دیتا ہے تو سیاسی پارٹیاں اسے تاریخ کے ڈسٹ بن میں کچھ اس طرح پھینک دیتی ہیں جیسے کبھی اس کا وجود ہی نہیں تھا۔

آپ میں سے بہتوں نے Puppet Show دیکھا ہوگا۔ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مختلف کردار آپس میں ایک دوسرے سے دست بہ گریباں ہوں۔ کوئی غصہ کر رہا ہے تو کسی کا اچھل کود اس کی مسرت کو ظاہر کرتا ہے اور ان ہی مجسموں سے وقتاً فوقتاً کسی کی ہمدردی یا کسی کی مخالفت میں خوبصورت الفاظ کے جملے بھی نکلتے ہیں لیکن نہ تو ان جملوں پر ان مجسموں کا اختیار ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی حرکت ان کی اپنی ادا ہوتی ہے۔ دور پردے کے پیچھے سے نظر نہ آنے والے باریک تار ان کی حرکت کو کنٹرول کرتے ہیں اور مکالمے میں کب کیا بولا جانا مناسب ہے اس کا فیصلہ بھی پردے کے پیچھے سے کوئی اور کرتا ہے۔ کچھ یہی حال ہمارے موجودہ سیاسی مسلمانوں کا بھی ہے۔ کہنے کو وہ وزیر ہوں یا رکن پارلیمنٹ، پارٹیوں میں ان کی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر دکھایا جاتا ہو یا انہیں سیاسی مشیر کا درجہ ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ان بیچاروں کی لگامیں اتنی سختی سے کسی ہوتی ہیں کہ یہ اپنی مرضی سے اف بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھا جائے تو یہ حضرات عام مجبور و مقہور مسلمانوں سے بھی کہیں زیادہ بے بس ہیں۔ اب اگر کوئی ان بیچاروں سے یہ توقع کرے کہ وہ حکومت کے ایوانوں میں مسلم مفاد کے لئے آواز بلند کریں گے تو یقیناً یہ ان غریبوں کے ساتھ سخت مذاق ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکومت کے ایوانوں میں مسلمانوں کا پہنچنا، وزارت و صدارت کے منصب پر ان کا فائز ہونا من حیث الامت ہمارے لئے مفید نہیں تو آخر اس پورے تماشے کو جوں کا توں جاری رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ جو نظام جبر گزشتہ پچاس برسوں سے اس امت کا نام و نشان مٹانے کے درپے ہے اور جو سیاسی پارٹیاں اپنے دور حکومت میں اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں آخر وہ اتنی مہربان کیوں ہیں کہ اپنی حکومت میں مسلمانوں کو کوئی نہ کوئی عہدہ دینا ضروری خیال کرتی ہیں؟ یہ سوال سنجیدہ غور و فکر کا طالب ہے کہ مسلمانوں کی مروجہ پروکسی لیڈر شپ (Proxy Leadership) سے فائدہ کسے پہنچ رہا ہے؟ موجودہ سیاسی نظام میں ٹیڑھے میڑھے مسلمانوں کو سیاسی شوکیس میں سجانے سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ ہندو سیکولرازم کو ایک False Legitimacy مل جاتی ہے اور اس طرح عام مسلمانوں میں یہ باور کرانا ممکن ہوتا ہے کہ اس نظام جبر میں اتنی وسعت ہے کہ یہاں مسلمان بھی حسب خواہش اپنا رول ادا کر سکتے ہیں۔ اس طرح عام مسلمانوں میں ہزار سالہ سیاسی اقتدار سے محرومی اور موجوہ سیاسی غلامی کے احساس کو کم کرنے میں مدد ملتی ہے اور چلتے چلاتے غیر مسلم

سیاسی آقاؤں کو وفادار ایجنٹوں کی ایک ٹیم بھی ہاتھ آجاتی ہے۔ پھر اس بے ضرر سے عمل میں ان کا کچھ جاتا بھی تو نہیں اس لئے کہ کلیدی وزارتیں اور پالیسی ساز عہدے ان کے کنٹرول میں تو ہوتی ہی ہیں۔ رہے وہ غیر اہم شعبے جو سیاسی مسلمانوں کو عطا ہوتے ہیں تو وہ بھی دراصل ان کے تصرف میں ہوتے ہیں البتہ ان کے چہروں پر مسلمانوں کے ماسک چپکا دئے جاتے ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو موجودہ نظام جبر اس Tokenism سے فائدہ کیوں نہ اٹھائے؟

حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ہمارے اہل دانش اور دین و شریعت کا علم رکھنے والے لوگ بھی مسلمانوں کی اس پروکسی نمائندگی کو حقیقی نمائندگی سمجھ بیٹھے ہیں۔ عام طور پر پارلیمنٹ میں مسلم اراکین کی گھٹتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اس خیال کا اظہار کیا جاتا رہا ہے کہ پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی تعداد کم ہو رہی ہے، یا یہ کہ پارلیمنٹ یا وزارت میں مسلمانوں کو خاطر خواہ نمائندگی نہیں مل رہی ہے۔ حالانکہ باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پارلیمنٹ میں ان کی نمائندگی سرے سے مفقود ہے۔ جن کی تعداد گھٹ یا بڑھ رہی ہے وہ تو دراصل ان کے آدمی ہیں، بھلا ان کی تعداد کے کم یا زیادہ ہونے سے مسلمانوں کی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ غم تو ان کے سیاسی آقاؤں کو ہونا چاہئے کہ ان کے وفاداروں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ مسلمان اس مسئلے سے خود کو متعلق محسوس کرتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب بی جے پی کے سکندر بخت کو مسلمان اپنا نمائندہ تسلیم نہیں کرتے تو دوسری پارٹیوں میں پائے جانے والے سکندر بختوں کو وہ کس طرح اپنا نمائندہ قرار دے لیتے ہیں؟ موجودہ سیاسی نظام میں مسلمان پارلیمنٹ میں رہیں یا اس سے باہر، وزارت کے عہدے پر متمکن ہوں یا فٹ پاتھ پر خوانچہ لگائیں، ہمارے خیال میں اس سے اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بعض لوگ اس اندیشے کا اظہار کرتے نہیں تھکتے کہ اگر مسلمان نظام جبر سے یکسر لاتعلق ہو کر سیاسی پارٹیوں سے اپنا رشتہ توڑ لیں گے تو مسلمانوں کی رہی سہی سیاسی اہمیت بھی ختم ہو جائے گی پھر تو انہیں ووٹ کے حوالے سے بھی کوئی نہ پوچھے گا۔ اس اندیشے پر ہم تفصیلی اظہار خیال آگے کریں گے، یہاں صرف اتنا سمجھنا کافی ہے کہ آپ جسے موجودہ نظام میں مسلمانوں کا سیاسی عمل دخل سمجھے بیٹھے ہیں وہ دراصل غیر مسلموں کا عمل دخل ہے۔ البتہ اس کے لئے مسلمانوں کے درمیان انہیں چند آلہ کار میسر آگئے

ہیں۔ ذرا غور کیجیے اگر موجودہ پارلیمنٹ تمام مسلم اراکین اور وزراء سے خالی ہوجائے تو اس امت پر کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ البتہ یہ ضرور ہوگا کہ یہ سیاسی مسلمان اور ان کے اردگرد منڈلانے والا ایک چھوٹا سا حلقہ روزی روٹی سے محروم ہوجائے گا اور بس۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ملک کی سیاست مسلمانوں کے عمل دخل سے یکسر خالی ہے۔ اتنے بڑے ملک میں مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ بھی دکھائی نہیں دیتا جو کسی اسلامی سیاسی ایجنڈے کے حوالے سے حرکت میں ہو اور نہ ہی کوئی اس خیال سے میدان میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی فلسفے کو بروئے کار لاکر اس ملک کے کارواں کا رخ الٰہی ہدایت کے راستے پر ڈال دے۔ نہ ہی کسی کو اس بات کی فکر ہے کہ وہ عام مسلمانوں کو بتائے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ہمیں اپنی سیاسی زندگی کو منظم کرنے کے لئے کون سا لائحہ عمل فراہم کرتی ہے اور یہ کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا موجودہ صورت حال میں ہم سے مطالبہ کیا ہے؟ دین و شریعت کا علم رکھنے والوں نے اپنے آپ کو مدارس اور مساجد تک محدود کر رکھا ہے۔ وہ نماز، روزے کے مسائل اور نکاح و طلاق کے معاملات میں شرعی رہنمائی کو تو ضروری خیال کرتے ہیں البتہ زندگی کے دوسرے تمام شعبے مثلاً معاشی، سیاسی اور تعلیمی میدانوں کو شریعت کے دائرے سے باہر تصور کرتے ہیں یا کم از کم ان کے اس رویے سے عامۃ الناس میں یہی احساس عام ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مسجد کے اندر تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اپنا رکھا ہے۔ البتہ مسجد سے باہر ان کی زندگی نظام کفر کی معصیت میں لت پت ہے۔ مسجد کے اندر تو وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا قائد تسلیم کرتے ہیں لیکن مسجد سے نکلتے ہی وہ اپنی زندگی کی لگامیں بلاتکلف غیر مسلم سیاسی حکمرانوں کے حوالے کردیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ یہ عمل اس ملک میں ڈھکے چھپے نہیں بلکہ کھلے عام ہورہا ہے۔ اس عمل میں اہل شریعت بھی شریک ہیں اور بے شعور مسلمان بھی۔ مختلف سیاسی پارٹیوں کو برسراقتدار لانے کے لئے یا موجودہ نظام کفر کو استحکام بخشنے کے لئے مساجد کے ممبروں سے جو فتوے جاری ہوتے ہیں ان کا مقصد یہی تو ہے کہ اس ملک میں کسی خاص غیر مسلم کو ہٹاکر کسی دوسرے غیر مسلم کو اقتدار بخش دیا جائے۔ پچیس کروڑ مسلمانوں کو عمداً کسی غیر مسلم حکمراں کی تحویل میں دینے کا شرعی جواز کیا ہے؟ اللہ کی کتاب صریح الفاظ میں ہم سے یہ کہتی ہے کہ کفار مسلمانوں کے امور کے نگراں نہیں بنائے جاسکتے، لیکن ہماری

آنکھوں پر ایسی پٹیاں پڑگئی ہیں کہ ہمیں قرآن کی یہ صریح ہدایت (ولن یجعل اللّٰہ للکافرین علی المومنین سبیلا) نظر نہیں آتی۔

سیاسی میدان میں دینی رہنمائی کی عدم موجودگی سے ایک دوسرا نقصان یہ ہوا ہے کہ عام مسلمان سیاسی پارٹیوں کا غیر اسلامی ایجنڈا ڈھونے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتا۔ کہنے کو تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہے لیکن کوشش کانگریس کے خواب کو سچ کر دکھانے کے لئے کر رہا ہے۔ امت سے علی الاعلان تو اس نے اپنا تعلق نہیں توڑا ہے البتہ عملی طور پر کوئی لالو یادو کا امتی بن گیا ہے تو کوئی ملائم سنگھ کی قیادت میں اپنی نجات کا سامان دیکھتا ہے۔ حالانکہ یہ بات ہم سب پر واضح ہے کہ ملک کی سبھی غیر مسلم پارٹیاں مستقبل کے ہندوستان کا جو خواب رکھتی ہیں وہ ہمارے خواب سے یکسر مختلف ہے۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سیاسی تصور سے مختلف ہے جو ہم مسلمانوں کو اس امر کا پابند کرتا ہے کہ ہم ہر قیمت پر دنیا کے ہر خطے میں اور تاریخ کے ہر لمحے میں صرف اور صرف کتاب وسنت کی بنیاد پر نظام زندگی ترتیب دیں۔ بھلا جو لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہوں، جو کھلے عام شرک کا ارتکاب کرتے ہوں، جن کی اخلاقی خرابیوں اور اسلام دشمنی کی داستان عام ہو، ہم ان کے دست و بازو کیوں کر بن سکتے ہیں؟ پھر یہ کیسا ذہنی دیوالیہ پن ہے اور کیسی بے سمتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں میں سے کوئی جنتادل کے منشور کو غالب کرنے کے لئے سرگرم ہے تو کوئی کانگریس، سماجوادی یا بی ایس پی کے منشور کے نفاذ کے لئے حرکت میں ہے، تو کوئی اس بات کو ضروری خیال کرتا ہے کہ اس ملک میں حقیقی سیکولرازم اور سچی جمہوریت کے قیام کے لئے کوشش کی جائے لیکن کسی کو بھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی منشور کے تحت حرکت میں آئے۔ یہ کتنا بڑا سانحہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے گزشتہ پچاس برسوں سے اس ملک میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی ایجنڈے کو منجمد کر رکھا ہے اور اپنی ساری توانائیاں دشمنان رسول کے مشن کو آگے بڑھانے میں صرف کر رہے ہیں۔ اس سے بڑا ارتداد اور کیا ہو سکتا ہے؟

ہمارے خیال میں اس ملک میں اگر امت اسلامیہ کو تحلیل ہونے سے بچانا ہے تو ہمیں جلد از جلد انہیں ایک ہمہ گیر اسلامی پیکج فراہم کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ بات صاف صاف بتانی ہوگی کہ شریعت سے مراد صرف مسلمانوں کا پرسنل لاء نہیں ہے اور صرف عائلی زندگی میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ

وسلم کی اتباع سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ جس طرح ہم نکاح و طلاق کے مسائل میں شریعت کی ہدایت کو ضروری خیال کرتے ہیں اسی طرح ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ زندگی کے دوسرے امور کو فیصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو پوری طرح اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں دے دیں۔ پھر ہمارا مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ ملک کے پچیس کروڑ مسلمان اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ باقی رہ جائیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ہم مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس ملک میں ایسا نظام قائم کریں جس میں نہ صرف یہ کہ مسلمان بلکہ دوسرے باشندگان بھی اللہ کی شریعت سے فیض یاب ہو سکیں اور یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب اولاً مسلمانوں کو مشرکین کے ایجنڈے سے نجات دلایا جائے۔ ثانیاً ہم مروجہ نامحسوس فکری ارتداد سے تائب ہوکر دوبارہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں غیر مشروط اعتماد کا اظہار کریں اور ثالثاً اس کام کے لئے صورت حال کی سنگینی کے باوجود ایک منظم جدوجہد کا آغاز کردیں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب منجمد اسلامی ایجنڈے کو بلاتاخیر اور بلاخوف و خطر حرکت میں لے آیا جائے۔ گویا جتنا جلد ہوسکے مسلمانوں کے لئے اسلامی سیاسی متبادل سامنے لایا جانا ضروری ہے۔

نئی مسلم سیاسی پارٹی ہمارا شوق نہیں بلکہ ایک شرعی ضرورت ہے۔ اس کے قیام سے سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ مسلمانوں میں بیک وقت دوہری نظریاتی رکنیت کا جو رحجان پرورش پاچکا ہے اس کے خاتمے میں مدد ملے گی۔ ان کے لئے یہ سمجھنا آسان ہوجائے گا کہ ہم بیک وقت دو کشتیوں میں سوار نہیں ہوسکتے۔ ہمیں یا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں رہنا ہوگا یا پھر کسی غیر مسلم سیاسی آقا کو اپنا نجات دہندہ تسلیم کرنا ہوگا۔ عام مسلمانوں کو یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی سونیا، لالو، ملائم یا اس قبیل کی دوسری امت سے تعلق نہیں رکھ سکتا۔ پھر یہ بات بھی بآسانی سمجھائی جاسکے گی کہ امت مسلمہ کا سیاسی منشور غیر مسلم اقوام کے سیاسی منشور سے مختلف ہے اور یہ کہ دنیا کے تمام مسلمان مسالک و دبستان کے اختلاف کے باوجود صرف اور صرف اسی سیاسی منشور کے لئے کام کرنے کے پابند ہیں۔ جس نے غیروں کے منشور کو اپنا منشور قرار دیا وہ گویا غیروں میں سے ہوگیا۔ اسے نہ تو ہم اپنا نمائندہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی مسلم معاشرے میں اس کے لئے کوئی جگہ ہوسکتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ اگر دوبارہ ہم منجمد اسلامی ایجنڈے کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہوگئے تو اس ملک میں نئے اسلامی مستقبل

کی طرف ایک قدم اٹھ جائے گا۔ عام مسلمانوں میں یہ شعور عام ہوگا کہ ہمارا جینا اور مرنا یا اس ملک میں ہمارے وجود کے لئے اگر کوئی جواز ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو اس ملک میں جاری دیکھنے کے لئے سر توڑ جدوجہد کریں۔ اس عمل میں ہم جس قدر بھی کامیاب ہوں ہمیں کم از کم یہ اطمینان تو رہے گا کہ ہم نے اپنی زندگی نظام کفر کے استحکام میں ضائع نہیں کی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو آگے بڑھانے میں اپنا سب کچھ کھپا دیا۔ یہ اطمینان اور یہ اعزاز فی نفسہ اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے لئے جو کچھ بھی کرنا پڑے اسے ضرور کرنا چاہئے خواہ اس کے لئے ایک نئی مسلم سیاسی پارٹی کا قیام ہی کیوں نہ ہو؟

یہ سچ ہے کہ موجودہ نظام کفر میں کسی مسلم سیاسی پارٹی کی کامیابی کے امکانات محدود ہیں اور اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ملک کا موجودہ سیاسی ڈھانچہ نظری اور عملی ہر دو سطح پر کسی ایسی سیاسی پارٹی کو آگے تک جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر موجودہ نظام کے اندر ووٹوں کی سیاست اور سیاسی ناانصافیوں کے لئے قانونی ہتھکنڈے اتنے مؤثر ہیں کہ نئی مسلم سیاسی پارٹی کو خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن کیا اسلامی ایجنڈے کو صرف اس لئے سرد کر دیا جائے کہ اس کا بروئے کار لانا دشوار ہے؟ ہمیں اس بات کا بھی خوب اندازہ ہے کہ موجودہ نظام کو سب سے زیادہ خطرہ مسلمانوں کی سیاسی صف بندی سے آتا ہے اس لئے کہ جب اس ملک میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں نئی مسلم سیاسی پارٹی میدان میں آئے گی تو کفار و مشرکین کے لئے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنا مشکل ہوگا۔ پھر الیکشن کا موجودہ نظام جس طرح ترتیب دیا گیا ہے اس نے بھی مسلمانوں کی سیاسی قوت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ لوک سبھا کی ۵۴۴ نشستوں میں دو نشستیں اینگلو انڈین کمیونٹی کے لئے اور ۱۲۰ نشستیں شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کے لئے مخصوص ہیں۔ کھلا مقابلہ صرف ۴۲۲ نشستوں پر ہے۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ مسلم حلقہ انتخاب کی ایک بڑی تعداد ان مخصوص نشستوں میں شامل ہے جو شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کے لئے مخصوص ہیں۔ گویا جن حلقہ انتخاب میں مسلمان فیصلہ کن پوزیشن میں تھے ان کی ایک بڑی تعداد نیچی ذات کے ہندوؤں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے۔ ثانیاً مسلم آبادی کے علاقوں کو حلقہ انتخاب میں کچھ اس طرح بانٹا گیا ہے کہ قابل ذکر آبادی کے باوجود مختلف حلقہ انتخاب میں بٹ کر ان کی آبادی غیر مؤثر ہو گئی ہے۔ ثالثاً ووٹر لسٹ اور مردم شماری میں مسلمانوں کی عددی قوت کے سلسلے

میں اب تک جو رویہ اختیار کیا گیا ہے اس سے بھی موجودہ نظام میں تعداد کی بنیاد پر کوئی راستہ بنانے میں دشواری پیش آئے گی۔

جس ملک میں حساس عہدوں پر مسلمانوں کی تقرری روکنے کے لئے خفیہ سرکلر جاری ہوتے ہوں اور جہاں اوپر سے نیچے تک وزارت دفاع کا محکمہ مسلمانوں کے وجود سے خالی ہو بھلا اس ملک کے حکمرانوں کو مسلمانوں کی تعداد سے کیوں کر نہ خوف آتا ہوگا اور جو نظم اوپر سے نیچے تک دجل و فریب پر قائم ہے اس سے یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ آپ کے حصے کا سیاسی کیک آپ کو بآسانی حوالے کر دے گا۔ دشواریاں تو یقیناً ہیں لیکن ہماری نظر چونکہ سیاسی کیک میں شرکت پر نہیں بلکہ اس ملک میں اسلامی ایجنڈے کو فروغ دینے پر ہے اس لئے ہم ان تمام خطرات اور پریشانیوں کے باوجود ایک نئی مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم کسی خوش فہمی کا شکار نہیں کہ نئی سیاسی پارٹی کے قیام سے اچانک کوئی معجزہ رونما ہو جائے گا۔ ابھی تو ہمیں اس نظام کے اندر موجود رکاوٹوں کو دور کرنے میں ہی خاصی قوت صرف کرنی پڑے گی پھر جو لوگ موجودہ سیاسی نظام سے ذاتی فائدے کشید کرنے کے عادی ہوگئے ہیں وہ بھی مسلم سیاسی پارٹی کے اس تصور کر بآسانی قبول نہیں کریں گے۔ غیر مسلم سیاسی پارٹیاں تو ہماری مخالفت یوں بھی کریں گی کہ ہمارا یہ عمل ان کے وفادار مسلم خادموں کا اعتبار ساقط کر دے گا۔ سیاسی مسلمانوں کے لئے دو ہی راستے ہوں گے یا تو وہ سیاست کو خیرباد کہہ دیں یا اسلامی ایجنڈے کے تحت نئی مسلم سیاسی پارٹی میں شمولیت کی راہیں تلاش کریں اور چونکہ نئی مسلم سیاسی پارٹی نظام کفر کے ان سابقہ خادموں کو بآسانی قبول نہیں کرے گی اس لئے یہ حضرات روز اول سے ہی مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں گے۔ ہمیں یہ بھی اندازہ ہے کہ ہم پر علیحدگی پسندی کا الزام لگایا جائے گا اور اپنے ہوں یا غیر ہماری مخالفت میں سبھی پیش پیش ہوں گے۔ پھر وہ سرکاری علماء جو اب تک نظام کفر سے ذاتی فائدے کشید کرتے رہے ہیں ان کے لئے بھی چین سے بیٹھنا ممکن نہ ہوگا۔ وہ ببانگ دہل یہ بتائیں گے کہ اس ملک میں کسی نئی سیاسی پارٹی کا قیام مسلمانوں کے لئے خودکشی کے مترادف ہے۔ حالانکہ اس عمل میں مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ سرکاری علماء کے لئے خودکشی کا سامان ہوگا۔ لیکن اس سخت امکانی مخالفت کے باوجود ہم اگر ایک نئی مسلم سیاسی پارٹی کے قیام پر مصر ہیں تو صرف اس لئے کہ ہم صرف حالات کی ناسازگاری کو بہانہ بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایجنڈے کو منجمد نہیں کر سکتے۔ ہمیں ساری دنیا

کی مخالفت تو منظور ہے لیکن یہ گوارا نہیں کہ ہم دنیا سے اس حالت میں جائیں کہ اللہ اور اس کا رسول ہم سے راضی نہ ہو۔

اگر اس ملک میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل ہے تو وہ صرف اسی عمل میں کہ وہ جلد از جلد اپنے ملی اسلامی ایجنڈے کے تحت حرکت میں آجائیں۔ مختلف سیاسی پارٹیوں کو کندھا دینے اور کفار و مشرکین کی معصیت کو اپنے سروں پر لادے پھرنے کا تجربہ بہت ہو چکا۔ ملک کی کون سی سیاسی پارٹی ہے جسے آپ نے آزمایا نہ ہو لیکن اس پورے تماشے سے آپ کو ملا کیا؟ یہی نا کہ آپ کی قوت پر آپ کے کھلے چھپے دشمن اس ملک پر حکومت کرتے رہے۔ ہر الیکشن میں آپ کسی نہ کسی پارٹی کا جھنڈا لئے پھرے۔ پولنگ بوتھ پر تپتی دھوپ اور ٹھٹھرتی ٹھنڈک میں آپ کی خواتین گھنٹوں قطاروں میں کھڑی رہیں۔ غیر مسلموں کو اقتدار بخشنے کے جنون میں آپ کے نوجوان مارے گئے لیکن اس ساری جدو جہد کا پھل کس کی جھولی میں گیا۔ نظام کفر کو استحکام بخشنے کے لئے جن نوجوانوں نے زندگیاں ضائع کیں اس حرام موت کے لئے آپ کے پاس جواز کیا ہے؟ کاش کہ یہ قوت ایک اسلامی ایجنڈے کو بروئے کار لانے کے لئے ہوتی۔ ہم کچھ اور حاصل کر پاتے یا نہیں کم از کم ہمیں اس معصیت کا غم تو نہ ہوتا۔

جو لوگ سیاست کی معمولی شد بد بھی رکھتے ہیں انہیں یہ احساس ہو چلا ہے کہ ملک جس سیاسی مرحلے سے دوچار ہے وہاں ماضی کی بہ نسبت کسی چھوٹی سی مسلم سیاسی پارٹی کے لئے بھی کامیابی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب نہرو خاندان کی آمریت سے لوگوں کو خوف آتا تھا اور جب ایک سیاسی پارٹی اس ملک کے سیاہ و سفید کی مالک ہوا کرتی تھی۔ اب تو کوئی چند نشستوں پر وزارت دفاع کا قلمدان لئے بیٹھا ہے تو کوئی بیس بائیس نشستوں کی بنیاد پر وزارت عظمیٰ کی کرسی پر براجمان ہے۔ سیاسی اتھل پتھل نے ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ بڑی پارٹیوں نے چھوٹی پارٹیوں کو حکومت سونپنے میں عافیت جانی ہے۔ گویا اب سیاست کی بساط پر چھوٹے چھوٹے مہرے بھی بڑی بڑی چالیں چل سکتے ہیں۔ گو کہ ہم اس کام کے لئے میدان میں آنا نہیں چاہتے لیکن جن لوگوں کو قلت تعداد کا شکوہ ہے ان کے لئے عرض ہے کہ موجودہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کا مخصوص سیاسی بنیادوں پر مجتمع ہو جانا بھی سیاست کی دنیا میں حیرت انگیز کامیابیوں سے دوچار کر سکتا ہے۔ اگر ہماری کوئی دلیل آپ کے لئے صرف اس لئے قابل قبول نہ ہو کہ اس سے انتہا پسندی کی بو آتی ہے تو صرف اسی دلیل کو تسلیم

کرلیجئے کہ آج جب سیاسی امکانات سے فائدہ اٹھاکر ملک کی مختلف چھوٹی چھوٹی پارٹیاں بڑے بڑے فیصلوں پر اثرانداز ہورہی ہیں۔ جب بہار میں یادو اقلیت اپنی سیاسی ترکیبوں سے اپنی حکومت مستحکم کرسکتی ہے، جب دلت اپنی تمام تر پس ماندگی کے باوجود ملک کے سب سے بڑے صوبے اترپردیش میں دو مرتبہ وزارت اعلیٰ کے منصب تک پہنچ سکتے ہیں تو آخر مسلمان خود کو ان سیاسی پارٹیوں کا دست نگر بنائے رکھنے پر مصر کیوں ہیں؟

ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مسئلے پر منارہ رسولؐ سے آنے والی صدا کیا کہتی ہے؟

ہندوستانی مسلمان بیسویں صدی کی آخری دہائی میں خود کو ایک ایسی صورت حال میں گھرا پاتے ہیں جہاں ان کا ملی اور سیاسی شیرازہ منتشر ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ نظام کفر کی اتباع میں بسر ہو رہا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت عملاً معطل ہے اور اس کی جگہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نے لے لی ہے۔ شریعت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ نکاح، طلاق اور وراثت کے معاملات میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے، اس کے علاوہ سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کے ہر پہلو پر نظام کفر کے احکام و قوانین کا مکمل غلبہ ہے۔ گویا ہم ایک ایسی معصیت میں لت پت ہیں جس کا ایک ایک لمحہ ہمارے لئے عذاب جان ہے۔ عالمی سطح پر خلافت کی عدم موجودگی نے مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ کر دیا ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ اس سنگین صورت حال سے نکلنے کے لئے ہمیں کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا۔ یہ احساس عام ہے کہ راستے مسدود ہیں اس لئے اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ سوچنے والوں نے اگر کبھی کچھ سوچا بھی تو صرف اتنا کہ موجودہ اذیت ناک زندگی میں ہی سکون کے کچھ لمحات میسر آجائیں۔ لہٰذا یہ احساس عام کیا گیا کہ نظام کفر کی اتباع میں زندگی گزارنا کوئی ایسا عمل نہیں جس پر لازماً ماتم کیا جائے کہ دین کے کام کے لئے دوسرے بھی بہت سے میدان ہیں، لہٰذا اسی نظام کفر میں اسلامی زندگی جینے کی ترکیبیں دریافت کی جانے لگیں، حیلے تراشے گئے، مداہنت سے کام لیا گیا اور فقہی اصطلاحوں کے زور پر یہ تاثر عام ہوا کہ دین کو غالب کرنے کی آرزو یا شریعت کو نافذ کرنے کا خیال دراصل چند غالی قسم کے مسلمانوں کا ایجنڈا ہے جو دین کو صرف سیاسی عینک سے دیکھتے ہیں۔ رہا مستند اسلام تو ہمارے علماء کرام کی بڑی تعداد ان غالی اور مضطرب مسلمانوں سے دور آج بھی سکون سے اسلامی زندگی جیتی ہے۔ لہٰذا

زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ نماز روزہ کیجئے، اور اوراد و ظائف میں مستغرق رہئے، چلہ کشی کے عمل سے مجاہدہ نفس کا کام لیجئے، صرف اپنی مغفرت کی فکر میں گھلے جائیے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پامالی اپنے آنکھوں سے دیکھتے رہئے، تزکیہ و سلوک کی مجلسوں سے روحانیت حاصل کیجئے اور اجتماعی زندگی کا سارا نظام غیر اللہ کی اتباع میں دے دیجئے۔ آپ کو اپنی مغفرت کی فکر تو ستائے دیتی ہے لیکن آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی تذلیل کے مظاہر آپ کو مشتعل نہیں کر پاتے، گویا آپ کے لئے دین اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت کا ذریعہ نہ ہو بلکہ اعداد و شمار کی کوئی ارتھمیٹک ہو جو ثواب کی ذخیرہ اندوزی کا فن سکھاتی ہو۔

جب کہنے والی زبانیں خاموش ہو جائیں، مداہنت کو مصلحت کا نام دیا جانے لگے تو ہم پر لازم ہے کہ ہم امت مسلمہ کے لئے نئی سمت کا تعین کرنے میں کہیں اور دیکھنے کے بجائے خود اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں کہ اے ہمارے رب ہمارے لئے اس جہنم زار زندگی سے نکلنے کی سبیل کیا ہے؟ مسلمان کی حیثیت سے ہم میں سے ہر شخص اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ اس امت کے لئے قیامت تک جو بھی ایجنڈا ترتیب دیا جائے گا اس کی بنیاد کتاب اور سنت پر ہوگی اور ہمارا یہ بھی یقین ہے کہ اللہ کی کتاب اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہمارے لئے تاریخ کے ہر لمحے میں رہنمائی فراہم کرے گی۔ آگے بڑھنے سے پہلے اتنا اور جان لیجئے کہ اللہ کی کتاب رہنمائی کے لئے تاریخ کے ہر لمحے اور دنیا کے ہر حصے میں یکساں معتبر ہے۔ ایسا نہیں کہ قرآن صرف مسلم اکثریتی ممالک کے لئے کتاب ہدایت ہے اور مسلم اقلیات اپنے اپنے ملکوں میں مروجہ دین کو اختیار کرنے کے لئے آزاد ہیں۔

آیئے سب سے پہلے مروجہ نظام کے سلسلے میں شرعی حکم معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ دستوری اعتبار سے ہندوستان ایک سیکولر ڈیموکریسی ہے۔ ہندوستانی سیکولرازم اس بات کا قائل ہے کہ امور مملکت کو چلانے میں کسی بھی مذہب کا عمل دخل نہیں ہوگا بلکہ یہ سب کچھ اکثریت کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق طے پائے گا۔ ملک کی پارلیمنٹ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جب جیسا قانون چاہے بنائے اور اسے اس ملک میں نافذ کر دے۔ شریعت کی رو سے قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ شریعت ہمیں اس بات سے روکتی ہے کہ لوگ دو خدا بنا ڈالیں۔ موجودہ نظام جبر میں عملاً یہ ہوا ہے کہ مسلمانوں نے دو خدا بنا لئے ہیں۔ ایک کی حکمرانی مسجد کے اندر ہے اور دوسرے کی حکمرانی

مسجد کے باہر۔ اسلام کثرت رائے کی بنیاد پر کسی فیصلے کو معتبر نہیں ٹھہراتا۔ اگر دنیا کے سارے لوگ بھی شراب کی حلت کے قائل ہوجائیں جب بھی اللہ کی شریعت میں شراب کی حرمت باقی رہے گی اس لئے کہ کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام، نظام زندگی کے چلانے کا کون سا راستہ درست ہے اور کون سا غلط، یہ طے کرنا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے۔ اب اگر مسلمان قانون سازی کا حق کسی انسان کو دیتے ہیں تو گویا وہ اس کی ربوبیت کو کھلے عام تسلیم کرلیتے ہیں۔ اسلام کی رو سے جمہوریت کی یہ تعریف کہ وہ لوگوں کے ذریعے لوگوں پر لوگوں کی حکومت ہے ایک باطل نظریہ ہے۔ اس کے برعکس اسلام جس سیاسی نظام کا قائل ہے اس میں اللہ کی حکومت لوگوں کے ذریعے لوگوں پر قائم کی جاتی ہے۔ حکمرانوں کو صرف اسی وقت تک حکومت کا اختیار حاصل ہوتا ہے جب تک وہ اللہ کے احکام و فرامین کی بجاآوری میں مستعد اور چوکنا رہیں۔ لہٰذا موجودہ پارلیمانی جمہوریت کو مستحکم کرنے اور سیکولر اقدار کو مضبوط کرنے کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ہم انسانوں کو قانون سازی کا حق دینے کی معصیت میں مبتلا ہیں۔ اسلام میں اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے لئے ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے عالم یا بڑی سے بڑی پارلیمنٹ کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی قانون بنا ڈالے۔ جو لوگ کتاب الٰہی کی موجودگی میں دوسرے نظام حیات کی اتباع میں اپنی زندگی گزارتے ہیں ان کے سلسلے میں قرآن کہتا ہے کہ "دراصل انہوں نے اپنے علماء اور قائدین کو خدا کے علاوہ اپنا رب بنا رکھا ہے۔" (التوبہ۔۳۱) رہے وہ لوگ جو اس حقیقت کو خوب سمجھتے ہیں کہ اسلام ان سے ایک ہمہ گیر اسلامی زندگی کا طالب ہے اور پھر بھی وہ نظام کفر کی معصیت کو خوشی خوشی قبول کئے بیٹھے ہیں تو انہیں چاہئے کہ قرآن کی اس آیت میں اپنی تصویر دیکھیں:

> کیا تم ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ان ہدایات میں یقین رکھتے ہیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہیں اور جو ان سے پہلے لوگوں پر اتری ہیں البتہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے امور کا فیصلہ نظام طاغوت کے مطابق کیا جائے حالانکہ انہیں ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں گمرہی میں دور بہت دور لے جائے۔ (النساء۔۶۰)

جو لوگ ایک اسلامی سیاسی ایجنڈے کی موجودگی کے باوجود کفار و مشرکین کے سیاسی ایجنڈے کے لئے اپنی خدمات وقف کئے بیٹھے ہیں یا جو انھیں اقتدار بخشنے کے لئے مسلمانوں میں سیاسی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے ہیں ان کے لئے قرآن کی بڑی سخت وارننگ ہے:

اور جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا اس امر کے باوجود کہ اس پر حق ظاہر ہو چکا تھا اور اس نے مومنین کا راستہ چھوڑ کر اپنے لئے کوئی اور راستہ منتخب کر لیا تو ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے جو انتہائی برا ٹھکانہ ہے۔ (النساء۔۱۱۵)

قرآن کی ان واضح ہدایات کے بعد کیا مسلمانوں کے لئے اس بات کی کوئی گنجائش ہے کہ وہ ملک کی موجودہ سیاست میں سیکولر سیاسی پارٹیوں کے دست و بازو بنیں یا اس جدوجہد میں اپنی توانائی ضائع کریں؟ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی موجودگی میں ہمارے لئے ایسا ہرگز جائز نہیں کہ جن لوگوں نے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر دشمنان اسلام کی صحبت اختیار کی گویا وہ ان میں سے ہوئے جن کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

منارہ رسولؐ سے آنے والی صدا اور موجودہ جمہوریت

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ ہے کہ صرف اور صرف اس کی اتباع کی جائے۔ دنیا مانے یا نہ مانے آپ کی رائے اقلیت کی رائے ہو یا آپ کو دین پر چلنے میں اکثریت کا عتاب سہنا پڑے، ہر حال میں اللہ کا مطالبہ ہے :

تابعداری صرف اللہ کے لئے ہے اس کا حکم ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرو یہی دین کی اصل روح ہے لیکن اکثر لوگ اس بات سے واقف نہیں۔ (یوسف۔۴۰)

گویا دنیا کے تمام عقل مند بھی آپ سے یہ کہنے لگیں کہ اس ملک میں اللہ کے احکام کی بات کرنا بے وقت کی راگنی ہے اور چوٹی کے دانشور بھی اس خیال کے حامی ہو گئے ہوں کہ اس ملک میں شریعت اسلامی کے نفاذ کا خواب ایک بچکانہ خیال ہے تو آپ ہرگز بددل نہ ہوں کہ یہ انقلابی پیغام ہے ہی کچھ اتنا عجیب و غریب کہ اکثر لوگ اس کی ماہیت کو سمجھ نہیں پاتے۔ اللہ خود کہتا ہے کہ "اکثر لوگ اس بات سے واقف نہیں" البتہ جو لوگ صورت حال کی سختی کے پیش نظر اسلامی ایجنڈے کو فوری طور پر مؤخر کئے دینے اور سیکولرزم اور جمہوریت کے ذریعے مسلمانوں کو اس ملک میں عافیت کا خواب دکھاتے ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ ایک صریح گمراہی میں مبتلا ہیں۔ انہیں اس بات کا ہرگز حق حاصل نہیں کہ وہ

ایک لمحے کے لئے بھی اسلامی ایجنڈے کو منجمد کریں کہ جب اللہ نے اپنے بندوں کے لئے اسلام کو پسند کرلیا ہے تو آپ کو یہ اختیار نہیں کہ کسی اور نظام کو چند لمحے کے لئے ہی سہی معتبر گردانیں اور اس کے استحکام کے لئے اٹھ کھڑے ہوں:

> کسی مسلمان کے لئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہرگز جائز نہیں کہ جب کسی چیز کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول کی رائے موجود ہو تو وہ اس بارے میں کوئی ذاتی رائے اختیار کرے کہ اگر کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول سے منہ موڑتا ہے تو گویا وہ کھلی گمرہی میں مبتلا ہے۔ (الاحزاب۔۳۶)

شریعت کی رو سے مسلمانوں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ غیر مسلم سیاسی منشور اور سیاسی پارٹیوں سے تائب ہو کر ایک اسلامی ایجنڈے کے تحت اس ملک میں مسلمانوں کی سیاسی صف بندی کا کام شروع کریں۔ جو لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر مختلف سیاسی پارٹیوں کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں اور جو اسلام کے علاوہ کسی اور نظریئے کے غلبے کے لئے کام کر رہے ہیں، انہیں یہ جان لینا چاہئے کہ وہ دراصل خود اپنے ہاتھوں اپنی دنیا و آخرت تباہ کر رہے ہیں:

> اگر کوئی شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی خواہش رکھتا ہے تو اس کی یہ بات ہرگز قابل قبول نہ ہوگی اور وہ آخرت میں تباہ حال لوگوں میں ہوگا۔ (آل عمران۔۸۵)

حالات کتنے بھی سخت ہوں، مسلمان تھوڑے ہوں یا بہت، نظام جبر طاقتور ہو یا کمزور، لوگ آپ کی بات سننا چاہتے ہوں یا نہیں، قرآن کا مطالبہ ہے کہ:

> اے لوگو، جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت لازمی جانو اور ان کی جو تمہارے درمیان اولی الامر ہیں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹا دو، اگر واقعی تم اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہو۔ یہی بہتر اور احسن طریقہ ہے۔ (النساء ۵۹)

اولی الامر کون ہے؟

عام طور پر سرکاری علماء نے بدقسمتی سے اسی آیت میں اپنی گمرہی کا جواز تلاش کر رکھا ہے۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولی الامر کو امت مسلمہ کی قیادت کا جو وسیع اختیار دیا گیا ہے اس گنجائش سے فائدہ اٹھا کر ہر بوالہوس اپنے آپ کو اولی الامر کے منصب پر فائز سمجھتا ہے۔ حالانکہ فقہ کی کتابوں میں اولی الامر کے تعین کے سلسلے میں سخت شرائط عائد کی گئی ہیں۔ اولی الامر ایک تنفیذی عہدہ ہے جو خلیفہ یا اس کے نامزد کردہ کسی مجتہد عصر کو مل سکتا ہے۔ پھر یہ اولی الامر بھی کسی مسئلے پر کتاب وسنت سے آزاد ہو کر اپنی رائے نہیں دے سکتا۔ اس کا کام تو صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی بصیرت اور تفقہ کی روشنی میں کتاب وسنت کے مطالبات کو سمجھتے ہوئے امت کی رہنمائی کا کام انجام دے۔ جب خلیفہ ہی موجود نہ ہو تو اولی الامر کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو موجودہ ہندوستان میں اسلامی ایجنڈے کو منجمد کر کے سیکولر ڈیموکریسی کے استحکام کے لئے مسلسل حرکت میں ہیں تو ان کی بات اس لئے نہیں مانی جا سکتی کہ ان کا یہ قدم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علی وسلم کی واضح ہدایات سے ٹکراتا ہے۔ یہ حضرات اپنی گردنوں میں اولی الامر کی تختیاں بھی لٹکالیں جب بھی انہیں کتاب اور سنت پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

قرآن کی مذکورہ بالا آیات سے جو ہم نے آپ کے سامنے غور وفکر کے لئے رکھی ہیں، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ موجودہ سیکولر نظام کی شرعی حیثیت متعین کریں۔ ثانیاً اس نظام جبر کی معصیت کی تلافی کا سامان کریں اور اس کے لئے ہر ممکن لائحہ عمل کی تیاری کا کام بلاتاخیر شروع کر دیں۔ ثالثاً اس ملک کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کے لئے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی روشنی میں کام کا ہمہ گیر منصوبہ تشکیل دیں۔ رابعاً موجودہ سیاسی بے سمتی کو ختم کرنے اور مسلمانوں کے سیاسی ارتداد کو روکنے کے لئے بلاتاخیر اسلامی ایجنڈے کے تحت متحرک ہو جائیں۔ دنیا و آخرت میں ہماری کامیابی کا انحصار اسی عمل پر ہے۔

افسوس کہ گزشتہ پچاس برسوں میں نظام کفر کے حواریوں اور سرکاری علماء نے قرآن کی اس انقلابی دعوت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے اور مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی باضابطہ مہم چلائی ہے کہ نظام کفر کی اتباع میں بھی ان کا دین وایمان سلامت رہتا ہے اور یہ کہ مسلمان اسلامی سیاسی ایجنڈے سے یکسر دستبردار ہو کر کفار و مشرکین کی معیت میں ایک اسلامی زندگی جی سکتے ہیں۔ اپنے اس مکروہ عمل کے لئے یہ حضرات جن دلائل کا سہارا لیتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کا بھی ذکر ہو جائے۔

میثاق مدینہ اور موجودہ نظام کفر

امت کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا جب کانگریسی علماء نے گاندھی کی سیاسی قیادت کو معتبر ٹھہرایا۔ مولانا اشرف علی تھانوی پر تو ابتداء سے ہی یہ بات واضح تھی کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا قائل نہیں وہ مسلمانوں کے لئے مخلص نہیں ہوسکتا البتہ آزاد اور مدنی اور اس قبیل کے بے شمار علماء نے میثاق مدینہ کا سہارا لے کر کانگریسی رہنماؤں کی معیت میں اپنا سیاسی سفر جاری رکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں اور اہل یہود سے جو معاہدہ کیا تھا اس سے اس بات کا جواز فراہم ہوتا ہے کہ کسی ملک کو بیرونی خطرات سے بچانے یا حملہ آوروں سے روکنے کے لئے اہالیان وطن کے ساتھ مشترکہ دفاع کا منصوبہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ وہ یہ حقیقت بھول گئے کہ میثاق مدینہ میں تنفیذی اختیارات مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی مسئلہ پر فیصلہ لینے کا حتمی اختیار حاصل تھا جب کہ کانگریس میں جمعیۃ العلمائی مولویوں کی حیثیت گاندھی کے خوشہ چینوں سے زیادہ نہ تھی۔ انگریزوں کی موجودگی میں اور ان کے جانے کے بعد بھی ہر سطح پر اختیارات کے ماخذ پر غیر مسلم قابض رہے۔ کفار و مشرکین کے ساتھ مشترکہ جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت پچاس سالوں سے خود کو ایک ایسی صورت حال میں گھرا پاتی ہے جس سے نکلنے کے لئے میثاق مدینہ کے حامیوں کے پاس کوئی راستہ نہیں۔

اسوہ یوسفی کی غلط تعبیر

جو علماء سرکار دربار سے تعلق رکھتے ہیں یا جو کسی مخصوص سیاسی پارٹی سے وابستگی ضروری سمجھتے ہیں وہ اپنے اس عمل کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے سے دلیل لاتے ہیں۔ ان کے بقول حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے تعاون کے ذریعے اور اس کی حکومت میں ذمہ داری قبول کرکے رفتہ رفتہ ملک کو اسلامی خطوط پر ڈال دیا لیکن یہ دلیل انتہائی پوچ ہے۔ اولاً قرآن سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی حکومت میں جن قوانین کے نفاذ کے لئے کام کیا وہ پہلے مرحلے میں کافرانہ قوانین تھے جسے بعد کے مرحلے میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اسلامیانے کا کام کیا ہو۔ دوسری اور اہم تر بات یہ کہ ہمارے لئے اسوہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے

حضرت یوسف علیہ السلام کی نہیں۔ آخری کتاب کے نزول کے بعد پچھلی ساری شریعتیں منسوخ ہوجاتی ہیں۔ آپ کو وہ واقعہ یاد ہوگا کہ جب ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کو تورات کا کوئی ورق پڑھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ہویدا ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسے ترک کردو، خدا کی قسم اگر آج موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو وہ میری شریعت کی اتباع کرتے۔" قرآن صاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ "ہم نے ہر نبی کو ایک شریعت اور مکمل نظام حیات دے کر بھیجا ہے۔" (مائدہ۔۴۸) اس لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری اور حتمی شریعت کے نزول کے بعد ہمارے لئے یہ جائز نہیں کہ ہم انقلابی مشن سے اپنادامن بچانے کے لئے شریعت یوسفی علیہ السلام کا سہارا لیں۔ اسوہ یوسفی کے حوالے سے حیلہ تراشنے والوں کو یہ معلوم ہوناچاہئے کہ ان کے لئے مسلمان بنے رہنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ "رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمہارے سامنے لائیں قبول کرلو اور جس چیز سے وہ روکیں اس سے رک جاؤ۔" (الحدید۔۷)

صلح حدیبیہ کی مثال

جو لوگ اس ملک میں اسلامی ایجنڈے کو فوری طور پر منجمد کرنے کے قائل ہیں وہ کثرت سے صلح حدیبیہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس قبیل کے علماء کا خیال ہے کہ حدیبیہ میں بظاہر دب کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے جو معاہدہ کیا اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مشکل حالات میں مسلمانوں کو تصادم کے راستے نہیں بلکہ صلح کے راستے آگے بڑھنا چاہئے۔ حدیبیہ سے یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ موجودہ نظام کے اندر مسلمانوں کو جو بھی پوزیشن مل رہی ہو اسے قبول کرلینا چاہئے، حالانکہ یہ فکر حدیبیہ کے سلسلے میں سخت غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ اولاً حدیبیہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی ربوبیت پر کفار کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر کبھی آمادہ ہوئے کہ نظام کفر میں کسی بھی صورت میں شرکت قبول کرلیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی اسلامی ریاست کے قائد کی حیثیت سے کفار قریش کے ساتھ محض جنگ بندی کا معاہدہ کیا تھا۔ لہٰذا اسلامی ریاست میں آج بھی اگر کوئی حکمراں یا خلیفہ وقت بعض مصالح کے پیش نظر کسی غیر اسلامی مملکت یا گروہ سے جنگ بندی کا معاہدہ کرتا

ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔ البتہ اس معاہدے سے یہ استنباط کرنا کہ مسلمانوں کو ہر قیمت پر صلح کا راستہ اختیار کرنا چاہئے اور نظام جبر سے ٹکراؤ کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے نہ صرف یہ کہ اس واقعہ کی غلط تفہیم ہے بلکہ سیرت کے مجموعی پیغام کی یکسر نفی ہے۔ اسلام خواہ مخواہ کے امن اور بے فیض سمجھوتے کا قائل نہیں اور نہ ہی وہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ صرف خون خرابے کے ڈر سے معصیت کی زندگی اختیار کرلی جائے "الفتنة اشد من القتل"

صلح حدیبیہ جسے قرآن کریم نے فتح مبین کے الفاظ سے یاد کیا ہے محض ایک ایسا سمجھوتہ نہیں جو کفار مکہ سے دب کر کیا گیا ہو بلکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقدامی حکمت عملی کا شاہکار ہے۔ حدیبیہ سے قبل مدینہ کی نوزائیدہ اسلامی ریاست کو جن خطرات کا سامنا تھا ان میں قریش کی حیثیت کلیدی اور موثر دشمن کی تھی۔ جزیرۃ العرب میں قریش کی حیثیت حرم کعبہ کے حوالے سے معتبر سمجھی جاتی تھی۔ کعبہ براہ راست ان کی تولیت میں تھا اور ان سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بیت اللہ کے زائرین کے لئے میزبانی کی ممکنہ سہولتیں فراہم کریں گے۔ اپنے اس فرض منصبی سے کفار قریش غافل بھی نہ تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ قبائل عرب میں ان کی چودھراہٹ کا راز کعبہ کے انتظام و انصرام میں پوشیدہ ہے۔ اصولی طور پر ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ طواف بیت اللہ سے کسی کو روک دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی اس اخلاقی ساکھ پر براہ راست ضرب یوں لگائی کہ مسلمانوں کا جم غفیر انتہائی رازداری سے غیر معروف راستوں کو عبور کرتا سبک رفتاری کے ساتھ حدیبیہ تک پہنچ گیا۔ قریش کو جب یہ خبر ملی کہ مسلمان ایک بڑی تعداد میں عمرہ کے ارادے سے آئے ہیں تو ان کے قائدین کو اس بات نے مخمصے میں ڈال دیا۔ اصولاً وہ کسی پر کعبہ کا دروازہ بند کرنا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی انہیں یہ گوارا تھا کہ مسلمان ہنستے کھیلتے کعبہ کا طواف کرکے واپس چلے جائیں کہ وہ اپنے دشمنوں کو اس طرح اپنے شہر میں آزادانہ گھومتے پھرتے دیکھنے میں اپنی تذلیل سمجھتے تھے۔ کریں تو کیا کریں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حکمت عملی نے کعبہ کے متولی کی حیثیت سے ان کی غیر جانبداری پر سوالیہ نشان لگادیا۔ ان کے لئے دونوں میں سے کوئی بھی صورت حال قابل قبول نہ تھی لہٰذا معاہدہ امن کی تجویز خود دشمن کی طرف سے سامنے آئی۔ بظاہر جو معاہدہ نسبتاً دب کر کیا جانے والا معاہدہ سمجھا جاتا ہے دراصل اس پوری صورت حال کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقدامی عمل نے ترتیب دیا تھا۔ حیرت ہے کہ جو معاہدہ اقدامی عمل کی ایک

شاہکار مثال ہو اور جس کی تجویز مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ کفار کی طرف سے پیش کی گئی اسے ایک عام سا نا انقلابی معاہدہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

دو برائیوں میں سے ایک کا انتخاب

الیکشن کے موقع پر کسی مخصوص پارٹی کو ووٹ دینے کے لئے اس دلیل کا بھی سہارا لیا جاتا ہے کہ موجودہ سیاسی پارٹیوں میں سے ہی کسی نسبتاً سیکولر کردار کی حامل پارٹی کا انتخاب کرلیا جائے۔ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تو سبھی ہیں البتہ ہمیں ان میں سے نسبتاً کم خطرناک دشمن کا انتخاب کرنا ہے۔ یعنی جو لوگ دین اور شریعت کے حوالے سے مسلمانوں کا ووٹ سیاسی پارٹیوں کو دلوانا چاہتے ہیں، دبے الفاظ میں وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تمام پارٹیاں برائیوں کی مختلف شکلیں ہیں۔ البتہ نہ جانے کہاں سے یہ فارمولا اٹھالائے ہیں کہ ہمیں برائیوں میں سے نسبتاً کم تر برائی کو اختیار کرلینا چاہئے۔ ہمارے خیال میں اس مفروضہ اسلامی اصول کی شریعت میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ صورت حال دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ "ہماری امت سے ان غلطیوں کے لئے مواخذہ نہیں کیا جائے گا جو بھول چوک یا شدید دباؤ کے نتیجے میں سرزد ہوں گی۔" رخصت کا یہ اصول ایک ایسی صورت حال کے لئے ہے جب کوئی شخص تعذیب کے مرحلے سے گزر رہا ہو، جب بندوق کی نال پر اس سے یہ کہا جارہا ہو کہ وہ کسی اسلامی حکم سے دستبردار ہوجائے۔ جان بچانے کی خاطر ایسی صورت میں رخصت کی اجازت ہے البتہ موجودہ سیاسی نظام میں نہ تو کوئی آپ سے گن پوائنٹ پر ووٹ ڈلواتا ہے اور نہ ہی شخصی رخصت کے اس اصول کو اجتماعی زندگی پر منطبق کرنا صحیح ہے۔ آخر کیا بات ہے کہ مشکل سے مشکل ترین حالات میں بھی اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے قرآن کی بے شمار آیات ہمیں نظر نہیں آتیں اور رخصت کے اصول پر عمل کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی حدیث سے ہم اپنی اجتماعی زندگی کی فقہ ترتیب دینا چاہتے ہیں۔ پھر جو لوگ برائیوں میں سے نسبتاً کم درجے کی برائی کو اختیار کرنے کی تبلیغ کرتے ہیں ذرا ان سے پوچھئے کہ اگر شراب خوری، زناکاری اور اغلام بازی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو آپ کس بے ضرر گناہ کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ کفر جس شکل میں بھی آئے ہمارے لئے لازم ہے کہ اس

سے اپنا دامن بچائیں۔ چونکہ تمام غیر مسلم سیاسی پارٹیاں غیر اسلامی لہ بجنڈے کے لئے کام کر رہی ہیں اس لئے یہ سب کفر کی مختلف قسمیں ہیں۔ اسلامی شریعت ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم ان میں سے کسی کو بھی اپنے لئے پسند کر لیں۔

دار الحرب اور مصالح امت

بعض لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم چونکہ اس وقت دارالاسلام میں نہیں رہ رہے ہیں اس لئے ہم سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مطالبہ نہیں ہے جو اسلامی ریاست کے ایک شہری سے ہوتا ہے، لہٰذا یہ مطالبہ کہ ہم لازماً اسلامی لہ بجنڈے کے لئے کام کریں ہماری مخصوص صورت حال سے میل نہیں کھاتا۔ بعض لوگ ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ بہت سی اسلامی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے بچ جائیں گے۔ حالانکہ دارالاسلام یا دارالحرب کی اصطلاحیں اس وقت کوئی معنی نہیں رکھتیں جب دارالاسلام یعنی خلیفہ کا وجود نہ ہو، خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی خارجہ پالیسی کے اعتبار سے یہ طے کرے کہ کون سا ملک دارالحرب ہے اور کون سا دارالامن، کون سا دارالمعاہدہ ہے اور کون سا دارالغصب۔ پھر دارالحرب کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ اس نے خلافت سے ٹکراؤ مول لیا ہے۔ دارالحرب میں رہنے والے مسلمانوں کو حالات کے جبر کے تحت صرف رخصت نہیں ملتی بلکہ ان پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی ہے کہ وہ ہر لحہ دارالحرب کے خلاف نبرد آزما رہیں۔ رہے وہ لوگ جو دارالحرب کے پردے میں اپنی بے عملی اور کم حوصلگی کو چھپانا چاہتے ہیں تو یہ دراصل وہ لوگ ہیں جو اس نظام کفر کو الٹ پھینکنا تو کجا اس کے استحکام کے لئے شب و روز سرگرداں ہیں۔ یہ کیسی رخصت ہے جس نے خوف آخرت کو ان کے دلوں سے ایسا رخصت کیا ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ دارالحرب میں گناہوں میں لت پت خوش خوش زندگی جینے میں مگن ہیں۔

فقہی اصطلاحوں میں سب سے کارگر اصطلاح مصالح امت کی ہے۔ درباری علماء سے جب کچھ بھی نہیں بن پڑتا تو وہ فرماتے ہیں کہ فلاں پارٹی کو ووٹ دینا یا فلاں مشرک کو اقتدار بخشنا اس لئے ضروری ہے کہ اسی میں امت کا مفاد پوشیدہ ہے۔ قرآن کے احکام اپنی جگہ، اللہ اور اس کے رسول کے جس صریح مطالبے کی طرف تم اشارہ کرتے ہو وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے لیکن صرف ان احکام کی بنیاد پر کوئی

خطرناک بات کرنا امت کے مصالح کے خلاف ہے۔ اس لئے مصالح امت کا تقاضا یہ ہے کہ اس ملک میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سربلندی کی بات ہرگز نہ کی جائے مبادا دشمنوں کے کان کھڑے ہوں اور ہم پر کوئی نئی مصیبت ٹوٹ پڑے۔ البتہ مناسب یہ ہے کہ فی الحال نظام عدل کے قیام کے بجائے جمہوری عمل کو ہی مضبوط کیا جائے۔ کیا پتہ آنے والے دنوں میں جب جمہوریت کو مزید استحکام حاصل ہوجائے گا ہم بھکشوؤں کے انداز سے تبلیغ کے ذریعے خاموشی سے اس ملک کی کایا پلٹ کردیں گے۔ لہذا مصالح امت کا تقاضا یہ ہے کہ موجودہ صورت حال کو ہی برقرار رکھا جائے۔ اب ان حضرات سے کوئی یہ پوچھے کہ امت کے مفاد کو آپ کی کاسہ لیسی اور حاشیہ نشینی بہتر سمجھتی ہے یا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہے کہ اس امت کا مفاد کس امر میں پوشیدہ ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ وہ اپنے پیچھے اس امت کو کتاب وسنت کی جس ڈگر پر جمے رہنے کی تلقین کررہے ہیں وہ دراصل کانٹوں بھری راہ ہے؟ کیا انہیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ قرآن ایک ایسی انقلابی کتاب ہے جس کے ارشادات اس امت کو کبھی بھی چین کی نیند نہ سونے دیں گے؟ پھر آخر کیا وجہ تھی کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے تلقین کی کہ میرے بعد اللہ کی کتاب اور میری سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھنا؟ پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی دوسرا اس امت کے مصالح کو سمجھنے کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے؟ مصالح کے نام پر جو لوگ اس امت کو سلائے رکھنے کی سازش میں شریک ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مصالح کے نام پر کسی ایسے کام کی اجازت نہیں دی جاسکتی جسے شریعت نے حرام ٹھہرایا ہو اور چونکہ اسلام غیر اللہ کی اتباع کو معصیت قرار دیتا ہے اس لئے مصالح کے حوالے سے نظام کفر کے استحکام کی راہ ہموار نہیں کی جاسکتی۔ مصالح امت سے مراد امت کا اجتماعی مفاد ہے چند درباری علماء اور سیاسی مسلمانوں کا مفاد نہیں۔ امت کا مفاد اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے نتیجے میں مسلمان رضائے الٰہی کے مستحق ہوں۔ دنیاوی زندگی بھی نظام عدل کے سائے تلے گزرے اور آخرت میں بھی بے پایاں اجر کے مستحق گردانے جائیں۔ پھر یہ حقیقت بھی محل نظر رہے کہ مصالح امت پر رائے زنی کا حق ہر بوالہوس کو نہیں دیا جاسکتا۔ یہ حق بھی صرف امام عادل یا خلیفہ کو ہے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ کس امر میں امت کا مفاد پوشیدہ ہے اور کس عمل سے اس کے اجتماعی کاز کو نقصان پہنچ سکتا ہے؟ رہے وہ لوگ جو ان اصطلاحوں کا سہارا صرف اس لئے لیتے ہیں کہ وہ

نظام کفر کے استحکام کے لئے اور اپنی مختصر سی زندگی پر عافیت کا غازہ ملنے کے لئے کوئی اسلامی جواز تلاش کریں تو انہیں خوب معلوم ہونا چاہیئے کہ آج وہ جن لوگوں کی حمایت میں کتاب و سنت کی تعلیمات سے کھلواڑ سے بھی بعض نہیں آتے، کل جب ہر نفس پر وہ دن بہت سخت ہوگا اور ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی ہوگی اس دن نظام کفر کے بازیگر ان کے کسی کام نہ آئیں گے :

یہ وہ لوگ ہیں جو دنیاوی زندگی میں ان کی وکالت کرتے ہیں تو اللہ کے حضور قیامت کے دن ان کی حمایت کون کرے گا اور کون ہوگا جو ان کی حمایت میں سامنے آئے۔

(النساء:۱۰۹)

اسلام میں اجنبی تصورات کی آمیزش

ایک عام مسلمان حیران و پریشان ہے کہ یہ سب کچھ اتنا الٹا پلٹا کیوں ہے؟

سیاسی زوال کے گذشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں ہندستانی مسلمانوں کو جس محاذ پر سب سے زیادہ ہزیمت اٹھانا پڑی ہے وہ ان کا فکری اور نظریاتی محاذ ہے۔ غیر اسلامی نظام کے دباؤ میں ان کے فکری سانچے میں بعض ایسی بنیادی تبدیلی پیدا ہو گئی جس نے آگے چل کر آنے والے دنوں میں نشاۃ ثانیہ کے کام کو سخت مشکل بنادیا۔ جب کسی قوم کے بنیادی تصورات مسخ ہو جائیں، خیر و شر کے پیمانے آپس میں گڈمڈ ہو جائیں تو سخت حالات میں راستہ بنانا ممکن نہیں رہتا۔ آج ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی زوال اگر رو کے نہیں رکتا اور اگر ان کے عزائم کا گراف مسلسل نیچے جارہا ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عروج و زوال کے محاکمے کے لئے ان کے پاس جو بعض بنیادی پیمانے تھے وہ اب اپنی اصل شکل و صورت میں باقی نہیں رہے، حتی کہ بنیادی اسلامی اداروں اور اہم نوعیت کے تصورات پر بھی غیر اسلامی اجنبی تصورات نے کچھ اس طرح حملہ کیا ہے کہ بعض اہم نوعیت کے تصورات ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ اسلامی اصطلاحات تو باقی ہیں لیکن ان اصطلاحات کے معانی و مفاہیم میں حیرت انگیز طور پر تبدیلی آگئی ہے اور جب بنیادی تصورات اپنے اصل مفاہیم سے دور جا پڑیں تو ان مروجہ اصطلاحوں کے سہارے دوبارہ نظام اسلامی کی تشکیل نو کا کام کچھ آسان نہیں رہتا۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کو بھی یہ مغالطہ رہتا ہے کہ ان اصطلاحات کے سہارے دین و شریعت کی چلت پھرت ان کی زندگی میں گاہے بگاہے موجود ہے۔ انہیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ بے جان اصطلاحیں اپنے اصل معانی سے دور جا پڑی ہیں اور یہ کہ ان کی زندگی اب دراصل معصیت کے گرداب میں ہچکولے کھا رہی ہے۔

ذرا غور کیجیے اگر کوئی شخص ہندوستانی مسلمانوں کو سیکولر ڈیموکریسی کے قیام پر اکساتا ہے اور

اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کا منشا اور مطلب بتاتا ہے تو آپ میں سے کچھ باشعور لوگ تو یقیناً یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ سیکولر ڈیموکریسی کے قیام کی یہ دعوت دراصل دین سے انحراف ہے، یہ ایک غیر اسلامی لہ ایجنڈا ہے، دین و شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ غیر اسلامی لہ ایجنڈے کے داعیوں کے پاس کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ وہ اگر زیادہ سے زیادہ کچھ کہتے ہیں تو صرف اتنا کہ ہمیں کتاب وسنت کا بڑا علم ہے، ہم فقیہ العصر اور قطب وقت ہیں، ہم پر یہ منکشف ہوا ہے کہ آج اس ملک کو اللہ کی شریعت سے کہیں زیادہ سیکولر ڈیموکریسی کی ضرورت ہے لہٰذا مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ میری دعوت پر کان دھریں۔ یقیناً ایسے لوگوں کے جبہ و دستار سے وقتی طور پر کچھ ہلچل تو ہوتی ہے لیکن جب کوئی اللہ کا بندہ اس دعوے کو باطل ٹھہرانے کے لئے کتاب وسنت سے کوئی دلیل لے آتا ہے تو بڑی سے بڑی شخصیت کا اعتبار لمحے بھر میں ہوا ہو جاتا ہے۔ عام آدمی کو یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ حق کس کی طرف ہے۔ البتہ اگر اجنبی تصورات کو اسلامی قالب اور شرعی اصطلاحات کے ذریعے لوگوں میں عام کیا جائے اور اگر شرعی اصطلاحات کے معانی و مفاہیم بدل کر اسے رائج کرنے کی کوشش کی جائے تو عام لوگوں کے لئے اس بات پر یقین کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ ان شرعی اصطلاحات کے ذریعے جو کچھ بھی پیش کیا جا رہا ہے وہی دراصل اللہ اور اس کے رسول کا منشا ہے۔ پھر کم حوصلہ شارحین شریعت اور دنیادار علماء سوء کی بن آتی ہے جو ان شرعی اصطلاحات کا سہارا لے کر نظام کفر کی عین سرپرستی میں اسلامی زندگی جینے کا راگ الاپنے لگتے ہیں۔

جب نظام کفر کے اندر رہ کر اسلامی زندگی کا کاروبار آسانی سے چل رہا ہو اور جب کسی مہم جوئی کے بغیر آخرت کا حصول ممکن ہو اور جب شخصی مغفرت کے لئے اسی نظام معصیت میں رہ کر خوشی خوشی دونوں ہاتھوں سے ثواب کا انبار لگایا جا سکتا ہو تو پھر اس فکر میں گھلے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت مغلوب ہے۔

ہندوستان کی سرزمین پر جسے ہم سابق دارالاسلام کہتے ہیں، یہ بات اب بہت کم ذہنوں پر واضح ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ دراصل ہم سے چاہتا کیا ہے؟ زوال کا احساس اور بے بسی کے جہنم میں گھٹ گھٹ کر جیئے جانے کا تجربہ تو ہم میں سے ہر ایک کو ہے، لیکن بہت کم لوگ ہیں جن کے دلوں میں موجودہ صورت حال سے نکلنے کی شدید تڑپ بھی پائی جاتی ہو۔ اسلامی زندگی جینے کی موہوم آرزو تو یقیناً

ہر دل میں موجود ہے لیکن جب ہمیں گاہے بہ گاہے اسلامی اصطلاحیں اپنے اردگرد متحرک دکھائی دیتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے لمحے بھر کے لئے ہمارے اندرون میں اٹھ رہی بغاوت کو قرار آگیا ہو، لگتا ہے شاید سب کچھ اسی نظام کے اندر ممکن ہے۔ بھلا جب دین و شریعت کا سارا کاروبار اس ملک میں چل رہا ہو، جب شرعی امارتیں قائم ہوں، شرعی عدالتیں کھٹا کھٹ اپنے فیصلے سنا رہی ہوں اور جب کوئی امیر الہند امور امت کی نگہبانی کے لئے موجود ہو تو عام آدمی کو اپنی نجات کے لئے کوئی مشکل ترین اور لمبا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

عقل حیران ہے کہ اسلامی نظام کے اہم ادارے ایک غیر اسلامی نظام میں کیسے فٹ بیٹھ گئے ہیں۔ کیا یہ وہی شرعی امارت ہے جو کسی اسلامی نظام کا کلیدی حصہ ہوا کرتی ہے؟ یا ان جیسی دینی اصطلاحوں کے سہارے اس ملک میں جو کچھ رائج ہے وہ دراصل دین اور شریعت سے دور بہت دور ایک ایسی چیز ہے جسے ایجاد بندہ کہنا چاہئے۔ چوں کہ غیر اسلامی اجنبی تصورات نے عین اسلامی تصورات پر قبضہ جمایا ہے اس لئے بعض اوقات اکثر دردمند مخلص مسلمان بھی انہی مروجہ تصورات کو صحیح اسلام سمجھنے کی غلطی کر جاتے ہیں۔ معاملہ کسی جزوی یا فروعی مسئلے کا نہیں بلکہ دین کے بنیادی تصورات کا ہے۔ ذیل میں ہم چند معروف اصطلاحات پر مختصراً گفتگو کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ ان اصطلاحوں کو اپنے اصل مفاہیم سے ہٹا کر اور ایک مقامی قالب دے کر ہم نے اسلام کی انقلابی دعوت کو کس طرح مسخ کر دیا ہے۔

مسلم پرسنل لاء

سب سے پہلے پرسنل لاء کو لیجئے جسے عام اصطلاح میں ہم ہندوستانی مسلمانوں کی شریعت سمجھتے ہیں۔ اس ملک میں شریعت کے تحفظ کی خاطر ہم نے بے شمار جانیں قربان کی ہیں، بڑی بڑی تحریکیں چلائیں یہاں تک کہ ایک موقع پر عدالتی فیصلے کے نفاذ کو روکنے کے لئے پارلیمنٹ سے اپنے ڈھب کا قانون بھی پاس کروایا۔ ہمارے علماء و مشاہیر یہ کہتے رہے کہ مسلمان اگر اپنے عائلی مسائل کے حل کے لئے شریعت کے علاوہ کسی اور طرف دیکھتے ہیں یا پرسنل لاء کے علاوہ کسی اور سیکولر قانون کے ذریعے عائلی زندگی کے امور فیصل کرتے ہیں تو شریعت کی روشنی میں یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ یہ دراصل کھلم کھلا ارتداد ہے لیکن یہی علماء جو عائلی زندگی میں شریعت کی خلاف ورزی پر اتنے حساس ہیں ان کی

زبانیں زندگی کے بقیہ تمام گوشوں میں غیر اسلامی قوانین کے نفاذ کے خلاف نہیں کھلتی حالانکہ وہ قرآن کی اس آیت کا حوالہ دینے سے نہیں چوکتے "ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون"

سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مسلمان نکاح و طلاق اور وراثت کے مسئلے میں شریعت کی رہنمائی سے بے نیاز ہوجائیں تو ان پر ارتداد کی مہر ثبت ہوجاتی ہے، لیکن یہی مسلمان زندگی کے دوسرے تمام اہم تر مسائل میں الٰہی شریعت سے منہ موڑ کر انسانی شریعت کے ذریعے اپنے امور فیصل کرائیں تو ان پر ارتداد کا الزام کیوں نہیں عائد ہوتا؟ آخر جو لوگ عائلی زندگی میں اسلامی شریعت کی اتباع کے لئے اس قدر بے چین ہیں وہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلامی شریعت کو کالعدم قرار دیئے جانے پر مضطرب کیوں نہیں؟ شریعت کا یہ مفہوم کہ وہ صرف پرسنل لاء تک محدود ہے ایک گمراہ کن خیال ہے۔ ہمارے عہد میں عام مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ تصور تقویت پاچکا ہے کہ شریعت کی پاسداری کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ نکاح و طلاق اور وراثت کے مسائل مولویوں سے حل کرائیں، رہی بقیہ زندگی اور زندگی کے دوسرے اہم تر مسائل تو بھلا اسلام کو ان پیچیدگیوں سے کیا واسطہ! ان مسائل میں وہ آزاد ہیں کہ انسانوں کی بنائی ہوئی شریعت کی پیروی کریں۔ شریعت کا محدود تصور عام ہوجانے سے عام مسلمان زندگی کے بقیہ امور میں شریعت جمہور کی اتباع کو معصیت نہیں سمجھتا، وہ خوشی خوشی ایک اسلامی زندگی جینے کے فریب میں مبتلا رہتا ہے۔

شرعی عدالت

کچھ یہی حال شرعی عدالتوں کا ہے۔ شرعی عدالتوں کے نام سے ملک کے مختلف مقامات پر جو دار القضاء قائم ہیں وہ دراصل اسلام کے عظیم الشان نظام قضاء کا منہ چڑھا رہے ہیں۔ عام ذہنوں میں ان عدالتوں نے اسلامی نظام عدل کا بڑا فرسودہ، مضمحل اور بے جان تصور پیدا کیا ہے۔ گویا اسلامی عدالت صرف نکاح و طلاق اور وراثت کے مسائل تک دسترس رکھتی ہے۔ عام لوگوں کو چند لمحے کے لئے یہ دھوکہ تو ہوتا ہی ہے کہ اس ملک میں شرعی عدالتیں موجود ہیں۔ شریعت کا نظام جاری و ساری ہے۔ نظام کفر کی جاہ و حشمت کے سائے میں مجبور و بے بس شرعی عدالتوں کا تصور ایک اجنبی خیال ہے، اسلام کی طویل تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ دراصل ادخلوا فی السلم کافۃ کا انکار ہے۔ اسلام اس بات کو کبھی پسند نہیں کرتا کہ زندگی کا کچھ حصہ اللہ کی اطاعت میں بسر ہو اور کچھ کفر کی اتباع میں۔

جب تک یہ شرعی عدالتیں مکمل اسلام کو اپنی کارگزاریوں کا ایجنڈا نہیں بناتیں تب تک ان کی شرعی حیثیت مشکوک رہے گی۔

امیرالہند

آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ اس ملک میں مسلمانوں کا کوئی امیر بھی موجود ہے۔ امیر الہند کی اصطلاح سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے لئے استعمال کی تھی۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کے خیال سے بڑی پرشور آواز کے ساتھ میدان میں آئے تھے لیکن اس پر خطر راستے کو چھوڑ کر بہت جلد وہ گاندھی کی قیادت کے اسیر ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد بھی گو کہ ان کے مداح انہیں امیر الہند کہنے سے باز نہ آئے لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ عملی اعتبار سے امیر الہند کا منصب جواہر لال نہرو کو مل چکا تھا۔ فی زمانہ بہت سے لوگ امیر الہند کے منصب پر اپنا دعویٰ برقرار رکھے ہوئے ہیں، یہ اور بات ہے کہ ان میں سے ہر کسی نے اپنا امیر کسی غیر مسلم سیاسی قائد کو بنایا ہوا ہے۔ اسی طرح کہنے کو خالص شرعی امارتیں بھی اس ملک میں قائم ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسی شرعی امارتیں ہیں جنہوں نے اپنی گردنوں پر نظام کفر کو مسلط کر رکھا ہے۔ اسلام کسی ایسی شرعی امارت سے واقف نہیں جس کے پاس کوئی قوت نافذہ نہ ہو اور جو خود اجتماعی زندگی میں کفار و مشرکین کی قیادت کو معتبر جانتی ہو یا اسے برضا و رغبت قبول کیے بیٹھی ہو۔ اسلام کا نظام امارت تو قائم ہی اس وقت ہوتا ہے جب کفر کا نظام زمیں بوس ہو چکا ہو۔ ایک ہی سرزمین پر بیک وقت امارت شرعیہ اور امارت کفریہ قائم نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ اسلام بیک وقت بہت سی امارتوں کا قائل نہیں۔ مسلمانوں میں کئی امارتیں وجود میں نہیں آسکتیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر دو لوگ امارت یا خلافت کی دوڑ میں ہوں تو جس کی بیعت پہلی قائم ہو گئی اسے ہی معتبر گردانا جائے گا۔ اگر دوسرا دعویدار پھر بھی اپنی خلافت پر اصرار کرے تو اس کی گردن ماردی جائے گی۔ "وَمَن بایع إماماً فأعطاهُ صفقة يدهٗ وثمرة قلبه فليطعه إن استطاع، فإن جاء آخر ينازعه فاضربوا عنق الآخر" (مسلم) دوسری جگہ آپ نے فرمایا "إذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخر منهما" عام آدمی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس ملک میں واقعی امیر الہند کون ہے؟ شرعی امیر کسے گردانا جائے اور کسے نہیں؟ کس کی امارت قائم ہو گئی ہے اور کون قابل گردن زدنی ہے؟ امارت

کے دعویدار تو بہت سے ہیں لیکن وجوب امارت کی سخت کسوٹی پر خود کو پرکھنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ امت کے اندر ایک خانہ جنگی کی سی کیفیت ہے۔ ہر امیر اپنے وجوب امارت کو صحیح مان کر دوسرے کی گردن ماردینا چاہتا ہے۔ ہر حلقہ دوسرے حلقے کا شاکی ہے، ہر شخص کو صرف اپنی تشریح و تعبیر کے سو فیصد صحیح ہونے پر اصرار ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ سب جھوٹی امارت کے جھوٹے دعویدار ہیں، ان میں سے کسی کی امارت سرے سے قائم ہی نہیں ہوئی ہے۔ اسلام کسی ایسی امارت سے واقف نہیں جو ہر آن ہر گلی کوچے سے ابلی پڑتی ہو اور نہ اسلام میں ایسے بہت سے امراء کی گنجائش ہے جو بھانت بھانت کی آواز لگاتے ہوئے ہر لمحے اپنے ظہور کی خبر دے رہے ہوں۔ اسلام میں امیر کی وحدت شرط ہے جو خلیفہ کی ذات تک محدود ہے بقیہ جتنی بھی امارتیں قائم ہوں گی ان کی حیثیت دراصل نیابت کی ہوگی لہٰذا جب تک خلیفہ ان امراء کو منظوری عطا نہ کرے ان کی امارت سرے سے قائم نہیں ہوتی خواہ یہ حضرات اپنی گردنوں میں امیرالہند یا امیر شریعت کی تختیاں ہی کیوں نہ لٹکالیں۔

سلسلہ بیعت اور دعوت وارشاد

نظام کفر میں اسلامی زندگی جینے کا مغالطہ پھیلانے میں روحانی پیر و فقیر بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ جسے دیکھئے لوگوں سے بیعت لے رہا ہے، مرید بنانے کی مہم زور وشور سے چل رہی ہے۔ یہاں بھی حصول آخرت کا نسخہ آسان ہے، نماز روزے سے لگے رہیئے اور اس پر چند اوراد و وظائف کا اضافہ کرلیجئے۔ یہ حضرات جنت کی گیارنٹی کچھ اس طرح دیتے ہیں جیسے بازاری حکیم شرطیہ علاج کا اشتہار شائع کراتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک بھر میں مختلف خانقاہوں اور درگاہوں میں کس بات کی بیعت لی جارہی ہے اور یہ کہ ان حضرات کو بیعت لینے کا اختیار کہاں سے حاصل ہوگیا ہے۔ اسلام میں بیعت کا تصور صرف رسول اللہ کی ذات گرامی کے لئے ہے۔ خلیفہ وقت آپ کے نائب کی حیثیت سے امت سے بیعت کا طالب ہوتا ہے۔ انعقاد بیعت کے بعد امت کی نگہبانی اور رسول اکرمؐ کے مشن کے لئے اس امت کو متحرک اور منظم رکھنے کا کام اس کے کندھے پر آپڑتا ہے۔ اسلام میں بیعت تو صرف ایک شخص کے لئے ہوسکتی ہے اس کے علاوہ جو لوگ بھی بیعت لیں گے وہ خلیفہ کی ایماء پر اس کے نائب کی حیثیت سے۔ اس کے علاوہ بیعت کے کسی اور تصور کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب گذشتہ ۸۴،

سالوں سے یہ امت خلیفۃ المسلمین سے محروم ہے تو پھر کس خلیفہ کی ایماء پر اور کس خلیفہ کی نیابت میں اتنے بہت سارے دعویدار لوگوں سے دھڑادھڑ بیعت لے رہے ہیں۔ خلیفہ کے غیاب میں اور نظام اسلامی کے انتشار کے عہد میں بے چین اور اور مضطرب مسلمان اگر کسی شخصیت سے عہدوپیمان کی قسم کھائیں تو اس کا جواز صرف اور صرف یہی ہوسکتا ہے کہ وہ نظام خلافت کے قیام کے لئے ایک منظم جدوجہد کریں گے۔ یہ بھی ایک عبوری مرحلہ ہوگا اسے دائمی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ رہے موجودہ دور کے بیعت باز سجادہ نشین اور گوشہ عافیت میں پناہ گزیں اصحاب کشف حضرات تو ان کے طرز عمل سے اس بات کا شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ حضرات خلافت اسلامی کے غیاب پر اپنے اندر کوئی بے چینی محسوس کرتے ہوں۔

دینی جماعتیں اور اسلامی زندگی

اسلامی زندگی کا تصور جماعت کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "من خلع یدا من طاعة الله لقی الله یوم القیامة لا حجة له، ومن مات ولیس فی عنقه بیعة مات میتة جاهلیة" (مسلم) اسلام ایک اجتماعی نظام زندگی کا طالب ہے جس کی باگ ڈور خلیفہ وقت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ خلیفہ وقت کو مرکز امت کی حیثیت حاصل ہے۔ پوری امت پر لازم ہے کہ وہ خلیفہ وقت کی نگرانی کو اور اس کی اطاعت کو کھلے دل سے قبول کرے کہ اگر مرکز امت سے اس کا تعلق ٹوٹ گیا تو اس کا اسلام مشتبہ ہوجاتا ہے۔ یہ اور اس قبیل کی احادیث جو امت کو ایک اور صرف ایک مرکز کے گرد مضبوطی سے جوڑے رکھنا چاہتی ہیں، عجب مقام افسوس ہے کہ انہی حدیثوں کا سہارا لے کر امت میں مختلف مراکز وجود میں آگئے ہیں۔ ہر جماعت یہ کہتی ہے کہ امیر کے بغیر اور جماعت کے بغیر کوئی اسلامی زندگی نہیں ہوسکتی اور چوں کہ امیر اور جماعت دونوں ہماری جماعت میں موجود ہیں اسلئے آؤ ہماری جماعت میں شامل ہوکر اسلامی زندگی جینے کا مزا لوٹو۔ اس طرح ہر جماعت اپنے جماعتی دائرے کو وسیع کرنے میں کوشاں ہے۔

یہ خیال ذہنوں سے محو ہوگیا ہے کہ اسلام جس امیر کو ہماری نگہبانی سونپنا چاہتا ہے وہ دراصل خلیفہ وقت کی ذات ہے اور جماعت سے مراد دراصل "الجماعة" یعنی رسول اللہ کی امت ہے جس کا کنٹرول پوری طرح خلیفہ وقت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور چوں کہ خلیفہ وقت رسولؐ کے غیاب میں نائب رسولؐ کی حیثیت سے امور امت کا نگراں اور محافظ ہوتا ہے اس لئے کسی مسلمان کے لئے یہ جائز

نہیں کہ وہ خلیفہ وقت کی اطاعت سے منہ موڑے، بصورت دیگر اس کا رشتہ رسول اکرمؐ کی امت سے کٹ جائے گا اور اگر اسی حالت میں اس کی موت آگئی تو اسے عالم جاہلیت میں مرنے والا شمار کیا جائے گا۔ حیرت ہے کہ اتنی سیدھی سی بات کو جو امت میں صرف اور صرف ایک مرکز کے قیام پر دال ہیں اسے بہت سی جماعتیں اور مراکز قیام کے لئے بطور حجت پیش کیا جارہا ہے۔

اولی الامر

الٰہی ہدایات کی روشنی میں رسول اکرم کے ذریعے جو معاشرہ وجود میں آیا تھا اس کی نگہبانی کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے اولی الامر کے ہاتھوں میں سونپا ہے اور اسے بڑے وسیع اختیارات دیئے ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الاَمْرِ مِنْکُمْ۔" (سورہ نساء، ۵۹) رسولؐ کے غیاب میں امور امت کی نگہبانی کا کام اولی الامر کے ہاتھوں میں منتقل ہوجاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰی اُولِی الاَمْرِ مِنْھُمْ" (سورہ نساء، ۸۳) نائب رسول کی حیثیت سے خلیفہ وقت اولی الامر کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس کی حیثیت صرف نگہبان امت کی نہیں ہوتی بلکہ رسول اکرمؐ کے الٰہی مشن کو اپنے عہد میں آگے بڑھانے کی ذمہ داری بھی تمام تر اس کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔ امت پر اسے وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہے اپنی سمجھ بوجھ اور مشاورت کے ذریعے الٰہی مشن کو آگے بڑھانے میں امت کی توانائی اور وسائل کو کام میں لائے، حتیٰ کہ کتاب و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے اگر وہ کوئی ایسا حکم بھی دے دے جس سے جمہور امت کو اتفاق نہ ہو، جب بھی امت پر لازم ہے کہ وہ اپنے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے خوشدلی کے ساتھ خلیفہ کے ابرو و اشارے پر حرکت میں آجائے۔ امت کے اندر کسی مسئلے پر نزاع پیدا ہوجائے اور کسی بارے میں دو یکساں معتبر رائے میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر سخت اختلاف ہوجائے تو ایسی صورت میں بھی خلیفۃ المسلمین کی رائے حتمی ہوگی۔ منصب اولی الامر کا تعلق قوت نافذہ سے ہے اور یہ صرف خلیفہ کی ذات میں پائی جاتی ہے۔ البتہ اگر خلیفہ چاہے تو بعض معاملات میں اہل الرائے کی کسی کمیٹی کو فیصلے کا اختیار سونپ سکتا ہے لیکن جب تک خلیفہ کی طرف سے کسی شخص یا کمیٹی کو اختیار تفویض نہیں ہوتا وہ بذات خود اولی الامر کے منصب پر فائز ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ حتیٰ کہ اجتماعی امور

میں اجتہادی مسائل کو بھی اعتبار اسی وقت ملے گا جب اس پر خلیفہ کے دستخط ثبت ہو چکے ہوں۔ رہے ہمارے عہد کے خودساختہ اولی الامر جو ہر لمحہ مصالح امت کے نام پر رسول اکرمؐ کے انقلابی ایجنڈے کو منجمد کیے دینے پر مصر ہیں تو انہیں جاننا چاہیے کہ ان سے زیادہ مصالح امت کا علم اللہ اور اس کے رسولؐ کو ہے اور اس کے بعد صرف خلیفہ وقت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مصالح امت کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کرے۔ رہی یہ بات کہ ہر ہما شما کو اولی الامر تسلیم کر لیا جائے تو اسلامی شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی اور نہ ہی تاریخ اسلامی میں اس کی کوئی نظیر موجود ہے۔

ترجیحات کا غلط تعین

ہمارے عہد میں بعض جماعتیں صرف اس فکر میں پریشان ہوئی جاتی ہیں کہ اس ملک میں انسانوں کی ایک بڑی آبادی جہنم کی راہ پر گامزن ہے۔ غافلوں تک دین کی دعوت نہیں پہنچ سکی ہے مبادا قیامت کے روز وہ ہم جنت کے راہیوں کا دامن پکڑ لیں اور ہماری جنت گرفت میں آتے آتے پھسل جائے۔ بعض لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں لٹریچر کی اشاعت اور دعوت تبلیغ سے نظام اسلامی کے قیام کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔ ہمارے خیال میں اگر اس ملک میں انسانوں کی ایک بڑی آبادی الٰہی پیغام سے غافل ہے تو یہ بحیثیت مسلمان ہمارے لئے ایک ذاتی درد سے کہیں زیادہ اجتماعی نوعیت کا مسئلہ ہے اور اس لئے اس کا Response بھی اجتماعی ہونا چاہیے۔ پھر یہ بات بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو کہ اس وقت جب امت زوال اور انتشار کے دور سے گزر رہی ہے، جب اس کا اپنا گھر آرڈر میں نہیں ہے، بنیادی اسلامی ادارے ٹوٹ پھوٹ کر منتشر ہو چکے ہیں ایسی حالت میں سب سے پہلے اس کام کو ترجیح دی جائے گی جس سے امت کے قافلے کو از سر نو منظم کرنے میں مدد مل سکے۔ اس فکر میں گھلے جانا کہ اس ملک کی کثیر آبادی تک توحید کی دعوت نہیں پہنچی ہے سرے سے انفرادی درد سر ہے ہی نہیں، یہ تو خلیفہ کا درد سر ہے کہ وہ اپنے عہد کی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے امت مسلمہ کے لئے ترجیحات طے کرے جو یقیناً کتاب و سنت کی طرف سے طے کردہ ترجیحات کے تابع ہوں گی۔ ذرا غور کیجیے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت کیا ایسے لوگوں کی کمی تھی جنہیں پیغام ربانی کی ہوا بھی نہ لگی تھی لیکن تب بھی آپ پیغام رسائی کی شہادت لے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس دعوت کی توسیع کا مزید کام آپؐ نے اپنی امت کو سونپا اور اس اطمینان کے ساتھ دنیا سے تشریف لے گئے کہ آپ کا مشن مکمل ہو چکا ہے۔

آپؐ کے وصال کے بعد صحابہ کرام نے سب سے پہلا کام خلیفہ رسولؐ کے انتخاب کا کیا۔ آپ کی تدفین میں تاخیر کو روا رکھا گیا لیکن یہ بات برداشت نہ کی گئی کہ امت خلیفہ یا امیر کی سرپرستی سے خالی رہے۔ صحابہ کرام کو معلوم تھا کہ اگر امت کا مرکز کھو گیا تو اسلامی ایجنڈے کو آگے بڑھانے اور غافل انسانوں تک الٰہی پیغام پہنچانے کا کام رک جائے گا پھر جس کسی کو جو کچھ سمجھ آئے گا وہ اسے اہم ترین اسلامی ایجنڈہ سمجھ کر عمل کے لئے اٹھ کھڑا ہوگا۔ لوگ اپنے ارادوں میں خواہ کتنے ہی مخلص ہوں اور کتنے ہی اچھے کام لے کر کیوں نہ آگے بڑھ رہے ہوں، یہ صورت حال ایک انتشار پر منتج ہوگی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بعد جس اولی الامر کی طرف مسلمانوں کو رجوع ہونا ہے اس کا غیاب سخت انتشار کو جنم دے گا۔ اس لئے صحابہ کرام نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آپؐ کے وصال سے اولی الامر کا جو منصب خالی ہوگیا تھا اسے فوری طور پر پر کرنے کے لئے بنو ثقیف میں جمع ہوگئے۔ وہاں سرے سے یہ مسئلہ زیر بحث نہ آیا کہ ابھی جزیرۃ العرب کے اطراف میں غافل انسانوں کا سمندر موجود ہے اور یہ کہ ہم سب لوگوں کو اسلام کا پیغام لے کر مختلف سمتوں میں نکل جانا چاہئے بلکہ ہوا یہ کہ ایک شخص کے کاندھے پر امارت کی ذمہ داری ڈال کر اس سے یہ کہا گیا کہ ہم سمع و طاعت کے جذبے سے آپ کا ہر حکم ماننے کے لئے تیار ہیں۔

فی زمانہ اگر امت مختلف محاذ پر شکستوں سے دوچار ہے، اگر اس ملک میں ایک بڑی آبادی غفلت کی زندگی گزار رہی ہے تو ایسا اس لئے ہے کہ خلیفۃ المسلمین کے غیاب کی وجہ سے اسلامی ایجنڈے کو بروئے کار لانے والی کوئی مؤثر قوت موجود نہیں۔ آپ کو غافل انسانوں کا خیال تو اس قدر پریشان کئے دیتا ہے لیکن آپ اس حقیقت کو بھلائے دیتے ہیں کہ خلیفہ کی موجودگی کے بغیر آپ ایک معصیت بھری زندگی گزار رہے ہیں۔ صحابہ کرام اور بعد کے فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ خلافت کی کرسی تین دن سے زیادہ خالی نہیں چھوڑی جاسکتی اور مستند حدیثوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جو لوگ اس حالت میں موت کی طرف اپنے قدم بڑھا رہے ہیں کہ ان کے ہاتھ خلیفہ کی بیعت سے خالی ہیں تو دراصل وہ عالم جاہلیت میں مرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ کرنے کا سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ مرکز امت کو جلد از جلد تشکیل دیا جائے۔ بلا تاخیر خلیفہ کو ڈھونڈ نکالا جائے اس کے بعد یہ خلیفہ کا کام ہے کہ وہ اس دنیا کو اور دنیا کے باسیوں کو الٰہی ہدایات سے آشنا کرنے کے لئے مؤثر اقدامات کرے ورنہ بھلا جو لوگ خود نظام کفر کی معصیت میں لت پت ہوں وہ غافل انسانوں کے لئے کیا کر پائیں گے۔

ہندوستان میں اسلامی اور غیر اسلامی ایجنڈے کی جنگ

کون کس طرف ہے؟

فی زمانہ ہندوستانی مسلمان سخت ذہنی تشنج سے دوچار ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی منزل کھوئی گئی ہو، جیسے وہ ایک اندھی گلی میں پھنس گئے ہوں جہاں سے آگے نکلنا ممکن نہ ہو۔ علماء و دانشور ہوں یا عام سوجھ بوجھ والا مسلمان، ہر کوئی اس احساس سے دوچار ہے کہ اس کی ملی زندگی کا سفینہ رفتہ رفتہ ڈوبتا جارہا ہے۔ پوری امت اس وقت ایک ایسی کیفیت سے دوچار ہے جو کسی بحری سفر میں ان مسافروں پر گزرتی ہے جن کی کشتی میں سوراخ ہوگیا ہو اور جو دیر یا سویر اپنے ڈوب جانے کا انتظار کر رہے ہوں۔ مایوسی کے اس گرداب میں گاہے بگاہے اگر امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے اور کسی گوشے سے کوئی زندگی افزا بات سننے میں آتی ہے تو عام لوگ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اس ملک میں یہ سب باتیں قابل عمل نہیں۔ گویا ان حضرات کے نزدیک کسی لائحہ عمل کی صداقت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان کے اپنے ذہنی سانچے میں قابل عمل بھی دکھائی دیتا ہو اور قابل عمل کی تعریف عام ذہنوں میں یہ ہے کہ ایک ایسا منصوبہ جس کے نتائج آسانی سے برآمد ہوتے ہوں اور جس میں کوئی خطرہ اور کوئی مہم جوئی نہ پائی جاتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ پچاس برسوں سے ہندوستانی مسلمان اصل اسلامی ایجنڈے کو چھوڑ کر ان غیر اسلامی ایجنڈوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں جس میں بظاہر تو زندگی کے تحفظ کی ضمانت دکھائی دیتی ہے لیکن در حقیقت ان میں زندگی سے کہیں زیادہ موت کا سامان ہے۔

ذرا غور کیجئے! اگر آپ کلکتہ جانے کے ارادے سے اسٹیشن پر پہنچے ہوں اور آپ کو یہ معلوم ہو کہ کلکتہ جانے والی ٹرین میں نشستوں کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے، پھر یہ بھی اطلاع ملے کہ اس راستے پر بعض حادثے کی وجہ سے اس ٹرین کا وقت پر چلنا ممکن نہیں۔ پتہ نہیں یہ ٹرین کب تک چلے؟ البتہ اسی

دوران پلیٹ فارم کی دوسری جانب ایک ٹرین مدراس جانے کے لئے تیار کھڑی ہو اور اس میں نشستیں بھی خالی ہوں، اسباب سفر بھی مہیا ہو اور سفر کے خوشگوار گزرنے کا بھی امکان پایا جاتا ہو تو کیا آپ صرف اس لئے مدراس کی ٹرین میں سوار ہو جائیں گے کہ کلکتہ کا سفر فی الحال ایک ناقابل عمل سوال ہے، ایک تھکا دینے والی مہم جوئی ہے پھر کیوں نہ اس ٹرین میں بیٹھ لیا جائے جو بس اب چلا ہی چاہتی ہے ۔ہمارے خیال میں کوئی صحیح الدماغ شخص اپنی زندگی کے اہم موڑ پر فیصلہ کرتے وقت صرف یہ نہیں دیکھتا کہ مشکل کیا ہے اور آسان کیا؟ کیا قابل عمل ہے اور کیا ناقابل عمل؟ بلکہ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے متعین کردہ اہداف کو حاصل کرے اور اس مقصد کی خاطر وہ ایک آرام دہ سفر کو چھوڑ کر ایک ایسا مشکل سفر اختیار کرتا ہے جو اسے منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہو۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی ملی و اجتماعی زندگی میں ہمیشہ ایک ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں کوئی مہم جوئی ہو اور نہ ہی کوئی خطرہ ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پوری امت مخالف سمتوں میں صرف اس لئے سفر کر رہی ہے کہ یہ سب اسے قابل عمل معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے مدراس جانے والی آرام دہ گاڑی میں بیٹھ کر آپ خود کو سفر کا دھوکہ تو دے سکتے ہیں البتہ کلکتہ کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

کہا جاتا ہے کہ اس ملک کو دوبارہ دارالاسلام بنایا جانا ممکن نہیں کہ ہم تعداد میں تھوڑے ہیں، ہماری حیثیت اقلیت کی ہے پھر یہ کہ یہ ایک سیکولر ملک ہے ،یہاں اس طرح کی باتیں کرنا مصلحت کے خلاف ہے ،حکمت سے پرے ہے۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کے لئے اپنی اجتماعی زندگی کو اسلامی اصولوں پر منظم کرنا اور پوری زندگی کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں گزارنا بنیادی ایمان کا حصہ ہے تو یہ سب کچھ اصولی طور پر تو صحیح ہے لیکن بات یہ ہے کہ یہ ایک سیکولر ملک ہے، یہاں کا دستور اساسی سیکولر ہے اس لئے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں اس طرح کی باتیں کرنا مناسب نہیں۔ رہا اس ملک کو دوبارہ دارالاسلام بنائے جانے کی دینی ذمہ داری جو ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے تو یہ بات بھی اصولی طور پر صحیح ہونے کے باوجود ناقابل عمل ہے، مصلحت کے خلاف ہے ،مصالح امت اس کی اجازت نہیں دیتے اس لئے ہمیں اس طرح کی باتیں نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ ہمارے بعض معتبر بزرگ تو اب برملا یہ کہنے لگے ہیں کہ اس ملک میں سیکولرازم اور ڈیموکریسی کا نظام ایک الہامی بات ہے اور یہ کہ اس ملک کا مستقبل سیکولرازم ،ڈیموکریسی اور عدم تشدد کے ارکان ثلاثہ سے وابستہ ہے۔ جب دین اور شریعت کا علم رکھنے والے لوگ

ایک غیر اسلامی نظام زندگی کو معتبر ٹھہرانے لگیں تو سمجھئے پانی سر سے اونچا ہوگیا ہے۔ اب اس بات کے انتظار میں وقت نہیں گنوایا جاسکتا کہ کسی جانب سے کوئی مرد درویش اٹھے اور ہمارے بھٹکے ہوئے قافلے کو سوئے حرم لے چلنے کی تیاری کرے۔ بلکہ ایسی نازک صورت حال میں ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی توفیق کے مطابق اس ڈوبتی کشتی کو بچانے کی فکر ضرور کرے۔

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے رسولؐ کی اتباع کا معاشرہ قائم کرنے کی کوئی تحریک نہ تو اب تک کامیابی سے ہمکنار ہوسکی ہے اور نہ شاید آئندہ ہوگی۔ ہر شخص کے ذہن میں اس مفروضہ ناکامی کی اپنی اپنی توضیح ہے۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں اس لئے اس ملک کو امام عادل کی اتباع کے لئے ہموار کرنا ایک ناقابل عمل خیال ہے۔ دین کے حوالے سے گاہے بگاہے جو سرگرمیاں نظر آتی ہیں اسے بعض لوگ دراصل نظام اسلامی کے قیام کی کوشش سمجھتے ہیں اور چونکہ ان کوششوں کے نتیجے میں اب تک کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی اس لئے وہ یہ سوچ کر مایوسی کا شکار ہوجاتے ہیں کہ جب اتنی بہت سی دینی چلت پھرت، کشف و مجاہدے، چلے اور تقاریر، درس قرآن اور تزکیہ نفس سے کچھ نہ ہوسکا اور جب بھاری بھرکم دینی شخصیات اور دینی اداروں نے موجودہ نظام کو ہی تسلیم کرلیا ہے تو یقیناً شریعت کا منشاء بھی یہی ہوگا۔ پھر وہ کیوں نہ نماز، روزے اور ذکر و ثواب کے ذریعے اپنی عاقبت کی فکر کریں۔ آخر اس فکر میں گھلے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ اللہ کا دین مغلوب ہے اور آخری رسولؐ کی امت پر ذلت کا دردناک عذاب طاری ہے۔ جب بڑے بڑے اہل شریعت اور متفکرین امت اپنی اپنی عاقبت کی فکر میں رات دن اذکار و وظائف میں مصروف ہوں، دونوں ہاتھوں سے ثواب اکٹھا کر رہے ہوں تو پھر عام مسلمان کو کیا پڑی ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کے منتشر ہوجانے پر مضطرب اور پریشان ہو۔

ہمارے فکر و نظر میں کچھ اس تیزی سے زوال آیا ہے کہ اب دینی شعور رکھنے والے حضرات کو بھی اس بات پر مشکل سے یقین آتا ہے کہ رسول اکرم کا زیر اہتمام (Unfinished) ایجنڈہ ہمارے ہاتھوں انجام پانا ہے اور یہ کہ اللہ کا دین کسی خاص ملک، کسی خاص زمانہ یا کسی خاص قوم کے لئے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ ہر دور میں اور ہر سرزمین پر اہل ایمان پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اہل زمین کو اہل زمین کی بندگی سے نکال کر الٰہ واحد کی بندگی میں لانے کی کوشش کریں۔ یہاں تک کہ پوری دنیا میں اللہ

کا کلمہ بلند ہو اور اس کی شریعت تمام زمینی شریعتوں پر سبقت حاصل کرلے خواہ ایسا کرنا ممکن ہو یا ناممکن، قابل عمل ہو یا ناقابل عمل، مصالح امت اس کے حق میں ہو یا اس کے خلاف اور خواہ کفار و مشرکین کو یہ سب کچھ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے، اہل ایمان پر لازم ہے کہ وہ ہر صورت میں اپنی ساری توانائیاں اس عمل میں جھونک دیں۔ اسلام تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ حق کیا ہے؟ حق کے تعین میں کبھی یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ اہل زمین کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں؟ حق اگر حق ہے تو اسے ہر صورت میں نافذ ہونا چاہئے۔ رہی یہ بات کہ مصالح امت کیا ہے؟ تو امت کے مصالح کو اللہ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے، جس نے اپنے پیارے رسولؐ کو ایک ایسا انقلابی پیغام دے کر بھیجا ہے جس کی مخالفت پر کل بھی کفار و مشرکین کمربستہ تھے اور یقیناً آج بھی ہوں گے۔

چوں کہ عام ذہنوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اس ملک کو اسلامیانے کی ساری کوششیں اب تک ناکام ہوئی ہیں۔ مولانا محمد علی کی تحریک خلافت، مولانا آزاد کا حزب اللہ، مولانا حسین احمد مدنی کی روحانی فیوض و برکات اور بے شمار دردمند مسلمانوں کی شب و روز جدوجہد کے باوجود اس ملک کو دوبارہ اسلامی صبح دیکھنے کو نہیں ملی، اور بھلا جب اتنی قدآور شخصیتوں نے اس مہم جوئی سے تنگ آکر سیکولرازم اور جمہوریت کے دامن میں پناہ لی ہو تو یقیناً اس نظام میں اسلام اور مسلمانوں کی فلاح کا سامان پایا جاتا ہوگا۔ پھر منقسم ہندوستان میں گذشتہ پچاس برسوں میں مسلمان نچلے نہیں بیٹھے ہیں۔ مسلمانوں کی انجمنیں، دینی ادارے اور معتبر شخصیات مستقل کچھ نہ کچھ کرتے رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پر مسلسل غور و فکر ہوتا رہا ہے، مشاورت ہوتی رہی ہے اور اسی ملک میں دین اور شریعت کے تحفظ کے لئے مسلمان مشترکہ اور متحدہ جدوجہد میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔ پھر بھی اگر اس ملک میں دوبارہ نئی صبح کے طلوع کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ابھی فضا کسی ایسے کام کے لئے تیار نہیں ہے، لہٰذا فوری طور پر اسلامی ایجنڈے کو مؤخر کیا جائے، اس ملک کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کا خواب ترک کردیا جائے، مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور سیاسی صف بندی کے خیال کو دل سے نکال دیا جائے اور کم از کم کچھ دنوں تک تو اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی بات ہرگز نہ کی جائے، مبادا اس قسم کی انتہاپسندانہ باتوں سے غیر مسلم قوموں کا دل دکھے اور خواہ مخواہ کی غلط فہمیاں جنم لیں۔ یہی ہے وہ مقبول فکر جو عام طور پر جمہور مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ عام مسلمان یہ محسوس تو کرتا ہے کہ

اس ملک میں وہ جس راستے پر چل رہا ہے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا بتایا ہوا راستہ نہیں ہے، لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ بڑی بڑی دینی شخصیات اور شارحین شریعت خوشی خوشی اسی راستے پر گامزن ہیں تو اسے ایک لمحے کے لئے اپنی فہم پر دھوکہ ہوتا ہے۔ سوچتا ہے کیا پتہ ہندوستان کی مخصوص صورت حال میں شریعت کی ترجیح سیکولر ڈیموکریسی کا قیام ہو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بات کا پتہ چلایا جائے کہ آخر اسلامی ایجنڈے کو اس ملک میں خاطر خواہ کامیابی کیوں نہیں حاصل ہورہی ہے؟ پھر اس بات کا بھی جائزہ لیا جائے کہ آخر وہ کون سے عوامل ہیں جس نے اس ملک میں اسلامی ایجنڈے کو ناقابل عمل خیال بناکر رکھ دیا ہے۔ ہمارے باشعور لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کا درد بھی دے رکھا ہے، آخر وہ اسلامی ایجنڈے کو اس ملک میں منجمد کیے جانے پر خود کو کیوں مجبور پاتے ہیں؟ پھر اس بات کا بھی حساب کتاب لگایا جائے کہ اس ملک میں اسلامی ایجنڈے کو بروئے کار لانے کے لئے اب تک کتنی قوت صرف ہوتی رہی ہے اور اس کے نتائج اگر خاطر خواہ نہیں نکلے تو ایسا کیوں ہے؟ پھر ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ ہم جس جدوجہد کو دینی اور اسلامی جدوجہد سمجھتے رہے ہیں وہ واقعی شریعت کی کسوٹی پر دینی قرار پاتی ہے یا نہیں؟

اسلامی ایجنڈہ

آیئے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ ہم جسے اسلامی ایجنڈہ کہتے ہیں وہ ہے کیا؟ یہ ہمارے اپنے ذہن کی اپج ہے یا اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطالبہ۔ سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام مسلمانوں سے ایک اجتماعی اسلامی نظام کی تشکیل کا طالب ہے۔ امیر کے بغیر اسلامی زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ ایک ایسا امیر جو امت کے امور کا نگہباں ہو اور جو اسے ایک اجتماعی نظام عدل میں منظم رکھ سکے۔ پھر اس امیر کی نگرانی میں امت اپنے اصل فریضے یعنی دعوت الی الحق پر مامور ہوتی ہے۔ ہندوستان ہو یا دنیا کا کوئی اور خطہ، مسلمان اس بات کے سزاوار ہیں کہ وہ جہاں بھی ہوں اپنی اجتماعی زندگی کو منظم کریں اور وہاں کتاب وسنت کی بنیاد پر انسانی معاشرہ تشکیل دیں۔ یعنی مدینے کی چھوٹی سی اسلامی ریاست جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں قائم ہوئی تھی اور جس کا سیاسی شیرازہ ان دنوں منتشر ہے اسے دوبارہ قائم کرنا اور اس کی فکری اور جغرافیائی سرحدوں کو مسلسل وسعت دیتے رہنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ رہے وہ

ممالک جو کبھی خلافت کا حصہ رہ چکے ہوں تو اس بارے میں فقہاء کا اجماع ہے کہ کسی سابق دارالاسلام میں مسلمانوں کے لئے صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ اسے دوبارہ دارالاسلام بنانے کی جدوجہد کریں۔ گویا ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے کرنے کا کوئی کام ہے تو یہ کہ اس ملک کے اجتماعی نظام زندگی کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی شریعت کے مطابق منظم کریں۔ اس ملک کے باشندوں کو انسانی قوانین اور جمہوری استبداد سے نجات دلائیں، اللہ کی شریعت کے علاوہ ساری شریعتوں کا خاتمہ ہو اور ایک ایسی صورت حال پیدا ہو جس کے بارے میں کہا جاسکے "کلمۃ اللہ ھی العلیا"

یہ ہے وہ اسلامی ایجنڈہ جس کے مطالب و مفہوم سے کسی کو اختلاف کی جرات نہیں ہوسکتی۔ شریعت کی رو سے دنیا دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک کو دارالاسلام اور دوسرے کو دارالکفر یا دارالحرب کہتے ہیں۔ بقیہ دار کی جتنی قسمیں ہیں وہ سب ان ہی زمروں میں آتی ہیں۔ ہم جس سرزمین پر رہ رہے ہیں وہ یا تو دارالاسلام ہوگی یا دارالکفر۔ شریعت کی رو سے مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں کہ وہ دارالکفر میں دائمی سکونت اختیار کرلیں اور نہ ہی اسلام دارالکفر کی دائمی حیثیت کو پسند کرتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے دارالکفر میں رہنے کا اگر جواز ہے تو صرف یہ کہ وہ اسے ہر لمحہ دارالاسلام بنانے کی جدوجہد جاری رکھیں۔ یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ محض مسلم آبادی کی اکثریت پر دارالاسلام کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے لازم ہے کہ اللہ کی شریعت اس سرزمین پر نافذ ہو۔ مسلم اقلیت کا ایک ملک دارالاسلام ہوسکتا ہے اور مسلم اکثریت کا ملک دارالکفر کہا جاسکتا ہے اس لئے کہ جو چیز دارالاسلام کو دارالکفر سے ممیز کرتی ہے وہ شریعت کا نفاذ ہے مسلمانوں کی کثرت تعداد نہیں۔ شریعت کی اس کسوٹی پر ہندوستان اور پاکستان دونوں دارالکفر قرار پاتے ہیں اس لئے کہ وہاں بھی اللہ کی شریعت انسانوں کی شریعت کے تابع ہے اور یہاں بھی اس کا وہی حال ہے، اس لئے اقلیت اور اکثریت کی بحث سے قطع نظر ان دونوں خطوں کے مسلمانوں سے شریعت کا ایک ہی مطالبہ ہے کہ وہ اس دارالکفر کو دارالاسلام بنانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

غیر اسلامی ایجنڈہ

انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے دور لے جانے والے جتنے بھی منصوبے ہیں وہ سب غیر اسلامی ایجنڈے کا حصہ قرار پاتے ہیں۔ ہمارے عہد میں غیر اسلامی نظام

زندگی کی بہت سی شکلیں سامنے آئی ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں لیکن ایک نکتے پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی بندگی سے نکال کر لوگوں کو ہوا و ہوس کی بندگی پر لگایا جائے۔ سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت، آمریت ہو یا جمہوریت، سیکولرازم ہو یا سوشل ازم، وطن پرستی ہو یا نسل پرستی یہ سب کی سب جدید کفر کی مختلف شکلیں ہیں۔ شریعت کی رو سے یہ سب گمرہی کے راستے ہیں جن کو اختیار کرنا یا ان کی طرف دعوت دینا ارتکاب کفر کے مترادف ہے۔ اسلام سرے سے جمہوریت کی نفی کرتا ہے اس لئے کہ جمہوریت بندوں پر بندوں کی حکمرانی کا اعلامیہ ہے جب کہ اسلام بندوں پر الٰہ واحد کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ جمہوری نظام انسانی شریعت کے سہارے چلتی ہے جب کہ اسلام انسانی شریعت کو یکسر رد کرتے ہوئے صرف آسمانی شریعت کے نفوذ کا طالب ہے۔ جمہوریت ایک غیر اسلامی نظریہ ہے۔ ایک مسلمان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اس کی طرف دعوت دے یا اس کے استحکام میں اپنا سر کھپائے۔ اسی طرح سیکولرازم ایک اجنبی خیال ہے جو اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ دین کے معاملات کو دنیا سے نہ ملائیں، اللہ کی شریعت کو مسجد کی چہار دیواریوں تک محدود رکھیں اور مسجد کے باہر انسانی شریعت کے مطابق کاروبار زندگی کو چلنے دیں۔ شریعت کے نقطہ نظر سے اجتماعی زندگی سے الٰہی شریعت کو بے دخل کر دینا اور اس کی جگہ ایک انسانی شریعت کو قبول کر لینا جرم عظیم ہے۔ یہ ایک واضح اور صریح کفر کا ارتکاب کرنا ہے۔ جو لوگ سیکولرازم کے استحکام کے لئے کام کرتے ہیں وہ گویا صریح کفر کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ دنیا میں دوسرے جتنے بھی ازم ہیں ان کا وجود اس بات سے عبارت ہے کہ اللہ کی شریعت قابل قبول نہیں ہے ورنہ ایک الٰہی شریعت کی موجودگی میں ان بہت سی شیطانی شریعتوں کے ایجاد کی ضرورت ہی کیوں ہوتی؟

چوں کہ ہمارے عہد میں نظام کفر کے علمبردار کفر کی دعوت کے لئے نئے نئے دلکش قالب اور خوش کن اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اس لئے عام لوگوں کو اکثر یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ نظام کفر کے قیام کی دعوت نہیں بلکہ اعلیٰ انسانی اقدار کے معاشرے کے قیام کی دعوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں بہت سے دردمند لوگ جمہوریت، سیکولرازم، انسانی حقوق، عدم تشدد اور حب الوطنی جیسی اصطلاحوں سے اس دھوکے میں آگئے ہیں کہ شاید وہ ان نظریات کی تبلیغ کے ذریعے مستقبل کے اسلامی انقلاب کا راستہ ہموار کر رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے تمام لوگ کفر اور نظام کفر

کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں۔

اس بات کی تفہیم کے لئے ہم آپ کی خدمت میں صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جس سے آپ کو بہت حد تک اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے چوٹی کے مفکرین کی رہنمائی اللہ کے ارشاد سے کتنی مختلف اور متضاد ہے۔

ہمارے اہل فکر کے فرمودات	اللہ کا ارشاد
☐ "جمہوریہ ہند کے سیکولر دستور میں تمام فرقوں اور قوموں کے مذہب اور کلچر اور عقیدہ کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس دستور کی نظر میں ملک کے مختلف فرقے اور آبادی کے مختلف العقیدہ عناصر برابر ہیں یہ دستور ایک ایسے ملک کیلئے جہاں متعدد قومیں، مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے لوگ رہتے ہیں موزوں ترین دستور ہے۔" مولانا ابوالحسن علی ندوی (ہندوستانی مسلمان ص ۱۸۶) ☐ "اس ملک کی بقا کے لئے یہاں کے بزرگوں نے اس کو ضروری سمجھا کہ یہ ملک جمہوری، نامذہبی اور غیر متشدد ہو یہ طے کرنا ایک الہامی بات تھی۔" مولانا ابوالحسن علی ندوی (بحوالہ تعمیر حیات، قومی آواز) ☐ "جمہوریت کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، اب ساری دنیا نے جمہوری نظام کو ضروری سمجھ لیا ہے۔" مولانا ابوالحسن علی ندوی (بحوالہ کاروان زندگی)	☐ "کیا تم ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جن کا دعوی تو یہ ہے کہ وہ ان ہدایات میں یقین رکھتے ہیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہیں اور جو ان سے پہلے لوگوں پر اتری ہیں۔ البتہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے امور کا فیصلہ نظام طاغوت کے مطابق کیا جائے حالانکہ انہیں ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں گمراہی میں دور بہت دور لے جائے۔" (النساء۔۶۰)

قرآن کا تو اصرار یہ ہے کہ مسلمان اپنے امور کا فیصلہ نظام طاغوت کے مطابق ہرگز انجام نہ دیں اور اپنی زندگی کو ان آسمانی ہدایات کی روشنی میں منظم کریں جو ان کی طرف اتاری گئی ہیں، لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی فکری قیادت ببانگ دہل اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ ہندوستان جیسے بین الملی ملک میں مروجہ دستور حیات ہی موزوں ترین دستور ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بات کہی جارہی ہے کہ اس ملک کا نامذہبی اور جمہوری ہونا ایک الہامی بات ہے۔ بلکہ وہ جمہوریت جیسے غیر اسلامی تصور کی چھان پھٹک کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی، صرف اس لئے کہ بقول اس کے اب ساری دنیا

نے جمہوری نظام کو ضروری سمجھ لیا ہے۔ جمہوریت ہو یا سیکولرازم یا اجتماعی زندگی کا کوئی اور سیاسی فلسفہ، قرآن کی نظر میں یہ سب نظام طاغوت کی مختلف شکلیں ہیں۔ پھر ہمارے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ان کافرانہ نظریات کو قبولیت کی سند عطا کریں۔ اس طرح کے فکری انحراف سے ہندوستانی مسلمانوں کی گذشتہ پچاس سالہ تاریخ بھری پڑی ہے۔ ہم نے مثال کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کے سب سے معتبر عالم کو اس لئے منتخب کیا ہے کہ آپ کی ذات مسلمانوں کے تقریباً تمام حلقوں میں یکساں محترم اور معتبر ہے اور عام مسلمان رہنمائی کے لئے آپ کی طرف دیکھتے ہیں۔ جب ہمارے منارہ قیادت کا یہ حال ہو کہ وہ نظام اسلامی کے قیام کے بجائے نظام طاغوت کی مروجہ شکل کو معتبر ٹھہراتا ہو، اسے ایک الہامی بات گردانتا ہو تو عام مسلمان اس جمہوری تماشے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہوں تو کچھ عجب نہیں۔

اس ملک میں جو معرکہ درپیش ہے وہ دراصل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایجنڈے اور کفار و مشرکین کے ایجنڈے کے درمیان ہے۔ کفار و مشرکین چاہتے ہیں کہ ان کی بنائی ہوئی شریعت جمہور اس ملک میں استحکام حاصل کرلے، یہ خیال کہ الٰہی شریعت کے مطابق اجتماعی زندگی کے امور فیصل کئے جاسکتے ہیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ جب کہ اس کے برعکس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایجنڈا اس بات کا طالب ہے کہ اس ملک پر شریعت کو بالادستی حاصل ہو، امام عادل کی قیادت میں اس ملک کے امور انجام پائیں اور پچیس کروڑ اہل ایمان جو ایک غیر اسلامی نظام کے تحت اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، وہ ایک عالمی نظام اسلامی کا حصہ بن سکیں۔ دیکھا جائے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایجنڈا ہندوستان کے سیکولر، جمہوری ایجنڈے سے براہ راست ٹکراتا ہے۔ البتہ ہمارے لئے حیرت اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تقریباً تمام قابل ذکر دینی جماعتیں اور با اثر مذہبی شخصیات باستثناء چند، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایجنڈے سے منہ موڑ کر کفار و مشرکین کے ایجنڈے کو بروئے کار لانے میں اپنی تمام تر قوت ضایع کر رہی ہیں۔

جدھر دیکھئے سیکولر قدروں کی بحالی اور جمہوری نظام کے استحکام کا غلغلہ بلند ہے۔ سیاسی مسلمان اور دین سے نابلد لوگوں پر ہی بس نہیں، ہندوستانی مسلمانوں کی شاید ہی کوئی قابل ذکر انجمن ہو جو جمہوریت کے استحکام کا راگ نہ الاپ رہی ہو۔ اگر آپ کو ہندوستانی مسلمانوں کی بے سمتی اور خالی الدماغی

ہندوستانی جمہوریت کی بقاء کے لئے

ملّت کے ووٹروں سے اپیل

اپیل

اپیل

بہوجن سماج پارٹی

آل انڈیا ملی کونسل

اپنے ووٹ کی طاقت کے ذریعہ وطن کو استحکام بخشیں اور ... پُروقار جائز دستوری مقام حاصل کریں

غفلت نہ برتیں، ووٹ ڈالیں

ائمہ مساجد سے التماس	کہ وہ اس نازک اور اہم مرحلہ پر اپنے اجتماعات اور جمعہ کے خطبے میں عوام کی توجہ ووٹ ڈالنے پر مبذول کرائیں کہ وہ غریب ناخواندہ طبقوں پر خصوصی توجہ دیں کیونکہ ملت کا بڑا حصہ انہی ووٹروں پر مشتمل ہے۔ کہ وہ اس اشتہار کو مفاد عامہ کی غرض سے اپنی مساجد میں نمایاں مقام پر آویزاں فرمائیں

زاہد علی خاں
چیف ایڈیٹر سیاست

خاں لطیف خاں
چیف ایڈیٹر منصف

سید وقارالدین
چیف ایڈیٹر رہنمائے دکن

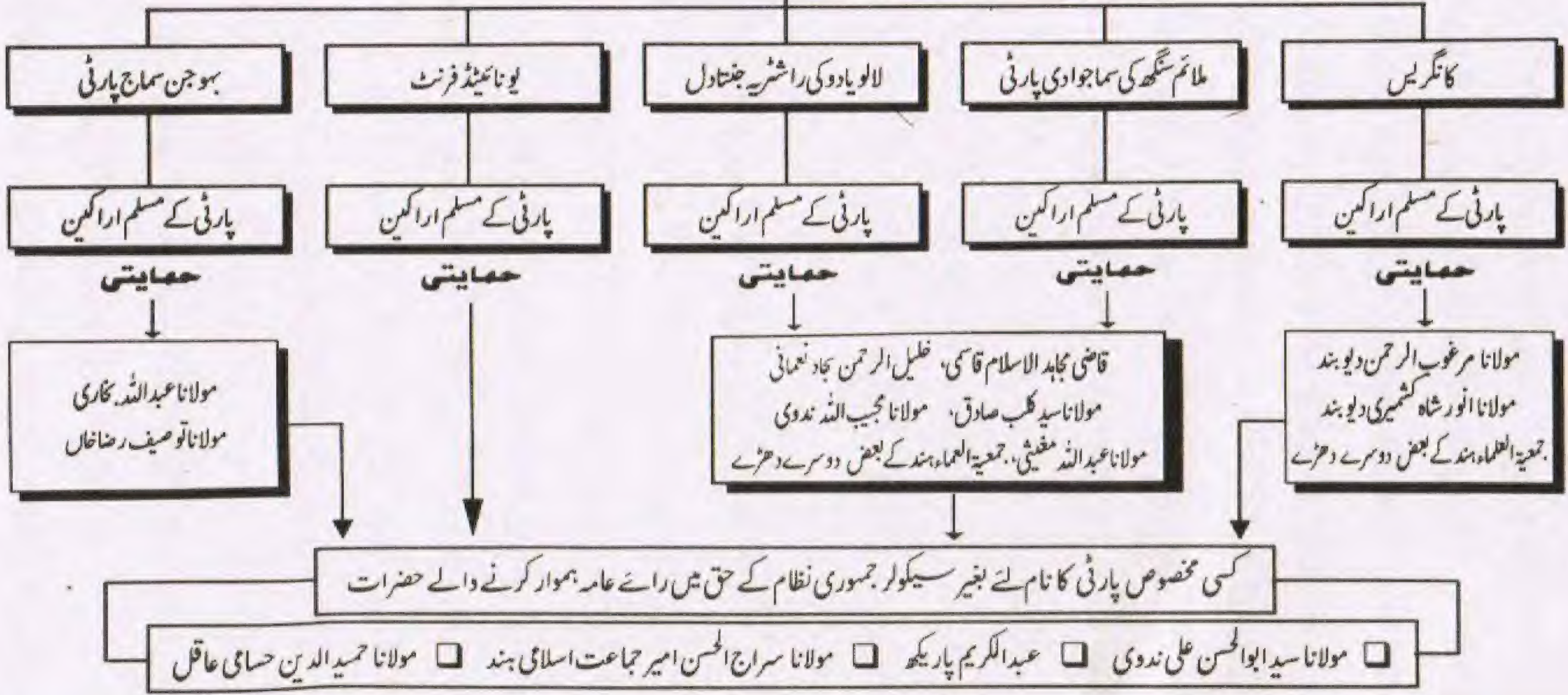
سید غلام حسین رضا آغا

مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل

کا اندازہ کرنا ہو تو الیکشن کے موقع پر جاری ہونے والے فتاوے اور مسلم جماعتوں کی بھانت بھانت کی اپیلوں پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا۔ ہر شخص ہانکے پکارے یہی کہہ رہا ہوگا "لوگو آؤ جمہوریت کی طرف، نظام کفر کے استحکام کی طرف، اعلیٰ سیکولر اقدار کے تحفظ کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہ پائے، آؤ نظام کفر کے استحکام کے لئے تم سے جو کچھ بن پڑے ضرور کر گزرو" اس پورے ہنگامے میں کہیں سے یہ آواز سنائی نہیں دیتی کہ "لوگو اس ملک کو شریعت جمہور سے نجات دلا کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی شریعت کے نفاذ کا سامان کرو کہ اسی میں تمہاری دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔"

الیکشن کا موقع ہو یا عام زندگی کی چہل پہل، آپ دیکھیں گے کہ جمہوری نظام کے استحکام کے لئے کام کرنے والے رضاکاروں کی فوج ظفر موج ہر وقت حرکت میں ہے، ہر پارٹی اپنے اپنے ڈھب کا نظام رائج کرنے اور اپنے انتخابی منشور کے نفاذ کے لئے سر توڑ جدوجہد میں مصروف ہے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانیوں سے بھی باز نہیں آتی۔ جہاں کفر کے خیمے میں ہر وقت چہل پہل ہے وہیں دوسری طرف آخری رسولؐ کا خیمہ ویرانی کا منظر پیش کرتا ہے۔ مسلمان ہو یا غیر مسلم ہر شخص سیکولر غیر اسلامی ایجنڈے کے فروغ میں مصروف ہے۔ رسول اکرمؐ کا اسلامی ایجنڈا یعنی اس ملک کو قرآنی خطوط پر منظم کرنے کا خواب ہماری توجہ سے یکسر محروم ہے اس لئے کہ پروپیگنڈے نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اس ملک میں قرآنی ایجنڈے کا فروغ ایک ناقابل عمل خیال ہے اور یہ کہ ایک کثیر ثقافت والے ملک میں ایسی انتہاپسندانہ باتیں نہیں کرنا چاہئے۔ عملی طور پر جو کچھ ممکن ہے وہ یہ کہ ہم کفار و مشرکین کے موجودہ جمگھٹے میں سے کسی نہ کسی کو اپنے امور کی محافظت کا کام سونپ کر مطمئن ہو جائیں اور بس۔ گویا کہنے کو تو اس ملک میں بڑی قد آور مسلم قیادتیں موجود ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سبھوں نے کسی نہ کسی اسلام دشمن کافر و مشرک کے ہاتھوں پر بیعت کر رکھا ہے۔ اب بھلا جن کی لگامیں کفار و مشرکین کی ہاتھوں میں ہوں ان سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابی ایجنڈے کے نفاذ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

گذشتہ الیکشن میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کی طرف سے مختلف غیر مسلم قیادت کی حمایت میں جو بیانات جاری ہوئے ہیں اس کو سامنے رکھ کر اگر اسلامی اور غیر اسلامی ایجنڈے سے وابستگی کا ایک شجرہ بنایا جائے تو بعض دلچسپ نتائج سامنے آتے ہیں۔


شریعت جمہور اور شریعت نامذہبیت کے علمبردار
(الیکشن اپیل، ۹۶ اور ۹۸ کی بنیاد پر)
حمایتی اور قائدین
کانگریس
ملائم سنگھ کی سماجوادی پارٹی
لالو یادو کی راشٹریہ جنتادل
یونائیٹڈ فرنٹ
بہوجن سماج پارٹی
پارٹی کے مسلم اراکین
پارٹی کے مسلم اراکین
پارٹی کے مسلم اراکین
پارٹی کے مسلم اراکین
پارٹی کے مسلم اراکین
حمایتی
حمایتی
حمایتی
حمایتی
حمایتی
مولانا مرغوب الرحمن دیوبند
مولانا انور شاہ کشمیری دیوبند
جمعیۃ العلماء ہند کے بعض دوسرے دھڑے
قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، خلیل الرحمن سجاد نعمانی
مولانا سید کلب صادق، مولانا مجیب اللہ ندوی
مولانا عبداللہ مغیثی، جمعیۃ العلماء ہند کے بعض دوسرے دھڑے
مولانا عبداللہ بخاری
مولانا توصیف رضا خاں
کسی مخصوص پارٹی کا نام لئے بغیر سیکولر جمہوری نظام کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے والے حضرات
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
عبدالکریم پاریکھ
مولانا سراج الحسن امیر جماعت اسلامی ہند
مولانا حمید الدین حسامی عاقل

آپ کسی بھی قابلِ ذکر مسلم جماعت یا شخصیت کا نام لیں، آپ دیکھیں گے کہ وہ کہیں نہ کہیں اس ٹیبل میں ضرور فٹ ہو جائے گا۔ مسلمانوں میں غیر اسلامی ایجنڈے کی حمایت کرنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہم نے گذشتہ الیکشن کے موقع پر جاری ہونے والے چند مستند اعلانات اور اپیلوں کی روشنی میں یہ فہرست ترتیب دی ہے۔ اگر اخباری بیانات پر جائیے اور غیر اسلامی ایجنڈے کے لئے صرف ہونے والی مسلمانوں کی قوت کی بنیاد پر اس فہرست میں اضافہ کریں تو آپ کو حیرت ہوگی کہ بہت کم ہاتھ ہیں جو نظامِ کفر کے استحکام میں آلودہ ہونے سے رہ گئے ہیں۔ ایک طرف تو غیر اسلامی ایجنڈے کے حامیوں کی فہرست طویل ہوتی جاتی ہے اور دوسری طرف اسلامی ایجنڈے کے لئے کام کرنے والوں کا انگلیوں پر شمار کرنا بھی مشکل ہے۔ نظامِ کفر کے خیمے میں گہما گہمی ہے، چہل پہل ہے، سرگرمیوں کی بہار ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ خالی رہ گیا ہے، حمایتی لاپتہ ہیں، پھر یہ شکایت کیوں ہے کہ اس ملک میں اسلامی ایجنڈا برگ و بار نہیں لاتا، یہاں کی مٹی ابھی اس پودے کی آبیاری کے لئے تیار نہیں ہوئی ہے۔

مسلمانوں کی مؤقر شخصیات کی طرف سے کی گئی ان اپیلوں پر نظر ڈالئے، یقین نہیں آتا کہ اپیلوں پر ان لوگوں کے دستخط ثبت ہیں جو دین اور شریعت کا علم رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اس بات کے لئے نص قطعی موجود ہے کہ کفار و مشرکین کو مسلمانوں کے امور کی نگہبانی نہیں سونپی جاسکتی، انہیں قیادت اور امامت کے منصب پر فائض نہیں کیا جاسکتا۔ "**ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا**" یعنی قرآن تو اس بات کی مخالفت کرتا ہے کہ کافروں کو مسلمانوں پر حکمراں بنایا جائے اور ہمارے اہلِ شریعت ہانکے پکارے مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ تم فلاں اور فلاں غیر مسلم قائد کو اپنے امور کی نگہبانی سونپ دو کہ اس ملک میں تمہارا مستقبل اسی کے ہاتھوں محفوظ ہے۔ اللہ اور اس کا رسولؐ تو اس بات کو حرام قرار دیتا ہو کہ مسلمان کسی گمراہ کافر و مشرک کی اتباع قبول کریں، اسے اپنے امور کی نگہبانی سونپیں یا اسے برسرِ اقتدار لانے کے لئے جدوجہد کریں، لیکن ہمارے علماء کرام ہمیں اس بات پر مجبور کریں کہ ہم موجودہ سیکولر ڈیموکریسی کو فروغ بخشنے اور ان کی ڈھب کی غیر مسلم سیاسی قیادت کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں پر یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ وہ کفار و مشرکین کے حامی اور مددگار بن کر معصیتِ عظمیٰ کا ارتکاب کر رہے ہیں اور جب تک مسلمانوں کی

قابل ذکر آبادی کفار و مشرکین کے کیمپ سے نکل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کیمپ میں دوبارہ واپس نہیں آجاتی اس وقت تک اسلامی ایجنڈے کو ناقابل عمل گردا ننا حقیقت واقعہ کے خلاف ہوگا کہ جب اسلامی ایجنڈے کے نفاذ کے لئے کوئی قابل ذکر تحریک نہیں چل رہی ہے، جب بڑے بڑے اہل شریعت نظام کفر کے استحکام میں شب و روز ایک کئے دیتے ہیں تو یہ کیسے توقع کرلیا جائے کہ ایک دن خود بخود اس ملک میں رسول اکرمؐ کے حامیوں کو فتح حاصل ہو جائے گی۔ کام نظام کفر کے استحکام کے لئے کریں اور شکایت یہ ہو کہ اسلامی نظام کا پودا برگ و بار نہیں لاتا، یہ کتنی عجیب بات ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے لئے مجوزہ ایجنڈا

(جو بورڈ کے خصوصی اجلاس منعقدہ نومبر ۱۹۹۴ء نئی دہلی میں پیش کیا گیا)

لال قلعہ کے سقوط کے علاوہ دہلی کی سرزمین نے مسلمانوں کی شدید بے بسی کا یہ منظر کم ہی دیکھا ہوگا جب انتہائی بے کسی، شدید ضعف اور حد درجہ خوف و ہراس کی کیفیت میں مسلم عمائدین کا سب سے معتبر ادارہ ہندوستانی مسلمانوں کی بے بسی کے تدارک کے لئے اپنا خصوصی اجلاس کر رہا ہے۔ بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب بابری مسجد کے مسئلہ پر عدالت عالیہ سے انصاف کی توقع کے خاتمے کو ابھی چند ہی دن گزرے ہوں جب مسلمانوں پر ہو رہے پے در پے مظالم نے شدت اختیار کر لی ہو، جب ملک بھر میں مسلمانوں کا مورال پست کرنے کے لئے حکومت نے مختلف ناموں سے اپنی کاروائیاں تیز کر دی ہوں اور جب ہر ہندوستانی مسلمانوں کو داؤد ابراہیم اور آئی ایس آئی کا ایجنٹ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہو، ایسی صورت میں مسلم عمائدین کے اس جلسے پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔

بے بسی کی ایک ایسی فضا میں جب امت کے بڑے بوڑھوں پر خوف کا ماحول طاری ہے اور اس شدید احساس کے باوجود کہ وہ ظلم و جبر کے شدید شکنجے میں کس دیئے گئے ہیں، کرنے کا پہلا کام تو یہ ہے کہ خوف کے ان اسباب کا پتہ لگایا جائے جس نے اس امت پر موت کی کیفیت طاری کر دی ہے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہوا کہ جو سرزمین کل تک ہماری اذانوں سے گونجتی تھی اور جہاں کل تک ہمارے اخلاقی و ایمانی رعب کا یہ عالم تھا کہ قلت تعداد کے باوجود دہلی کی سرزمین ہمارے جاہ و حشم کی علامت سمجھی جاتی تھی آج اسی سرزمین پر ہم من حیث القوم زندگی کا چراغ گل ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فکر و نظر کا یہ زوال آخر کیوں کر ہوا آخر اس صورت حال کے لئے ذمہ دار کون ہے؟ یہ سچ ہے کہ آج پوری دنیا میں امت مسلمہ نازک ترین دور سے گزر رہی ہے۔ ہر جگہ ہمارا

خون ارزاں اور ہماری تلواریں کند ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ کفر کی بین الاقوامی طاقتیں سوویت یونین کے خاتمے کے بعد اب اپنی آخری لڑائی اسلام سے لڑنا چاہتی ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت ملکی اور بین الاقوامی ہر دو سطح پر اہل اسلام کے خلاف کفر کا اجتماع ہورہا ہے۔ لیکن محض دوسروں کو مورد الزام ٹھہرا کر ہمارا بری ہوجانا بھی ممکن نہیں۔ میرے خیال میں آج ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کی ذمہ داری بڑی حد تک خود ہمارے اوپر، ہمارے اہل فکر، دانشوروں اور علماء پر عائد ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ امت کو نئی سمت دینے سے پہلے ہم ان لغزشوں کا بھی پتہ لگائیں جواب تک ہم سے ہوتی رہی ہیں۔

مسلمانوں کو شدید احساس بے بسی سے دوچار کرنے کا یہ عمل یقیناً اس ملک میں نیا نہیں ہے البتہ انہدام کے بعد اس مکروہ عمل کو عملی طور پر ریاستی پالیسی کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ ہم نے ۱۱/ جولائی ۱۹۹۴ء کے مکتوب میں آپ حضرات کی توجہ اس جانب دلائی تھی کہ ٹاڈا میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی گرفتاری کے بعد اب حکومت نے آئی ایس آئی کے حوالے سے ایک نئی مسلم کش مہم کا آغاز کردیا ہے۔ ہم نے حیدر آباد کی مساجد میں ہونے والی پولیس مداخلت، ائمہ کرام کی رہائش گاہوں پر چھاپے مسجد کے منتظمین سے پوچھ گچھ اور اس قسم کی ناروا مداخلت کا حوالہ دیتے ہوئے آپ حضرات سے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کو مطعون کرنے کے اس نئے سیاسی جواز کا فوری تدارک کیا جانا ضروری ہے۔ ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اس مسئلے کا فوری نوٹس نہ لیا گیا تو حکومت کو کھلی چھوٹ مل جائے گی کہ وہ ہمارے درمیان حوصلہ مند نوجوانوں کو جب چاہے آئی ایس آئی کا ایجنٹ بتا کر گرفتار کرلے، ان کو زدوکوب کرکے ہڈیاں توڑ دے اور غیر معینہ مدت تک کے لئے سرکاری عقوبت خانوں میں ڈال دے۔ لیکن تب بھی ہماری بات کو شدت احساس کا نام دے کر لائق اعتنا نہ سمجھا گیا اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی موثر مشترکہ اسٹریٹیجی کی بات کسی کی سمجھ میں آئی۔ اگر بعض گروہوں میں اس صورت حال کی شدت کا احساس بھی ہوا تو انہوں نے اپنے الگ الگ جلسے اور میٹنگیں کرڈالیں، حکومت کو قرارداد بھیج دی اور بس۔ مشترکہ اور موثر اسٹریٹیجی کے لئے ہم جب بھی تیار نہ ہوئے۔ کاش کہ ہم لوگ اپنی ناک سے آگے دیکھ پاتے اور کم از کم ان مسائل پر جو امت کے لئے زندگی اور موت کی حیثیت رکھتے ہیں ایک جگہ بیٹھ کر ایک انقلابی عملی پروگرام تشکیل دے سکتے۔

مسلمانوں کو ہراساں کرنے اور مسلم نوجوانوں کو ٹاڈا میں بند کرنے کا یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب کسی مسلمان کو ٹاڈا میں بند کرنے کی خبر نہ آئی ہو۔ اس دوران نہ

جانے ملک کے کن کن حصوں میں کس کس نوعیت کا ظلم ہوتا رہا تب بھی ہم خاموش رہے۔ البتہ آج جب اس آگ کی لپٹیں ہمارے دروازے تک آپہنچی ہیں تو ہم اچانک بیدار ہوگئے ہیں۔ دیر سے سہی یہ بیداری بذات خود ایک خوش آئند علامت ہے۔ خدا کرے ہماری یہ بیداری ایک نئے مستقبل کا علامیہ بن سکے البتہ ماضی کی روش کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں اس بات کا شدید خدشہ ہے کہ شاید ہماری یہ بیداری زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکے۔

یاد رکھئے اگر ہمارے اندر ظلم کے خلاف بولنے کا یارانہ رہا اور اگر ہمارے درمیان ایسے لوگ مفقود ہوگئے جو کسی لاگ ولپیٹ کے بغیر ظلم کے خلاف کلمہ حق بلند کرسکیں تو پھر اس سرکش نظام کو لگام دینا تو کجا اس امت کے لئے انبیائی پیغام کا محفوظ رکھنا بھی مشکل ہوجائے گا۔ آج جب ہم اپنی بے بسی کے ازالے کے لئے بیٹھے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ بعض مسائل پر ہمارے دل ودماغ صاف ہوں اور ہم وہی کہیں جس پر ہمارے ضمیر وقلب مطمئن ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی آپ کے پیش نظر رہے "یا غلام احفظ الله یحفظك" یعنی اگر آپ نے اللہ کے پیغام کو بغیر کسی خوف کے لوگوں تک پہنچادیا، حق گوئی اگر آپ کا شعار رہی تو پھر آپ کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر آپ کے دل میں کبھی بھولے بھٹکے بھی یہ خیال آتا ہے کہ کسی وزیر کے سامنے عرضی گزارنے اور اس سے رحم کی درخواست کرنے سے آپ کے اوپر مظالم کا سلسلہ کم ہوجائے گا تو دراصل آپ خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں اور خود کو اللہ کی حفاظت سے نکال کر شیاطین کی حفاظت میں ڈال دیتے ہیں جو بہر طور آپ کا کھلا دشمن ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے بار بار تنبیہ کی ہے کہ آپ اپنے مددگار اور ساتھی کفار اور مشرکین اور فاسقین میں سے تلاش نہ کریں۔

امت کے عمائدین کا بار بار وزیر اعظم کے دفتر تک اس امید کے ساتھ جانا کہ اس کی نگاہ التفات ہمارے ملی وقومی مسائل حل کردے گی یا ملی تقاریب جلسوں اور اجتماعات میں فاسق وزراء کو اس امید کے ساتھ بلانا کہ آپ سے ان کی وابستگی آپ کا کام بنادے گی تو یہ بھی دراصل اسی رویے کا اظہار ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن سختی سے کہتا ہے۔ وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ (مائدہ آیت ۸۱) یہ بات اس وقت اور بھی سنگین ہوجاتی ہے جب آپ کو اس بات کا خوب خوب احساس ہو کہ جن وزراء سے آپ بار

بار ملنے جارہے ہیں اور جن کی نگاہ التفات کو آپ امت کے لئے مفید سمجھتے ہیں دراصل وہی اصل مجرم ہیں اور ان کی پے درپے سازشوں کے نتیجے میں ہی امت آج موجودہ صورت حال سے دوچار ہے۔ پھر ان سے انصاف اور رحم کی توقع کرکے آپ آخر کس کو بیوقوف بناتے ہیں؟ کیا ان وزراء کی کوٹھیوں سے لوٹتے ہوئے کبھی آپ کے دل کے کسی گوشے میں بھی یہ بات آئی کہ امت کے تئیں آپ نے اپنی ذمہ داری ادا کرڈالی ہے؟ پھر اس امت کے عمائدین آخر کیوں امت کی تذلیل و تضحیک کا یہ ڈرامہ بار بار رچانے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟ خدا کی آخری کتاب اور آخری رسولؐ کی انقلابی سنت کی موجودگی کے باوجود آخر ہمارے اندر یہ داعیہ کیوں نہیں بیدار ہوتا کہ ہم اس ملک میں مسلمانوں کے لئے ایک انقلابی لائحہ عمل وضع کریں۔ ندوۃ العلماء میں حالیہ پولیس ایکشن کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے سب سے معتبر اور محترم عالم نے جو بات کہی وہ یہ تھی کہ ہم اس مسئلہ کو وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ تک لے جائیں گے۔ جس سے کم از کم یہ غلط فہمی تو یقیناً پیدا ہوتی ہے کہ شاید حکومت کے ان دو اعلیٰ مناصب پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے انصاف ملنے کی توقع اب بھی باقی ہے۔ کاش کہ ہم رفیق موسیٰ کی طرح یہ کہہ سکتے "افوض امری الی اللہ"۔ ہم میں سے بعض لوگوں کو شاید وہ یادگار واقعہ معلوم ہو کہ جب مسز گاندھی نے دیوبند کے صد سالہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں اس ملک میں مسلمانوں کی حفاظت کروں گی" تو اس موقع پر اسی محترم عالم دین نے ببانگ دہل یہ اعلان کیا تھا کہ اس ملک میں مسلمانوں کی حفاظت کے لئے اللہ کافی ہے۔ اے کاش کہ یہی رویہ آج ہماری ملی قیادت کا شعار بن جاتا۔

آج جب انتہائی حساس ماحول میں پرسنل لاء بورڈ کی یہ نشست جاری ہے لازم آتا ہے کہ ہم بعض ان مسائل پر اپنا موقف واضح کریں جن پر کسی وجہ سے ہم نے اب تک مجرمانہ خاموشی اختیار کررکھی ہے جن میں کشمیر کا مسئلہ ترجیحی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ گزشتہ چار برسوں سے کشمیر میں فوج کشی کا سلسلہ جاری ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی پریس کو اگر یکساں معتبر ٹھہرایا جائے تو کشمیر میں روزانہ مارے جانے والے مسلم نوجوانوں کی تعداد اوسطاً پچیس ہے۔ پھر آئے دن پولیس کی وحشیانہ بربریت کے دردناک واقعات بھی ملکی و بین الاقوامی پریس میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی شاید انکار ممکن نہیں کہ بوسنیا کے بعد مسلم خواتین کی آبروریزی کے واقعات اتنے بڑے پیمانے پر اگر فی زمانہ کہیں پیش آرہے ہیں تو وہ کشمیر کی وادی ہی ہے۔ دہشت گردی کا الزام دے کر کسی بھی کشمیری

نوجوان کی زندگی کا چراغ گل کر دینا ہندوستانی پولیس کے لئے آج ایک معمول کی بات ہے۔ ذرا غور کیجئے اتنے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی جان و مال کے اتلاف کے باوجود ہم اب تک خاموش کیوں ہیں؟ جو لوگ مسلمانوں کے ملی ادارے ندوۃ العلماء پر پولیس ایکشن کے خلاف اس قدر حساس ہیں آخر وہ کشمیری مسلمانوں پر ہو رہے سخت ترین مظالم کے خلاف کیوں نہیں اٹھ کھڑے ہوتے؟ یہ سچ ہے کہ کشمیر کی سیاست پاکستانی مداخلت کی وجہ سے پیچیدہ ہوگئی ہے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ کشمیر کا مسئلہ کشمیریوں کا ہے لیکن کشمیری مسلمانوں پر ہو رہے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے سے ہمیں کس نے روکا ہے؟ اگر ہم مسلم اخوت کے عالمگیر تصور کے حامل ہیں اور امت مسلمہ کو ایک جسد واحد کی طرح گردانتے ہیں تو کشمیری مسلمانوں کے مصائب کا احساس بھی ہمیں فطری طور پر ہونا چاہئے تھا۔ اس سے آنکھیں بند کر کے ہم نے مداہنت کا ارتکاب کیا۔ ہمیں اس سلسلے میں اپنے رب سے معافی مانگنی چاہئے۔

ہندوستان کی تاریخ میں شاید کوئی اور ایسا واقعہ نہ ملے جب محض مصالح کے پیش نظر امت کے قائدین نے اپنی زبانیں بند رکھی ہوں حتی کہ جن صریح مظالم پر قومی اخبارات مسلسل چیختے رہے ہیں ہندو دانشور مسلسل آواز بلند کرتے رہے ہیں اور انسانی حقوق کی تنظیمیں احتجاج کرتی رہی ہیں ان انسانیت سوز مظالم پر بھی ہمارے اکابرین کی زبانیں گنگ رہی ہیں یہاں تک کہ اب جب کشمیر کی آگ ان اداروں تک پہنچنے لگی ہے اور جب پوری امت مسلمہ کے لئے مسلسل چار سال سے اس مسئلہ سے خود کو الگ رکھنے کی ہماری کوشش کے باوجود عملی طور پر الگ رکھنا مشکل ہو گیا ہے اور جب ہر مسلم ادارے اور ہر مسلم گھر میں حکومت کو کشمیری دہشت گرد پناہ گزیں نظر آرہے ہیں تب ہمیں احساس ہوا ہے کہ کشمیر کے مسلمان گذشتہ چار برسوں کے دوران کس اذیت ناک صورت حال سے دوچار ہیں۔ کاش کہ ہم نے شروع ہی میں اس بارے میں اپنا موقف واضح کیا ہوتا اور ظلم خواہ کسی بھی فرقے کے خلاف کسی بھی شکل میں ہو اس کے خلاف آواز اٹھائی ہوتی تو آج وادی کی آگ سے ہمارے در و بام بھی محفوظ رہتے۔

اس سے قطع نظر کہ کشمیر کے مسئلے کا حل کیا ہے اور اس بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ کشمیر پر کس ملک کا حق بنتا ہے یا اسے اپنی خود مختاری کا حق حاصل ہے یا نہیں، ہمارے لئے جو مسئلہ سب سے اہم ہے وہ یہ کہ کسی ملک کی فوج کو اپنے ہی شہریوں پر فوج کشی کا حق کس حد تک ہو سکتا ہے؟ ظلم کا سایہ اگر کسی بھی خطے میں گہرا ہوتا جارہا ہے تو اس کے تدارک کی صورت کیا ہوگی؟ اور یہ کہ اس ملک میں

انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کے خلاف جو طاقتیں کام کررہی ہیں انہیں شکست فاش کیسے دی جاسکتی ہے؟ پھر یہ کہ کسی بھی حکومت کو یہ اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ من حیث القوم امت مسلمہ کو غیر ملکی ایجنٹ بتاکر اس پر اپنی توپوں کا دہانہ کھول دے؟

دوسرا مسئلہ جو ہماری ملی فکر کا شدت سے محتاج ہے وہ ہے الیکشن۔ آپ حضرات اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ہندوستان کا موجودہ سیاسی نظام کچھ اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ اس میں صالح قیادت کے ابھرنے کا امکان مفقود ہے۔ پھر مسلم حلقوں کی ترتیب و تنظیم اور مسلم ووٹرس کا مختلف علاقوں میں منتشر ہونا بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس نے مستقبل قریب تو کیا مستقبل بعید میں بھی کسی مسلم سیاسی قوت کے ابھرنے کا امکان ختم کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد کے باوجود پارلیامنٹ اور اسمبلی میں ان کی نمائندگی تناسب کے اعتبار سے انتہائی کم ہے۔ مثال کے طور پر ۸۸۰ ملین کی آبادی والے ملک میں پارلیامنٹ میں مسلمانوں کی نمائندگی کم از کم ۱۱۹ ہونی چاہئے تھی۔ اگر حکومت کی جانبدارانہ مردم شماری کو ہی معیار مان لیا جائے جب بھی مسلمانوں کی آبادی کے پیش نظر لوک سبھا میں مسلم اراکین کی تعداد ۷۳ ہونی چاہئے۔ جب کہ اب تک سب سے بڑی تعداد ۴۸ رہی ہے۔ موجودہ نظام کے نقص ہی کا نتیجہ ہے کہ مدھیہ پردیش کی موجودہ اسمبلی میں تین سو بیس اراکین میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ جو لوگ موجوہ سیاسی ڈھانچے میں مسلمانوں کو سیاسی طور پر مؤثر کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ دراصل ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو دلت مسلم اتحاد کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو وہ دراصل امت مسلمہ کی نظریاتی اساس سے ناواقف ہیں اور وہ عام قوموں کی طرح ہی مسلمانوں کو مختلف قوموں کے ساتھ فٹ کرنے کا ناکام تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس امت کو اس ملک کے سیاسی اقتدار میں کوئی شرکت مطلوب ہے تو اسے خوب خوب معلوم ہونا چاہئے کہ موجودہ سیاسی نظام میں بنیادی تبدیلی کے بغیر مسلمانوں کو ان کا سیاسی حق نہیں مل سکتا۔ بہت کچھ غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس ملک میں متناسب نمائندگی کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے جو انہیں سیاسی اقتدار میں جائز شرکت دلواسکے۔ یہی وہ راستہ ہے جس میں مسلمانوں کے درمیان صالح سیاسی قیادت کے ابھرنے کا امکان پایا جاتا ہے۔ رہی دوسری سیاسی ترکیبیں تو ہم انہیں خوب خوب آزما چکے ہیں اور اسی کے نتیجے میں ہم آج اس بے بسی کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ ضرورت ہے کہ امت مسلمہ

کا یہ معتبر ادارہ اس مسئلے پر غور و فکر کے بعد سیاسی نظام میں تبدیلی کے اس مطالبے کو ایک قومی مطالبہ قرار دے ورنہ موجودہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کا پارلیامنٹ کے اندر یا باہر رہنا کچھ معنی نہیں رکھتا۔

رہے وہ لوگ جو اس مطالبے کو اس خوف سے اٹھانے سے ڈرتے ہیں کہ ان پر نئے پاکستان کی تعمیر کا الزام لگ جائے گا تو انہیں خوب معلوم ہونا چاہئے کہ ان پر حق و انصاف کے قیام کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے خواہ ایسا کرنے پر دنیا کچھ بھی کہتی رہے۔

تیسرا اہم مسئلہ جو اس وقت تیزی سے سر اٹھا رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ آنے والے دنوں میں مزید شدت اختیار کرلے گا وہ ملک کے مختلف علاقوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی شہریت کو مشکوک بنائے جانے کا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ کون شخص بنگلہ دیشی ہے یا کس نے ہندوستان میں کب سکونت اختیار کی ہمارا یہ واضح موقف ہونا چاہئے کہ آج کی تاریخ تک ہندوستان میں بسنے والے ہر شخص کو مکمل ہندوستانی شہری تسلیم کیا جائے۔ لوگوں کی سکونت اور آبادکاری کے بارے میں سیاسی انداز سے تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری رکھا گیا تو اس سے مسائل مزید پیچیدہ ہوجائیں گے۔ ہندوستان جیسے قدیم بین الملی اور بین المذہبی ملک میں جس کی پوری تہذیبی تاریخ مختلف علاقوں سے آکر سکونت اختیار کرنے والوں پر منحصر ہے، ملکی اور غیر ملکی کی بحث بے معنی ہے۔ مزید یہ کہ ہندوستان نے بنگلہ دیش کی آزادی کو اپنا قومی فریضہ سمجھا تھا تو ہمیں چاہئے کہ اگر اس موقع پر پریشان حال لوگوں نے جنگی حالات سے تنگ آکر اس ملک میں جائے پناہ حاصل کی ہو تو اپنی وسعت ظرفی کے تئیں ہم ان کی ذمہ داریاں بھی قبول کرلیں۔ رہا ان ہندوستانی مسلمانوں کا مسئلہ جن کی شہریت مختلف بہانوں سے مشکوک قرار دی جاتی رہی ہے تو ان کا تعلق دور دور سے بھی بنگلہ دیش سے ثابت نہیں ہوتا۔ اس شرانگیزی کے سد باب کے لئے ہمیں ایک موثر رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

چوتھی بات جو ان باتوں سے ذرا مختلف لیکن پرسنل لاء بورڈ کے لئے بنیادی غور و فکر کی محتاج ہے وہ ہندوستانی معاشرے میں مسلم خواتین کی افسوس ناک صورت حال ہے۔ ہمیں اس بات کا خوب احساس ہے کہ اسلام اور شریعت کے حوالے سے ہندوستانی مسلم سماج نے مسلم خواتین پر ظلم و ناانصافی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ آئے دن مسلم خواتین کے مسائل ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں ایسا اس لئے بھی کہ بعض اسلامی اصولوں کے غیر اسلامی نظام میں پوری طرح موثر نہ ہونے کے سبب بعض حالتوں

میں بڑی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوجاتی ہے۔ پرسنل لاء بورڈ نے اپنے قیام کی ابتداء ہی سے اس ذمہ داری کی ادائیگی کا عہد کیا تھا لیکن افسوس کہ فقہ کی جدید تدوین تو کجا ابھی اس بارے میں بنیادی رویے کی تشکیل ہی باقی ہے۔ اس مسئلہ پر غور کیا جانا بھی ضروری ہے کہ غیر مسلم نظام میں نافذ ہونے والی محدود اسلامی فقہ ہمہ گیر اسلامی نظام کی فقہ سے کس قدر مختلف ہوگی۔

شاہ بانو کے معاملے میں مطلقہ بے سہارا عورت کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اوقاف پر ڈال کر ہم نے بظاہر تو اپنے تئیں شریعت کی حفاظت کا سامان کر لیا البتہ جو لوگ اوقاف کی موجودہ صورت حال سے واقف ہیں انہیں خوب معلوم ہے کہ اس تباہ حال ادارے سے کسی ایسے فلاحی کام کی توقع عبث ہے۔ پھر ہندو تہذیب کے زیر اثر جس طرح مسلم عورتوں کی پوری زندگی باورچی خانے کی تنگ کوٹھری میں گزر جاتی ہے اور یہ کہ علم کے فقدان اور غیر مسلم رسم و رواج کے زیر اثر جس طرح وہ غلبہ اسلام کے انقلابی مشن سے عملی طور پر غیر متعلق ہوگئی ہیں ہم اس کا تدارک بھی اب تک نہیں کر پائے ہیں۔ شاید یہ سب کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم ان غیر اسلامی رسم و رواج کو ختم کرنے کا بیڑا نہ اٹھالیں جنہیں معاشرے میں کسی وجہ سے تقدیس کا مرتبہ حاصل ہوگیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم جلد از جلد ان اقدامات کا فیصلہ کریں جس سے ملک میں شریعت کے تحفظ کے بجائے اس کے غلبے کی راہ ہموار ہوسکے۔

آخری لیکن بڑی اہم بات یہ ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ان نظریاتی الجھنوں کے سلسلے میں ایک واضح موقف اختیار کریں جن کے بارے میں گزشتہ نصف صدی سے پوری امت کنفیوژن کا شکار رہی ہے۔ ہمیں یہ وضاحت کے ساتھ بتانا ہوگا کہ اس ملک میں ہمارا ملی مفاد کیا ہے؟ کتاب و سنت کے حوالے سے ہمیں اس ملک میں کون سا رول مطلوب ہے اور یہ کہ ہمارے ملی مفادات ملکی مفادات سے کس طرح مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر غلبہ اسلام کا مقدس خواب دستور میں متعین کردہ ملکی مفاد سے براہ راست متصادم ہے۔ اگر ایک طرف دستور ہند ملک کے کارواں کو سیکولر اور یونیفارم سول کوڈ والے معاشرے کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو دوسری طرف قرآن مجید کی حامل امت کے لئے انصاف پر مبنی ایک اسلامی معاشرے کے قیام کا ہدف پہلے سے موجود ہے جس سے امت کا بڑے سے بڑا فرد، محترم سے محترم شخصیت، مؤثر سے مؤثر گروپ بھی سرمو انحراف کی جرات نہیں کرسکتا۔ لازم ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اس ملک کا مکمل نظریاتی شہری بننے کے لئے دستور میں حائل ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو ایک ایسے روحانی

معاشرے کے قیام میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان اقدامات کا تعین کیا جائے جن سے قرآنی اور دستوری نصب العین کا ٹکراؤ ختم ہوسکتا ہو۔ یہ ایک ایسا بنیادی مسئلہ ہے جس سے صرف نظر کیے بغیر اس ملک میں بنیادی تبدیلیوں کی بات نہیں سوچی جاسکتی۔

توقع ہے کہ اس اجلاس میں ان مسائل پر بعض ایسے واضح لائحہ عمل تیار کیے جائیں گے جن سے مسلمانوں کی موجودہ مایوسی کا سدباب ہوسکے گا اور یہ اجلاس حق گوئی کی ایک ایسی نظیر قائم کرے گا جس سے باطل کے درو بام لرز اٹھیں گے۔ اس بات کی بھی توقع ہے کہ جو حضرات ہمارے درمیان امت مسلمہ کی آبرو سمجھے جاتے ہیں وہ اس امت کی بے بسی کا مقدمہ جابر حکومت کے ایوانوں تک لے جانے کے بجائے اللہ کی عدالت تک لے جائیں گے اور اعلائے کلمۃ الحق کی ایک ایسی نظیر پیش کریں گے جو اصحاب کہف کے نوجوانوں نے کی تھی اور جس کے نتیجے میں اللہ نے ان کو اپنی پناہ اور حفاظت میں لے لیا تھا۔ خدا کرے اس اجلاس سے اللہ کی یہ سنت دوبارہ اس ملک میں قائم ہو۔

بی جے پی کے دور حکومت میں مسلمان

(۱)

دہلی پر ہندو احیاء پرستوں کے قبضے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے سلسلے میں اٹھنے والے چند سوالات کا جائزہ

وہ لوگ جنہیں ہندوستانی مسلمانوں کی ہزار سالہ غلامی کا احساس ستائے دیتا تھا بالآخر دہلی کے تخت پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہندو احیاء پرستوں کی موجودہ حکومت سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ صدیوں گزری دہلی نے کبھی بھی ایسا منظر نہ دیکھا تھا جب علی الاعلان ایک مسلم دشمن ایجنڈے کے تحت دہلی کی سرزمین پر ہندو احیاء پرستوں کی کوئی حکومت قائم ہوئی ہو، لیکن اب حالات نے پلٹا کھایا ہے اور پہلی بار اسی دہلی پر جسے بجاطور پر مسلمان اپنے اسلاف کی سرزمین سمجھتے ہیں ایک مسلم مخالف حکومت کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ کہاں گئے وہ لوگ جو دہلی میں مسلمانوں کی بے بسی پر اس طرح کے اشعار گنگناتے تھے؟

سر زمین دلی کی مسجود دل غمدیدہ ہے
ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے

سرزمین دہلی کی غمدیدگی کا اس سے برا وقت اور کیا ہوگا جب وہ لوگ اس پر قابض ہو گئے ہوں جنہیں اسلاف کی ایک ایک علامت سے چڑ ہے اور جو ہندوستان میں مسلمانوں کے آثار کو ایام غلامی کے آثار سے تعبیر کرتے ہیں۔

لیکن یہ تو تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ یہ پہلا واقعہ نہیں جب دہلی کی سرزمین پر کوئی مسلم دشمن حکومت برسراقتدار آئی ہو بلکہ یہ سلسلہ تو کوئی ڈیڑھ سو سال سے چل رہا ہے۔ دہلی کی سرزمین گزشتہ

ڈیڑھ سو سال سے اپنے اصل والیوں کی تلاش میں نگاہیں وا کیۓ ہوئی ہے لیکن جو لوگ کبھی اس دار الاسلام کے وارث اور محافظ تھے وہ یا تو اس ملک کو چھوڑ کر رخصت ہوگئے اور جو بچ رہے وہ اس تاریخی شعور سے خالی ہیں۔ پھر بھلا اسلاف کی دہلی پر ایک کے بعد دوسری مسلم دشمن حکومت کو قدم جمانے کا موقع ملتا رہا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے ؟

ہاں تعجب تو اس بات پر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو پہلی بار اصل خطرے کا احساس ہو رہا ہے اور احیاء پرستوں کا دہلی میں برسراقتدار آنا انھیں کچھ نیا نیا عمل معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے گزشتہ پچاس برسوں میں دہلی کے تخت پر جو لوگ متمکن رہے ہیں وہ اس احساس سے خالی نہ تھے کہ ہندوستان میں سیکولر ڈیموکریسی کے طریقے سے ان کا اقتدار میں آنا دراصل ہزار سالہ غلامی سے نجات ہے۔ حتیٰ کہ آزادی کے بعد سیکولر قائدین کی پہلی نسل کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ ۱۵/ اگست ، ۱۹۴۷ء کو انھوں نے صرف انگریزوں سے آزادی حاصل نہیں کی بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے تسلسل سے بھی نجات حاصل کرلی ہے۔ سردار پٹیل نے اپنے بعض خطوط میں اس حقیقت کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ خود نہرو جنہیں سیکولرزم اور روشن خیالی کا ستون سمجھا جاتا ہے، ان کا معاملہ یہ ہے کہ دہلی میں جب مسلمانوں کی املاک، وقف کی جائدادیں اور مساجد کی سرزمین پر بڑے پیمانے پر قبضے ہونے لگے اور جب اس صورت حال سے تنگ آکر جمعیۃ العلماء کے مولویوں نے مولانا آزاد کے توسط سے نہرو کی خدمت میں رحم و کرم کی درخواست بھجوائی تو نہرو کا جواب کچھ اس طرح تھا کہ آدھی دہلی تو مسلمانوں کی مساجد، قبرستان اور وقف کی زمینوں سے پٹی پڑی ہے پھر اگر دہلی کی توسیع ہو تو کدھر ہو ؟ چنانچہ توسیعی منصوبے جاری رہے اور دیکھتے دیکھتے اسلاف کی دہلی سے مسلم حکمرانی کے آثار سکڑتے رہے یہاں تک کہ اب دہلی کے بعض نئے علاقوں میں ڈھونڈنے سے بھی پرانے آثار کا سراغ نہیں ملتا۔ ہر نئی تعمیر اور نئی توسیع کا ہر نیا منصوبہ دہلی سے مسلمانوں کے آثار مٹاتا اور وقف کی جائدادوں کو ہڑپ کرتا جاتا ہے۔

بات صرف پہلی نسل تک محدود نہ رہی بلکہ مسلمانوں سے دہلی چھیننے کا احساس سیکولر حکمرانوں کی اگلی نسلوں میں بھی برقرار رہا۔ شاید اسی احساس نے سقوط ڈھاکہ کے وقت مسز گاندھی کو یہ کہنے پر اکسایا کہ آج ہم نے مسلمانوں سے ہزار سالہ شکست کا انتقام لے لیا ہے۔ راجیو گاندھی براہ راست بابری مسجد

کے قضیہ کو ہندولہ بجنڈا بنانے میں پیش پیش رہے ہیں اور ان کے بعد نرسمہاراؤ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے پورے تزک واحتشام کے ساتھ بابری مسجد کو ڈھانے اور ملک بھر میں مسلمانوں کی بے بسی کا ماحول پیدا کرنے میں کمال حکمت کا مظاہرہ کیا ہے، گویا جو لوگ اب تک دہلی پر حکومت کرتے رہے ہیں، کھلے یا چھپے وہ بھی ان ہی عزائم کی تکمیل کے لئے کام کرتے رہے ہیں جس کا بیڑا بہانگ دہل RSS اور اس کی سیاسی ونگ BJP نے اٹھایا ہے۔ دہلی کی سرزمین پر مسلم دشمن حکومت کا قیام تو پچاس سال پہلے ہی ہوگیا تھا البتہ اب نئی صورت حال نے ان تمام لوگوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے جو پچھلے پچاس سالوں سے شترمرغ کی طرح ریت میں اپنی گردنیں دبائے بیٹھے تھے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کل بھی حالات تشویش ناک تھے اور اب انتہائی سنگین ہیں۔ ایسا اس لئے کہ آنے والا ہر دن ان کی مہلت میں ایک دن کم کردیتا ہے اور آنے والے ہر لحہ میں اس ملک میں ان کی بنیادیں کمزور پڑتی جاتی ہیں۔ کل تک تحفظ کے جتنے منصوبے بنائے گئے تھے، ان میں سے کوئی بھی کارگر نہ ہوا۔ ہم نے اردو زبان کی حفاظت کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن رفتہ رفتہ اردو زبان کا سورج غروب ہوتا گیا۔ ہم اپنی نئی نسل تک اس زبان کو منتقل نہیں کرپائے، جس میں اسلامی فکر کا بڑا ذخیرہ موجود ہے ۔ ہم نے پرسنل لا کی تحریک اٹھائی لیکن چند ایک مظاہروں اور جھوٹی تسلیوں کے بعد خاموش ہوکر بیٹھ گئے۔ ہم نے تعلیمی نظام پر اعتراض کیا لیکن حکومت کی منظم مشنری کے آگے ہماری آواز دب کر رہ گئی، گویا ہم نے جس جس فرنٹ پر تحفظ کا سامان کیا وہاں ہمیں منہ کی کھانی پڑی۔ بات یہ تھی کہ ہم کسی جدوجہد کے لئے تیار نہ تھے۔ ہم اگر بہت کچھ کرسکتے تھے تو چند جلسوں کا انعقاد، چند قراردادوں کی منظوری اور چند بے جان، بے روح مطالبات کو بار بار جابر حکمرانوں کے سامنے لے جانا اور بس۔ یقیناً کوئی قوم محض قرارداد یا تقریروں کے زور پر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ حالات سخت تھے جو ہم سے ایک جاں گسل جدوجہد طلب کرتے تھے، لیکن ہماری پست ہمتی اور شکستہ دلی ہمیں کسی مہم جوئی سے روکتی تھی۔ ہم محض مطالبات اور خوشامدوں کے ذریعے اس امت کی کشتی کو پار لگانا چاہتے تھے۔ ہم میں جرات کی کمی تھی، ہمیں دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا فن نہ آتا تھا۔ ہماری حیثیت ایک ایسی فوج کی تھی جس کے قدم اکھڑ گئے ہوں۔ گذشتہ پچاس برسوں میں حالات کا چیلنج قبول کرنے کا داعیہ ہمارے اندر سے جاتا رہا، کسی بڑے مقصد کے حصول کے لئے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنے کی ہمیں عادت نہ رہی۔ پچاس

سالوں میں جب اس امت کا سرمایہ لٹتا رہا، کتنے لوگ تھے جنھوں نے اس سرمایہ کو بچانے کے لئے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا پسند کیا۔ موجودہ ہندوستان کے ملی قائدین اور علماء و دانشور کی کسی فہرست پر نگاہ ڈالیے تو چند ایسے نفوس کا سراغ بھی نہیں ملتا جنھوں نے اس امت کو اس وادی پر خار سے نکالنے کے لئے مصیبتیں جھیلی ہوں، بلکہ اس امت میں سب سے معتبر قائد وہ ہے جسے خدمت اسلام کے راہ میں کوئی خراش بھی نہ لگی ہو۔ ظاہر ہے جب کسی امت میں حوصلہ مند اور مہم جو لوگوں کی کمی ہو جائے، جب اس کے قائدین خطرات سے کھیلنا چھوڑ دیں اور بے ضرر مشاغل کے ذریعہ اپنی قیادت کا چراغ جلائے رکھنے کی کوشش کریں تو دنیا کی کوئی قوت اس امت پر جاری زوال کو نہیں روک سکتی۔

اب جب کہ سیکولرزم کی مکروہ قبا تار تار ہو چکی ہے اور واجپائی جی کی وزارت عظمیٰ سے اس ملک میں ہندو احیاء پرستی کا نیا آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ بی جے پی سے خوف کھانے یا اس کے سایہ عاطفت کی تلاش کے بجائے اس انداز سے اپنا احتساب کریں کہ وہ اب تک اس ملک میں کرتے کیا رہے ہیں۔ ان کی گزشتہ کارگزاریوں نے انھیں کس مقام پر لاکھڑا کیا ہے اور اگر وہ حالات کا رخ کسی اور سمت موڑنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے انھیں کرنا کیا ہوگا؟ گویا مسئلہ دہلی میں کسی حکومت کے قیام اور زوال کا نہیں بلکہ مسلمانوں کی اپنی منصوبہ بندی کا ہے۔

اب تک نئی حکومت کے حوالے سے مسلمانوں میں دو طرح کا رد عمل سامنے آیا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ بی جے پی کی حکومت سے مسلمانوں کو کوئی خوف کھانے کی ضرورت نہیں، سیاست کی پیچیدگیاں اور اقتدار کی خواہش ان تنگ نظر احیاء پرستوں کو بہت جلد وسیع النظر بنا دیں گی اور رفتہ رفتہ یہ لوگ بھی اسی مقام پر آجائیں گے جہاں کانگریس تھی۔ اس نقطہ نظر کے حاملین ثبوت کے طور پر بی جے پی کی ان صوبائی ریاستوں کی مثال بھی دیتے ہیں جہاں فرقہ وارانہ فسادات کا کوئی بڑا واقعہ اب تک رونما نہیں ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو جو لوگ آج بی جے پی کے خوف کو مسلمانوں کے دل سے نکال دینا چاہتے ہیں ان میں سے بیشتر وہ لوگ ہیں جو کل تک اسی بی جے پی کا خوف دلا کر مسلمانوں سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ سیکولر قوتوں کو اقتدار سونپنے کے لئے اپنی ساری توانائی جھونک دیں۔

دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ بی جے پی کے خطرناک عزائم سے امت کو خطرہ تو ضرور ہے لیکن پارلیمنٹ میں ان کی موجودہ کمزور حیثیت میں شاید اصل منصوبوں پر عمل کرنے

کا موقع نہ ملے اور چونکہ حکومت کا قانون سازی کے لئے دو تہائی اکثریت کا حامل ہونا ضروری ہے اس لئے بی جے پی اپنی تمام تر خواہشوں کے باوجود کوئی خطرناک قدم اٹھانے سے باز رہے گی۔ اس قبیل کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خطرہ وقتی طور پر ٹل گیا ہے۔ مسلمانوں میں جو لوگ پہلے نقطہ نظر کی تائید نہیں کرتے، ان کے لئے اس کمزور استدلال میں سر چھپانے کی گنجائش نکل آئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خطرہ ٹلا نہیں ہے بلکہ مسلسل برقرار ہے اس لئے کہ بی جے پی نے اقتدار پر اپنی کمزور گرفت کے باوجود اپنی پسند کے ہندوستان کی داغ بیل ڈالنے کے لئے دستور پر نظر ثانی کا پہلا بنیادی پتھر رکھ دیا ہے۔ دستور کے حوالے سے نئی سفارشات کی بنیاد پر یقیناً بی جے پی کا کام آسان ہو جائے گا۔ مستقبل میں حکومت خواہ بی جے پی کی بنے یا اور کوئی تنگ نظر احیائی کسی اور حوالے سے اقتدار پر قابض ہو، نظر ثانی کے نتیجہ میں اسے ایک ایسی دستاویزی بنیاد ہاتھ آجائے گی جو اس ملک میں مسلمانوں کی مزید بے لبی کے منصوبہ کو آسان بنا سکے گی، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے لئے خطرہ کی گھنٹی جو اب تک گاہے بگاہے بجتی تھی، وہ اب مسلسل کچھ اس طرح بج رہی ہے جیسے کسی نے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ جو لوگ اب تک دستوری تحفظ کے حوالے سے مطمئن خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے یقیناً اس مستقل بجتی ہوئی گھنٹی نے ان کی نیند خراب کر دی ہوگی۔

مسلمانوں کی بزدل قیادت کے سامنے بھاجپائی اقتدار نے قیل و قال اور حیل و حجت کے تمام دروازے بند کر دئے ہیں۔ اب ان کے سامنے صرف ایک راستہ رہ گیا ہے۔ یا تو وہ حالات کا مقابلہ کریں یا پھر برضا و رغبت واجپائی جی کے ہاتھوں پر اسی طرح بیعت کرلیں جس طرح وہ اب تک کانگریسی وزرائے اعظم کے ہاتھوں پر کرتے رہے ہیں۔ یہ صورت حال شاید بزدل قائدین کے لئے قابل قبول ہو البتہ عوامی غیض و غضب کے پیش نظر ابھی فوری طور پر ان کا اس راہ پر چل نکلنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آندھرا پردیش میں بعض سیاسی مسلمانوں کے بی جے پی کے حق میں بالواسطہ طور پر کچھ کلمات کہنے اور اس پر عوام کے سخت غیض و غضب کے مظاہرہ کے بعد نائب امام جامع مسجد احمد بخاری نے محتاط رویہ اختیار کر لیا تھا۔ دیکھا جائے تو باجپائی جی کی کرسی نے سیاسی مسلمانوں اور درباری علماء کے لئے خاصے مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ اب تک جو لوگ سرکار دربار سے اپنے تعلقات استوار کر کے پوری امت کی حفاظت کا ٹھیکہ لیا کرتے تھے اور جنہیں امت کو تھپکیاں دے کر سلانے کا فن خوب خوب آتا تھا،

ان کے لئے نئی صورت حال میں کام کا میدان تلاش کرنا مشکل ہوگیا ہے گو کہ اس طرح کی خبریں بھی بعض اخبارات میں آئی ہیں کہ بعض اہم مساجد کے اماموں نے بھاجپا کی قیادت سے خفیہ طور پر راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی ہے، البتہ ابھی عوامی غیض و غضب کی وجہ سے بھاجپا سے کھلے عام خوشامد اور التجائے امان کی عمومی صورت حال پیدا نہیں ہو پائی ہے۔

ہندوستانی مسلمان اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں خطرات کے ساتھ ساتھ امکانات بھی ان کے تعاقب میں ہیں۔ اگر بزدل مولویوں کی خوشامد کو مسلم عوام میں اعتبار مل گیا تو آنے والے دنوں میں امت مسلمہ کا زوال خطرناک حد تک تیز ہو جائے گا، البتہ اگر خوشامد اور ذلت آمیز زندگی کے سارے راستے بند پاکر کوئی نئی قیادت حالات کا چیلنج قبول کرنے کے لئے ہمت و جرات کے ساتھ میدان میں آتی ہے تو شور مچاتی، چیختی پکارتی خطرے کی گھنٹی نئی صبح کا صور بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

بی جے پی کے دور حکومت میں مسلمان

(۲)

مسلم نفسیات پر پڑنے والے اثرات کا ایک جائزہ

دہلی میں بھاجپا کے اقتدار کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن اس مختصرے عرصے میں ہندوستانی مسلمانوں پر جو ذہنی اور نفسیاتی کیفیت گزری ہے اس سے اس بات کا واضح اندازہ ہونے لگا ہے کہ اب ان کی ہمت جواب دیتی جارہی ہے۔ حوصلے پست ہورہے ہیں، ولولوں میں وہ تازگی نہیں اور دشمنوں کے مقابلے کا پہلا ساوہ کس بل نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پوری امت خود کو بے یارومددگار پاکر اپنے آپ کو دشمنوں کے سپرد کررہی ہو۔ زندگی کے بقیہ دن وہ ان ہی دشمنوں کے رحم وکرم پر جینا چاہتی ہے۔

عام مسلمانوں کو یہ احساس ہوچلا ہے کہ ان کے کھلے دشمن اب دہلی کے اقتدار پر قابض ہیں اور ملک کے دوسرے حصوں کے علاوہ سب سے بڑی ریاست اترپردیش بھی ان کے حکمرانی میں ہے۔ اترپردیش کو اس اعتبار سے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں اہمیت حاصل ہے کہ یہاں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک چوتھائی آبادی رہتی ہے۔ اس لئے اس خطے میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے اثرات پوری ملی زندگی پر محسوس کئے جاتے ہیں۔ ایک ایسی صورت میں جب دشمن کو لکھنو سے دلی تک سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر دکھانے کا اختیار حاصل ہوگیا ہو اور جب بے بس مسلمانوں کے سیاسی آقاؤں اور نامراد مسیحاؤں کے ہاتھوں سے اقتدار کی باگ ڈور پھسل گئی ہو، ان کے لئے شدید مایوسی اور احساس شکست میں مبتلا ہوجانا عین فطری ہے۔

دریں اثنا بی جے پی کے خفیہ ایجنڈے کی بات بھی مسلمانوں کو پریشان کرتی رہی ہے۔ عام

مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ کل تک جو لوگ بابری مسجد کی مسماری کی تحریک چلاتے تھے اور جن لوگوں نے انہدام کا تمغہ امتیاز اپنے سینوں پر سجا رکھا تھا آج وہ حکومت میں کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔ اب جب وہ بااختیار ہیں مسلمانوں کے خلاف اپنے ناپاک منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے کیا کچھ نہ کریں گے۔ ادھر بی جے پی نے اپنے تنظیمی اجتماعات میں بھی اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ وہ اقتدار کی خاطر اپنے اصل موقف سے دستبردار نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کے حصول کے لئے کوشاں ہے اور چونکہ اہل حکومت کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں اس لئے جو کام بی جے پی کی حکومتیں انجام نہیں دے پارہی ہیں انہیں بی جے پی کا تنظیمی ڈھانچہ انجام دے گا۔ گویا اصل کام تو حکومت سے باہر بی جے پی کے کارکنوں کو انجام دینا ہے۔ البتہ حکومت ہر سطح پر کارکنوں کو ضروری امداد اور سہولتیں فراہم کرتی رہے گی۔

اخبارات میں یہ خبر بھی گشت کر رہی ہے کہ اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ پتھروں کی تراش خراش کا کام چل رہا ہے۔ تعمیر میں کام آنے والی چیزیں اکٹھا کی جارہی ہیں۔ بس ایک مناسب وقت کا انتظار ہے۔ گویا ہر سطح پر مسلمانوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اب وہ پوری طرح ایک دشمن حکومت کے نرغے میں ہیں۔ ان کا مستقبل ان ہی حکمرانوں کے رحم وکرم پر ہے جنہیں وہ اب تک اپنا دشمن نمبر ایک تسلیم کرتے رہے ہیں اور جنہیں انتخابات میں شکست دینے کے لئے مسلمان ان کی مخالفت میں ووٹ ڈالتے رہے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے ایک مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اب وہ جائیں تو جائیں کہاں ؟ مدد کس سے مانگیں ؟ منصفی کس سے چاہیں ؟ کل تک ہمارے ملی بزرگ اور دینی شخصیات حکمرانوں سے کم از کم اس حوالے سے گفتگو کرلیا کرتے تھے کہ حضور ہم آپ کے پرانے بہی خواہ ہیں، ہم نے تو آپ کے نانا موتی لال نہرو کا چہرہ بھی دیکھا ہے یا آپ کے والد جواہر لال نہرو سے بھی ہماری سلام دعا رہی ہے پھر عجب نہیں کہ آپ ہم پر اتنا کرم نہ کریں کہ ان معروضات کو سن لیں جو ہم مسلمانوں کی طرف سے آپ کے پاس لے کر آئے ہیں۔ یہی دلیل راجیو گاندھی کے زمانے میں بھی کارگر تھی اور جب نرسمہاراؤ وزارت عظمیٰ کی کرسی پر بیٹھ گئے تو ان کو بھی احساس دلانے کی کوشش کی گئی کہ آپ اس کانگریس کے سربراہ ہیں جس نے ملک کو آزادی دلائی ہے اور جس میں مسلمانوں کی قربانیوں کو بڑا دخل ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو پرانی وفاداریوں کے طفیل اتنی تو ضمانت دے دیں کہ ہماری مسجد اس ملک میں محفوظ رہے۔

مشکل یہ ہے کہ اب جو لوگ بر سر اقتدار ہیں ان سے پرانے طرز میں کوئی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ فدویانہ التجاؤں کا سابق انداز اب اچانک بے محل ہو گیا ہے اس لئے مسلمانوں کی قیادت کو یہ مشکل پیش آ رہی ہے کہ اب وہ نئے حالات میں کفار و مشرکین سے عرض گزاری کریں تو اس کی بنیاد کیا ہو؟ اب مسلمانوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں اولاً وہ اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے نئے حالات کے لئے باحوصلہ منصوبے ترتیب دیں اور جمہور امت کو یہ باور کرائیں کہ ان کی حفاظت کا کام حکمرانوں کے ذریعے نہیں بلکہ اللہ کی نصرت کے سہارے خود ان کی اپنی کوششوں سے انجام پائے گا۔ وہ کہیں عرض گزارنے کے بجائے خود اپنی بنیادوں پر حالات کو بدل ڈالنے کی جدوجہد جاری رکھیں گے اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ ہر فیصلہ کن گھڑی میں اللہ کی غیر معمولی حمایت حاصل رہے گی۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ سابقہ بزدلانہ رویے کو ذرا توسیع دے کر مسلم قائدین بی جے پی سے معافی تلافی کرلیں اور یہ بتائیں کہ حضور ہم سے غلطی ہوئی تھی، ہم تو خواہ مخواہ کانگریس اور دوسری جماعتوں کو اپنا مسیحا سمجھ بیٹھے تھے۔ حالانکہ مسیحائی کا کام تو آپ لوگ بھی بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ دیکھئے ذرا ہمارے مدارس کے بارے میں کچھ نہ کہئے، پرسنل لاء کو ہاتھ نہ لگائیے اور وقتاً فوقتاً ہمارا دل جیتنے کے لئے کچھ امید افزاء باتیں کرتے رہئے پھر ہم آپ کے ساتھ ہیں، ہمارا ووٹ ہی کیا دل و جان اور ایمان سب آپ کے لیے حاضر ہے۔

مسلمانانِ ہند کے لئے اس وقت یہی دو راستے ہیں۔ پہلے رویے میں ایک چیلنج ہے جس کو قبول کرنے کا دم خم اس وقت مشکل ہی سے نظر آتا ہے البتہ ایک بڑی تعداد دوسرے رویے کی طرف بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

دہلی میں بھاجپائیوں کے بر سر اقتدار آنے کے بعد مسلم تنظیموں، اداروں اور شخصیات کی طرف سے جو بیانات سامنے آئے ہیں اور ملی فرنٹ پر جس نوع کی سرگرمیاں وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں اس سے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ ہم دوسرے رویے پر سفر کے آغاز کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو رہے ہیں۔ گذشتہ دنوں علی گڈھ میں منعقدہ دینی تعلیمی کونسل کے اجلاس میں اس امر پر تشویش کا اظہار کیا گیا کہ مسلم بچوں کو سرکاری اسکولوں میں سرسوتی کی تصویر کے سامنے قومی ترانہ گانے، بھارت ماتا کی تصویر پر پھول چڑھانے، اس کی پوجا ارچنا کرنے، وندے ماترم کہنے اور دوپہر کے وقفے میں کھانے کے بعد بھوجن منتر پڑھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ کونسل کے ذمہ داران نے اس موقع پر جو تجاویز منظور کیں اور

جو حل تلاش کیا وہ یہ کہ ان تمام مسائل کے حل کے لئے حکومت سے درخواست کی جائے اور بس، لہٰذا حکومت سے جی بھر کر یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ ایسا نہ کرے اور ویسا نہ کرے، فلاں حکم کو واپس لے اور فلاں باتوں کو روک دے۔ اب ظاہر ہے کہ جو حکومت ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں میں احساس بے بسی پیدا کرنے کے لئے اس طرح کی اسکیمیں نافذ کر رہی ہو بھلا وہ خالی خولی درخواستوں سے ان احکامات کو کیوں کر منسوخ کر دے گی؟ اس کا منشاء تو یہی ہے کہ جو مسلمان اب تک اپنے مسائل کے حل کے لئے کانگریسی حکومت کی چوکھٹوں پر سجدے کرتے رہے ہیں وہ اب ہمارے آستانوں پر تعظیم بجالائیں۔ دیکھا جائے تو بی جے پی کے پالیسی ساز مسلمانوں کو اپنے ڈھب پر لانے میں خاصے کامیاب ہیں۔ گذشتہ پچاس برسوں میں یہی تو ہوتا رہا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے لئے مختلف مسائل پیدا کرنے کے بعد مسلم قائدین کے کہنے سننے پر اسے جزوی طور پر واپس لیتی رہی ہے۔ اس طرح مسلمانوں کو بغیر کچھ دیئے دلائے انہیں اپنے اعتماد میں لیا جانا ممکن رہا ہے۔ بی جے پی کی موجودہ حکومت بھی یہی چاہتی ہے کہ مسلمان اپنی مسیحائی کا ٹھیکہ اب کسی اور پارٹی کے بجائے اسے دے دیں تاکہ وہ بھی سابقہ انداز سے مسلمانوں کی خبر گیری کا فریضہ انجام دیتی رہے۔

علیگڑھ میں میر مجلس مولانا علی میاں نے حکومت کو موجودہ رویے سے باز رکھنے کی جو درخواست کی ہے اس میں چیلنج کا انداز نہیں بلکہ وہی فدویانہ لب و لہجہ نمایاں ہے۔ بی جے پی کی موجودہ تعلیمی پالیسیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا "یہ ملک کو ایسی خطرناک منزل کی طرف لے جانے کا اقدام ہے جس کے تصور سے ایک محب وطن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" حب الوطنی کی وہی دہائی اور دیش بھگتی کی وہی پرانی باتیں۔ حالانکہ مسلمانوں کو اگر موجودہ سرکاری پالیسی پر کوئی تشویش ہے تو خالص مسلمان کی حیثیت سے۔ ملک جائے یا رہے اصل چیز تو یہ ہے کہ ہمارا ایماں سلامت رہے۔

خطرہ ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں نے پھر وہی درخواست گزاری کا رویہ اختیار کیا اور اپنے امور کی نگہبانی کا کام غیر مسلموں کے سپرد کر کے مطمئن ہو گئے تو آنے والے دنوں میں ان کے زوال کا گراف بہت تیزی سے نیچے چلا جائے گا۔ اس لیے کہ ان کے پاس وہ غیرت نفس بھی نہ ہوگی جو ان کو گاہے بگاہے یہ احساس دلاتی رہے کہ وہ کوئی اور نہیں، آخری رسولؐ کی امت ہیں جو بہت دنوں تک کسی غیر اسلامی نظام میں زندگی نہیں گزار سکتے۔ پھر ان کے اندر سے یہ احساس بھی ختم ہو جائے گا کہ ہندوستان

کوئی اور ملک نہیں بلکہ سابق دار الاسلام ہے جسے دوبارہ دار الاسلام بنانے کی ذمہ داری ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے۔ گذشتہ دنوں مدارس کے حوالے سے جب ایک ذمہ دار پولیس آفیسر نے یہ بات کہی کہ دینی مدارس پاکستانی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کے اڈے بن گئے ہیں تو ان بے سرپیر کی باتوں کا سختی سے نوٹس لینے اور عدالت میں سخت چارہ جوئی کے بجائے علماء کرام کی طرف سے بڑے فدویانہ انداز سے اس طرح کے بیانات آتے رہے کہ حضور ہم تو دیش بھگت لوگ ہیں۔ دیش کی آزادی میں دیوبند کا حصہ ہے، علماء کی قربانیاں ہیں۔ دیکھئے اتنا ظلم تو نہ کیجئے کہ ہم جیسے بے ضرر لوگوں کو ان خطرناک الزامات سے پریشان ہونا پڑے۔

جدھر دیکھئے فدویانہ عرض گزاری کا وہی انداز ہے۔ اب صرف اتنا رہ گیا ہے کہ حسب سابق ہندوستانی مسلمانوں کا ملی وفد اور محترم علماء کرام کا کارواں ملت کے تحفظ کا مقدمہ لے کر بنفس نفیس واجپئی جی کے آستانے پر حاضر ہو اور انہیں اپنی خیر خواہی اور وفاداری کا احساس دلاکر ان سے تحفظ کی ضمانت حاصل کرے جیسا کہ ہم سابق حکمرانوں کے دور میں کرتے رہے ہیں لیکن تب ایک اساس موجود تھی کہ ہم آپ کے پرانے غلام ہیں، ہماری آپ سے راہ و رسم بہت پرانی ہے۔ البتہ اب نئی صورت حال میں عرض گزاری کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ آپ ہی جیتے اور ہم ہار گئے۔ ہمیں اپنی شکست تسلیم ہے۔ اب ہم پوری طرح آپ کے رحم و کرم پر ہیں اور آپ ٹھہرے بھلے مانس لوگ تو کم از کم اتنا تو کیجئے کہ ہمیں موت کی سزا یوں اچانک نہ دیجئے۔ پچھلی حکومتیں بھی تو قسطوں میں موت بانٹتی رہی ہیں بس آپ سے بھی یہی درخواست ہے۔ بھلا ہم کوئی زندگی تو نہیں مانگتے پھر آپ کو ہمارا یہ مطالبہ تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہ ہونا چاہئے۔

بی جے پی کے دور حکومت میں مسلمان
(۳)

قرائن بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کو سرنگ کے دوسری طرف روشنی نظر نہیں آرہی ہے

گذشتہ دنوں درگاہ اجمیر شریف سے جبہ و دستار والے مسلمانوں کے ایک وفد نے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کو نئی دہلی میں ایک یادگاری تحفہ پیش کیا۔ نیک تمناؤں کے تبادلے ہوئے اور ہاتھ اٹھا اٹھاکر واجپئی جی کی سلامتی اور ان کے اقبال کے لئے خوب خوب دعا کی گئی۔ اس طرح گویا بھاجپائی حکومت کی طرف ہندوستانی مسلمانوں کے رویے کا ایک اعلان عام ہوگیا۔ مرکز میں بھاجپائی حکومت کے قیام کے بعد کچھ دنوں تک تو بڑے احتیاط کا مظاہرہ کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ عام مسلمانوں کو ایسا لگا کہ اس ملک میں زندہ رہنے کے لئے انہیں نئے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہوگی۔ پھر جو لوگ کانگریس اور جنتادل کے زوال کے بعد سرپرستی سے محروم ہوگئے تھے ان کے لئے بھی اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ نئے حکمرانوں سے راہ و رسم پیدا کریں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی بھی عجب مشکل ہے۔ کفر کے اتھاہ سمندر میں انہیں اپنے لئے راستہ بنانا دشوار ہورہا ہے۔ انہیں اس بات کا تو احساس ہے کہ نئی حکومت بہت تیزی کے ساتھ ان کے اعصاب پر حملے کررہی ہے لیکن وہ اس نئی صورت حال میں کسی انقلابی راستے کو اختیار کرنے کے بجائے ان ہی پرانی ترکیبوں سے کام چلانا چاہتے ہیں جن کے ازکار رفتہ ہونے کا انہیں پورا پورا یقین ہے۔ اترپردیش میں وندے ماترم کے حوالے سے جو نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے وہاں بھی مسلمانوں کی طرف سے کوئی موثر قدم اٹھانے کے بجائے صرف تجاویز اور قرارداد پر اکتفا کیا گیا ہے۔ دینی تعلیمی کونسل نے وزیر اعلیٰ یوپی سے تحریری طور پر درخواست کی ہے کہ مسلمانوں پر زبردستی ہندو ثقافت کو نہ تھوپا جائے۔ گویا جن لوگوں

نے ہم پر یہ ناقابل برداشت صورت حال تھوپی ہے ہم ان سے ہی یہ توقع کئے بیٹھے ہیں کہ وہ اس صورت حال کو بدل ڈالیں گے۔ گو کہ تحریری طور پر وزیر اعلیٰ نے یہ یقین دلایا ہے کہ مسلمانوں کے حوالے سے متعلقہ محکموں کو یہ ہدایت جاری کردی گئی ہیں لیکن یہ سب زبانی باتیں ہیں۔ یوپی کے سرکاری تعلیمی اداروں سے مستقل ہندو بھجن اور وندے ماترم کی آوازیں آرہی ہیں۔ عجب نہیں کہ آنے والے دنوں میں حکومت اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے اور کچھ لے دے کر معاملہ اختتام کو پہنچے۔ البتہ حکومت کی یہ خواہش ضرور ہوگی کہ وہ مسلم قائدین سے اس کے عوض بھاجپا کے لئے وفاداری کا مطالبہ کرے۔ دیکھا جائے تو یہ وہی تکنیک ہے جس پر گذشتہ پچاس برسوں سے کانگریس کی مختلف حکومتیں عمل کرتی رہی ہیں یعنی سب سے پہلے تو مسلمانوں کے لئے ایک مسئلہ پیدا کیا جائے اور پھر مسلمانوں کی طرف سے اگر بار بار اس مسئلے کے حل کے لئے اصرار بڑھے تو اس کو جزوی طور پر حل کرکے مسلمانوں کی ہمدردی خرید لی جائے اور انہیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ وہ پوری طرح حکومت کے رحم وکرم پر ہیں۔ ان کا جینا اور مرنا غیر مسلم حکمرانوں کے ہاتھ میں ہے اس لئے وہ اگر اپنی خیر چاہتے ہیں تو ہماری حکومت کے وفادار خادم بن کر رہیں۔ اپنا ووٹ ہمارے لئے وقف کردیں اور ہر الیکشن میں اپنی ساری توانائیاں ہماری حمایت میں صرف کرتے رہیں۔ کانگریس کے بعد اب بی جے پی بھی مسلمانوں کو اپنا وفادار خادم بنانا چاہتی ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ان کے پاس ایسی کوئی قیادت نہیں جو انہیں قرارداد اور بھیک کی سیاست سے نجات دلاسکے۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ حکمراں ان کی جان کے درپے ہیں۔ ان سے ان کا تشخص چھین لینا چاہتے ہیں لیکن وہ اپنے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں پاتے کہ وہ ان ہی حکمرانوں سے اپنے تشخص کی ضمانت کا مطالبہ کریں۔ یہ ایک ایسا شیطانی دائرہ ہے جس میں ہندوستانی مسلمان مسلسل پچاس برسوں سے گھوم رہے ہیں۔ وہی مسلم شناخت پر حملہ، مسائل کے پیدا کرنے کا وہی انداز اور اس کے حل کے لئے علماء و قائدین کے وہی جلسے، وہی گھن گرج، وہی انداز، وہی قرارداد اور وہی درخواست، حکمرانوں کی خدمت میں عرض گزاری کا وہی ملتجیانہ رویہ، جی حضوری کی وہی کیفیت اور ان مسائل کے کسی قدر حل ہوتے ہی خادمین امت کا وہی مست خرام۔ پچھلے پچاس سالوں سے اس ملک میں یہی سب کچھ ہوتا رہا ہے۔ کانگریس کی حکومت بھی ایسے مسلمانوں کی تلاش میں رہتی تھی جو مسلمانوں کے مسائل اس کی خدمت میں پیش کرسکیں اور اب بی جے پی بھی مسلمانوں کو دعوت دے

رہی ہے کہ وہ ہمارے ہی پیدا کردہ مسائل لے کر ہمارے سامنے آئیں۔ ہم اسے حل کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ کانگریس ہو یا بی جے پی یا حکمرانی کے منصب پر کسی اور کافر حکمراں کا ظہور کیوں نہ ہو، یہ سب کے سب ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے رحم وکرم پر برتنا چاہتے ہیں۔ ان سبھوں کی یہ کوشش ہے کہ اس ملک میں مسلمان ایک ایسی بے جان اقلیت کی حیثیت سے زندہ رہنے پر آمادہ ہوجائیں جن سے حکمرانوں کو کبھی کوئی خطرہ نہ ہو اور ان کا کام صرف یہ ہو کہ وہ ذلیل زندگی کے حصول کے لئے کافر و مشرک آقاؤں کے دروں پر کاسہ گدائی لئے اپنے تحفظ کی صدا لگاتے رہیں۔

البتہ کانگریس اور بی جے پی میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ مؤخر الذکر اسلام دشمنوں کا ایک منظم گروہ ہے۔ ملک بھر میں اس کے پاس تربیت یافتہ کارکنوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو ہر لمحہ اسلام اور مسلمانوں کو اس ملک سے مٹانے کے لئے سرگرم عمل ہیں اس لئے اس بات کا امکان اب بہت زیادہ بڑھ گیا ہے کہ جو کام کانگریس اپنے پچاس سالہ دور حکومت میں سست رفتاری سے کرتی رہی ہے وہ اب بی جے پی کے دور حکومت میں انتہائی تیزی کے ساتھ انجام پاجائے گا۔ ایسا اس لئے بھی کہ کانگریس کی مسلسل پچاس سالہ نوازشوں نے مسلمانوں کو اس قدر کمزور کردیا ہے کہ اب ان کے حوصلے کسی بڑی مزاحمت کے لئے ناکافی پڑ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں بی جے پی کی طرف سے اب جو تیز رفتار کارروائی کی جارہی ہے اس میں اسلام دشمنوں کی کامیابی کے امکانات پہلے سے کہیں زیادہ روشن ہوگئے ہیں۔ گویا ہندوستانی مسلمان اس وقت تاریخ کے ایک ایسے نازک موڑ پر کھڑے ہیں جہاں تند اور تیز مخالف ہوا ان کے چراغ ملی کو اب بجھایا ہی چاہتی ہے۔ اب منت سماجت کا رویہ اور عرض گزاری کا کوئی انداز ہمارے ملی وجود کی ضمانت کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔

یہ بات نظر انداز نہیں کی جانی چاہئے کہ آج جو لوگ دلی کی حکومت پر قابض ہیں وہ بظاہر مسلمانوں کے لئے خیر سگالی کی جتنی ہی دلسوز گفتگو کیوں نہ کریں واقعہ یہ ہے کہ وہ دلی کے تخت پر صرف اس لئے وارد ہوئے ہیں کہ اس ملک سے اسلام اور مسلمانوں کے آثار بزور بازو مٹا سکیں۔ ان عزائم کا اظہار وہ اس وقت بھی کر رہے تھے جب وہ حکومت سے دور تھے اور اب بھی جب حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آگئی ہے وہ ان ہی عزائم کا اعلان کر رہے ہیں۔ لوک سبھا میں اڈوانی جی نے آر ایس ایس کے دفاع میں جو کچھ کہا ہے اس سے بھی اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ بی جے پی نے ہندی، ہندو اور

ہندوستان کے پرانے خواب کو ترک نہیں کیا ہے۔ بلکہ اڈوانی جی نے تو یہاں تک کہا کہ انہوں نے حب الوطنی اور وطن پرستی کی تربیت آر ایس ایس میں حاصل کی ہے اور یہ کہ وہ حکومت کے امور کو چلانے کے لئے آر ایس ایس کے مشورے کو قابل اعتراض عمل نہیں سمجھتے۔ اڈوانی ہوں یا واجپئی، جوشی ہوں یا بی جے پی کے دوسرے اہم قائدین، واقعہ یہ ہے کہ ان سبھوں کی تربیت آر ایس ایس کی گود میں ہوئی ہے اس لئے یہ بات عین فطری ہے کہ یہ حضرات اب اس ملک میں آر ایس ایس کے خواب کو سچ کر دکھانے کے لئے ریاستی اثر و رسوخ کو استعمال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ آر ایس ایس کے نزدیک اس ملک میں مسلم مسئلے سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے جو بہت حد تک نازی جرمنی میں یہودیوں سے نمٹنے کے طریقے سے ملتا جلتا ہے۔ آر ایس ایس کے گرو گول والکر نے اپنی بدنام زمانہ تصنیف (We, our nationhood defined) مطبوعہ ۱۹۳۹ء میں اس امر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں صرف قدیم ہندو قوم کو باقی رہنا چاہئے۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں صرف ہندو قوم . . . جب تک مسلمان یا دوسرے غیر ہندو اپنی مذہبی، ثقافتی اور سماجی شناخت پر اصرار کریں جب تک انہیں غیر ملکی سمجھا جائے گا... غیر ملکیوں کے لئے اب صرف دو ہی راہ ہے یا تو وہ مقامی لوگوں میں گھل مل جائیں اور ان کی ثقافت اختیار کرلیں یا پھر ان کی خوشنودی اور رحم و کرم پر زندہ رہیں ... ہندوستان کی غیر ہندو اقوام پر لازم ہے کہ وہ ہندو ثقافت اختیار کریں۔ ہندو مذہب کو متبرک اور مقدس جانیں ... بالفاظ دیگر وہ اپنی غیر ملکیت کو خیر باد کہہ دیں یا پھر خود کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ نہ کوئی مطالبہ کریں اور نہ ہی کسی خصوصی حیثیت پر اصرار حتی کہ شہری حقوق بھی انہیں نہیں ملنا چاہئے ...... اس ملک میں صرف ہندو قوم بستی ہے۔ مسلمان اور دوسری قومیں اگر دیش مخالف نہیں تو کم از کم دائرہ دیش بھگتی سے باہر تو ہیں ہی۔

گول والکر جو آر ایس ایس اور اس کی تمام ذیلی تنظیموں کے سب سے محترم گرو کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار مسلمانوں کو دشمن سے تعبیر کرتے ہیں۔ آر ایس ایس ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کے لئے کوشاں رہی ہے جس میں صرف ایک قوم بسے گی، ایک زبان بولی جائے گی اور ایک دھرم کے ماننے والے باقی رہ جائیں گے۔ رہے مسلمان تو ان کا علاج وہی ہے جو ہٹلر نے

یہودیوں کا جرمنی میں کیا تھا۔

دہلی میں بھاجپائی حکومت کے قیام کے بعد آر ایس ایس کی قیادت مسلمانوں کو یہ مشورہ بھی دیتی رہی ہے کہ وہ چونکہ نسلی طور پر کبھی ہندو سماج کا حصہ رہے تھے اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ دوبارہ ہندو مذہب میں لوٹ آئیں۔ گذشتہ دنوں اندور میں ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے آر ایس ایس کے موجودہ سربراہ راجندر سنگھ نے یہ بات کہی کہ ہم نے انگریزوں کے آثار کو تو اس ملک سے مٹادیا لیکن مغلوں کے آثار اس ملک میں ہر طرف پھیلے پڑے ہیں، انہیں ہر قیمت پر ختم کیا جانا چاہئے۔ انہوں نے کاشی، متھرا اور ایودھیا میں ہندوؤں کے مقدسات کی تعمیر پر زور دیا اور مسلمانوں کو یہ مشورہ بھی دے ڈالا کہ وہ مسلمان حکمرانوں کے لئے اپنے دل میں احترام کا کوئی جذبہ نہ رکھیں۔

یہ بات ہر کسی پر عیاں ہے کہ بی جے پی تنظیمی اعتبار سے آر ایس ایس کی سیاسی شاخ ہے اور یہ کہ بی جے پی کے موجودہ قائدین آر ایس ایس کے تربیت یافتہ معتمد کارکن ہیں جن کی تربیت ایام شباب سے آر ایس ایس کی گود میں ہوئی ہے۔ البتہ اگر آر ایس ایس کی طرح وہ مسلمانوں کے لئے براہ راست زہر افشانی سے گریز کر رہے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حکمرانوں کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں ورنہ جہاں تک آر ایس ایس کے خواب کو سچ کر دکھانے کی بات ہے تو اس کے لئے بی جے پی کی حکومت، پارٹی کے کارکنان اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے آر ایس ایس کی ذیلی تنظیموں کے منظم کارکنان ہر لمحہ سرگرم عمل ہیں اس لئے کسی کو یہ توقع نہیں ہونی چاہئے کہ بی جے پی اقتدار کا مزہ چکھنے کے بعد اب مسلمانوں کی طرف خیر سگالی کا ہاتھ بڑھا رہی ہے۔ گو کہ موجودہ حکومت کی ترجیحات میں یکساں سول کوڈ کا مسئلہ سرے سے خارج از بحث ہے لیکن بی جے پی کی طرف سے وقتاً فوقتاً یکساں سول کوڈ کی حمایت میں بیانات آتے رہے ہیں۔ پھر یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جانی چاہئے کہ دہلی میں بی جے پی کو اقتدار اسی وقت مل سکا ہے جب آر ایس ایس کے منظم کارکنان نے ملک بھر میں بی جے پی کو اپنی حمایت دی ہے اس لئے یہ بات فطری ہے کہ حکومت کے لئے پالیسی سازی کا کام آر ایس ایس کے مشورے کے بغیر انجام نہیں پاسکے گا۔ پچھلے دنوں لوک سبھا میں اعتماد کے ووٹ کے دوران جب ایک گروپ نے پارلیمنٹ میں واجپئی اور اڈوانی سے گول والکر کی مذکورہ تصنیف کے بارے میں پوچھا اور اقلیتوں سے نمٹنے کے لئے گول والکر کے فاشسٹ رویے کی نشاندہی کی تو اڈوانی صاحب نے صرف یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ وہ کتاب مدت سے نایاب ہے اور یہ کہ

مصنف نے اپنے خیالات تبدیل کرلئے تھے۔ یہ تو کہنے کی باتیں ہیں لیکن آج تک آر ایس ایس کے کسی بھی قابل ذکر رہنما نے گول والکر کے ان انتہاپسندانہ خیالات کی تردید کی ہمت نہیں کی۔ آر ایس ایس کا پورا فلسفہ مسلم دشمنی سے قوت حاصل کرتا ہے۔ ہندی، ہندو، ہندوستان کا خواب اسی وقت پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جب اس ملک سے مسلمانوں کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل کردیا جائے اور ایسا گول والکر کے نزدیک دو ہی صورتوں میں ہوسکتا ہے۔ اولاً یا تو مسلمان دوبارہ خود کو ہندو ثقافت میں ضم کردیں۔ ثانیاً یا پھر خود کو ہندوؤں کی خوشنودی اور ان کے رحم وکرم پر چھوڑدیں۔ بی جے پی اسی عمل کو ثقافتی قوم پرستی سے تعبیر کرتی ہے اس لئے کسی کو ایک لمحے کے لئے بھی یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ آر ایس ایس کے تربیت یافتہ کارکنان حکومت پاکر اب اس ملک میں اپنے ان عزائم سے دست بردار ہوجائیں گے جن کے حصول کے لئے انہوں نے حکومت حاصل کی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ہر لمحہ مسلسل خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اجمیر شریف کے وفد کا واجپئی جی کو نیک تمنائیں پیش کرنا یا مسلمانوں کی طرف سے کلیان سنگھ کی خدمت میں وندے ماترم کے عذاب سے بچالینے کی التجا، یہ دراصل اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ مسلمان احیاء پرستوں کے رحم وکرم اور ان کی خوشنودی کے ذریعے اس ملک میں زندہ رہنے پر آمادہ ہوگیا ہے جو یقیناً ایک تشویشناک صورت حال ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فریاد والتجا کا رویہ ترک کرکے ایسے انقلابی رویے کی بنیاد ڈالیں جس سے آنے والے دنوں میں التجا و فریاد کے شیطانی چکر سے نجات مل سکے ورنہ اندیشہ ہے کہ آنے والے دنوں میں ہندوستانی مسلمانوں پر سیاسی بے بسی اور اذیت ناک محرومی کے سایے مزید گہرے ہوتے جائیں گے۔

اے خاصہ خاصان رسلؐ وقت دعا ہے

اے خدا کے رسولؐ !

فدا ہوں میرے ماں باپ، قربان جائیں ہماری آرزوئیں اور اولاد۔

مدت گزری سوچتا رہا، تڑپتا رہا، اضطراب میں راتیں گزریں اور صبح ہونے کو نہ آئی۔ شب سے سحر ہونے لگی لیکن اس سحر سے سپیدہ سحر طلوع نہ ہوا۔ رات ہی رات ہر طرف رات، مکمل تاریکی جیسے تاریکی کے عذاب سے تنگ آکر دم گھٹنے لگے۔ جیسے صحرا میں کوئی مسافر راستہ بھٹک گیا ہو، جیسے اندھیرے میں کوئی فوج اپنے ہی ساتھیوں پر حملہ آور ہو گئی ہو اور نفسی نفسی کی چیخ و پکار میں یہ سمجھ میں نہ آتا ہو کہ واقعی یہاں کون سا معرکہ گرم ہے اور کس کے ہاتھوں کس کا قتل ہو رہا ہے ؟

سمت کے کھوئے جانے کا احساس اور نہ دکھائی دینے کا عذاب کتنا اذیت ناک ہے ہند کے ان باسیوں پر جو خود کو -- اے خدا کے رسولؐ -- آپ کا پیروکار کہتے ہیں۔

سرزمین ہند میں آپ کے ماننے والوں پر آج جو کیفیت طاری ہے وہ کسی عذاب سے کم نہیں۔ ایک عقوبت گاہ ہے جہاں ہر لمحہ جہنم کا سا عذاب جاری ہے، گویا ہر لمحہ تیرے ماننے والے اس سرزمین میں ایک ارضی جہنم میں سانس لینے پر مجبور ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے -- اے خدا کے رسول -- کہ اذیت کی یہ زندگی اب ان کے معمول کا ایک حصہ بن گئی ہے اور اس ملک کے پچیس کروڑ مسلمانوں کو ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ ایک معمول کی زندگی ہو۔

کہنے کو اس ملک میں ان کی تعداد کچھ کم نہیں۔ سرکاری اعداد و شمار انہیں بارہ کروڑ بتاتے ہیں اور خود اہل ایمان کا اپنا اندازہ ہے کہ ان کی تعداد پچیس کروڑ سے کم نہ ہوگی لیکن یہ بھی عجب ماجرا ہے کہ اتنی بڑی عددی قوت کو اس ملک میں اقلیت کا نام دیا جاتا ہے اور خود اہل ایمان بھی خود کو اقلیت کہنے اور

کہلانے پر مصر ہیں۔ پچاس سال سے اقلیت اقلیت کی رٹ لگانے سے اب ان کے اندر اقلیتوں والی چال ڈھال بھی پیدا ہو گئی ہے۔ خود کو کمزور سمجھنے کی نفسیات نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ وہ اب ہر لمحہ اپنی حفاظت کی سوچتے اور عافیت کی تلاش کو اپنا ہدف جانتے ہیں حالانکہ --اے خدا کے رسولؐ -- اللہ کی کتاب میں اقلیت کی اکثریت پر فتح کے فلسفے کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور خود آپ نے اپنے عمل سے ہمیں یہی تو درس دیا ہے کہ مٹھی بھر اہل حق کا گروہ باطل کے اتھاہ سمندر پر قابو پالیتا ہے۔

بدر کا میدان اور اہل ایمان کی بے سروسامانی اور --اے خدا کے رسولؐ -- آپ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے یہ کلمات کہ بار الٰہا! اگر آج مٹھی بھر اہل ایمان کا یہ گروہ اس سرزمین سے مٹادیا گیا تو شاید قیامت تک کوئی تیرا نام لینے والا نہ ہوگا۔ تب بھی --اے خدا کے رسولؐ -- اللہ کی خصوصی نصرت کے سہارے ٹوٹے پھوٹے پریشان حال اہل ایمان کے قافلے نے منظم کفر کو شکست دے دی تھی۔ ایسا بھی نہیں کہ بدر کا یہ واقعہ ہماری تاریخ کی کتابوں سے غائب ہو گیا ہو۔ ہم اپنی ملی مجالس میں اس واقعہ کو سنتے اور سر دھنتے ہیں لیکن عملی دنیا میں نہ جانے کیوں ہم پر اقلیت کی نفسیات حاوی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اب ہماری ملی زندگی کی تمام تر منصوبہ بندی ایک اقلیت کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ ہم خود کو مٹھی بھر اہل ایمان کا ایک گروہ نہیں سمجھتے بلکہ ایک مذہبی اقلیت گردانتے ہیں جو ہر لمحہ اپنے تحفظ کے خوف سے دوچار ہے۔

حد تو یہ ہے کہ اب ہمارے درمیان ایسے ادارے موجود ہیں جو مسلمانوں کو اقلیت باور کرانے اور اقلیت کی حیثیت سے ان کو زندگی جینے کی تربیت دے رہے ہیں بلکہ بعض صوبوں میں اور مرکزی سطح پر بھی نظام کفر نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے باضابطہ کمیشن قائم کر رکھے ہیں۔ اور --اے خدا کے رسولؐ -- آپ کے پیروکار انصاف کی تلاش میں ان بے ضرر اداروں کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ یہ کتنی مضحکہ خیز صورت حال ہے --اے خدا کے رسولؐ -- اور کتنا عجب ہے یہ پروپیگنڈہ کہ شیروں کو یہ یقین آجائے کہ وہ واقعی گیدڑ ہیں اور اپنی گیدڑیت کے خیال میں مبتلا وہ اپنی زندگی کی زمام کار کسی اور کے حوالے کر دیں، حالانکہ ان کی شکل و صورت شیروں جیسی ہے، پنجوں میں وہی قوت اور چال ڈھال میں وہی جاہ و جلال نمایاں ہے، لیکن نہ جانے کیوں انہیں یہ یقین ہو چلا ہے کہ وہ اب شیر نہیں رہے۔ حالانکہ جو لوگ اس ملک پر پچھلے پچاس سالوں سے حکمراں ہیں، عددی اعتبار سے ان کی قوت اہل ایمان سے بہت

کم ہے لیکن وہ کسی اقلیت کی نفسیات سے کہیں اوپر اٹھ کر ایک مصنوعی اکثریت کے زعم میں مبتلا ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہیں جہاں شیروں پر گیدڑوں کی حکمرانی قائم ہوگئی ہے۔

اے خدا کے رسولؐ! آپ کے امتی اس سرزمین میں بے یارومددگار ہیں۔ اسلاف کی دلی اب ان لوگوں کے قبضے میں ہے جو ہر لمحہ آپ کی ایک ایک نشانی مٹانے پر تلے ہیں۔ انہیں اس بات سے چڑ ہے کہ مسجدوں سے اللہ کی کبریائی اور آپ کی رسالت کا اعلان ہو نوبت بہ ایں جا رسید کہ نظام کفر کی بعض عدالتوں نے **اشھد ان محمد رسول اللہ** کہنے پر باقاعدہ اعتراضات وارد کر دیئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ محمد کی رسالت کا اعلان ذرا دھیمے دھیمے کرو، اس طرح کرو کہ ہماری دیواروں میں کوئی شگاف محسوس نہ ہو۔ نہ جانے کتنی مسجدیں ہیں جو مسمار کر دی گئیں۔ نہ جانے کتنے قبرستان توسیعی منصوبوں کی زد میں آگئے۔ اسلاف کی دلی جہاں ہر چہار طرف اسلامی علامتوں کی بہتات تھی، جہاں آپ کے پیروؤں نے کم و بیش ہزار سال تک حکومت کی تھی اور جس شہر کے ذرے ذرے سے اسلاف کی یاد تازہ ہوتی تھی، اب اسی شہر میں مساجد اصطبل میں بدل گئے ہیں۔ عیدگاہوں پر غاصبوں کا قبضہ ہے۔ قبرستان سکڑتے سکڑتے غائب ہوگئے ہیں اور جو مسجدیں فن تعمیر کے بہترین نمونوں کی حیثیت سے اب بھی باقی ہیں ان میں سے بیشتر میں اہل ایمان کو نماز کی اجازت نہیں۔ کل تک جن عالیشان مسجدوں میں قال اللہ قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی تھیں آج ان میں چمگادڑ پناہ گزیں ہیں۔ ویرانی کا عجیب عالم ہے۔ لگتا نہیں کہ کبھی اسی راستے اہل ایمان کے قافلے گزرے تھے۔

وہی کارواں جس نے آپ کی قیادت میں مکہ سے یثرب کو کوچ کیا تھا اور جو آناً فاناً دنیا کی تسخیر کے لئے نکل پڑا تھا اور جس کے جاہ و جلال کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کے حوصلے پست ہو جاتے تھے آج وہی کارواں -- اے خدا کے رسولؐ -- سرزمین ہند میں بے یارومددگار ہے۔ کوئی پچاس سال پہلے کی بات ہے جب تاریخ کے نازک لمحے میں آپ کی امت کے ساتھ ایک بڑا حادثہ پیش آیا۔ نہ جانے پوری امت پر یہ خیال کب اور کیسے غالب آگیا کہ وہ تعداد میں تھوڑے ہیں۔ پروپیگنڈہ اتنا سخت تھا کہ بڑے بڑوں کی عقل کند ہوگئی، حواس منجمد ہوگئے اور بہتوں نے صرف اپنی امان کے لئے ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کا بگل بجا دیا۔ حالانکہ -- اے خدا کے رسولؐ -- اس وقت بھی امت کے اندر ماہرین شریعت کی کمی نہ تھی اور اس حقیقت کو جاننے والے موجود تھے کہ سابق دارالاسلام کے کسی ایک

حصے کی آزادی کے لئے کسی دوسرے حصے کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ دشمن سے سرزمین اسلام کے ایک انچ کا سودا کرنا بھی شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اگر کوئی راستہ تھا تو صرف یہ کہ سابق دار الاسلام کو دوبارہ دار الاسلام بنانے کی کوشش کی جاتی لیکن تب امت کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی جو اسلام اور مسلمانوں کے مصالح سے واقف نہ تھے۔ ان کی تربیت مغرب کی دانش گاہوں میں ہوئی تھی، وہ انہی کی زبان بولتے اور انہی کا خیال سوچتے تھے۔ رہے روایتی اہل شریعت تو وہ پہلے ہی گاندھی کے ہاتھوں پر بیعت کر چکے تھے۔ پھر ایسی حالت میں ان لوگوں کی کیونکر نہ بن آتی جو اسلامی تعلیم سے نابلد نظام اسلامی کے قیام کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ نعروں اور ہنگاموں کا ایک ایسا طوفان آیا جس میں بڑے بڑوں کے دل و دماغ ماؤف ہوگئے۔ بے شمار اہل ایمان کی قربانیوں سے آزادی کا جو سورج طلوع ہوا اس نے آنے والے دنوں میں برصغیر ہندو پاک میں قوت اسلامی کا چراغ گل کر دیا، گویا وہ ایک رات تھی جو صبح کی شکل میں نمودار ہوگئی تھی۔ اہل ایمان کی قوت تین حصوں میں منتشر ہوگئی۔ ہندوستانی مسلمانوں پر جو گزری سو گزری خود پاکستان اور بنگلہ دیش کو دوبارہ دار الاسلام بننا نصیب نہ ہوا اور اب وہاں بھی آپ کی لائی ہوئی شریعت الٹے سیدھے لوگوں کی خود ساختہ شریعت کے تابع ہے۔ کتنا بڑا ظلم ہے یہ -- اے خدا کے رسولؐ -- آپ کی شریعت مطہرہ کے ساتھ کہ جن لوگوں نے آپ کے نام پر ایک خطہ زمین حاصل کیا تھا انہوں نے آپ ہی کی شریعت کو اپنے ہوا و ہوس کے تابع بنا رکھا ہے۔

منقسم ہندوستان میں آپ کے پیروکاروں پر یہ عرصہ بہت سخت گزرا ہے۔ اگر جان جاتی اور مال کا زیاں ہوتا تو ہمیں اس کا کچھ زیادہ افسوس نہ ہوتا کہ ہم یہ سب کچھ -- اے خدا کے رسولؐ -- آپ کے لیے قربان کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں، لیکن ہمیں شرمندگی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں ہم نے جو کچھ کھویا ہے وہ آپ کے راستے میں نہیں، جو قربانیاں دی ہیں وہ آپ کے مشن کے لئے نہیں۔ ہمیں قلق ہے اس صورت حال کا، لیکن ہم کرتے بھی تو کیا کہ ہم میں سے بہتوں کو اس صورت حال کا احساس ہی نہ تھا۔

آج جب دلی کے تخت پر ہم آپ کے دشمنوں کو چیختا چنگھاڑتا دیکھتے ہیں تو ہمارا دل ڈوبا جاتا ہے کہ ہائے یہ سب کیسے ہوگیا؟ ہمیں افسوس ہے -- اے خدا کے رسولؐ -- کہ پچیس کروڑ پیروکاروں کی موجودگی کے باوجود آپ کی شریعت اس ملک میں معطل ہے اور خود آپ کے امتی اس بات پر مجبور ہیں کہ وہ کارگہ حیات میں شریعت کفر کی اتباع کریں حتیٰ کہ مسلم پرسنل لاء کے نام پر جو شریعت سے

علامتی تعلق قائم ہے اب اسے بھی ختم کرنے کا اعلان ہو رہا ہے۔ ہمیں خطرہ ہے کہ کہیں ہم لوگ پورے کے پورے کفر میں داخل نہ ہو جائیں لیکن اے خدا کے رسولؐ! آپ کو تو آدھے کچے پکے مسلمان بھی پسند نہیں۔ پھر ہم ہندوستانی مسلمان جن کی پوری زندگی نظام کفر کی اتباع میں لت پت ہے، کس منہ سے آپ سے اپنا تعلق جتائیں؟

یقیناً ہم سے بڑا جرم سرزد ہوا ہے۔ پچھلے پچاس برسوں سے آپ کے پیروکاروں نے اس ملک میں آپ کے سیاسی ایجنڈے کو منجمد کر رکھا ہے۔ اے خدا کے رسولؐ! کہنے کو تو یہ سب خود کو آپ کا پیروکار بتاتے ہیں لیکن عملی زندگی میں ان لوگوں نے کفار و مشرکین کی اتباع اختیار کر رکھی ہے۔ کہنے کو تو وہ آپ کے امتی ہیں لیکن کم ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے کفار و مشرکین کے ہاتھوں پر بیعت نہ کی ہوگی۔ اے خدا کے رسولؐ! کتنا عجیب ہے یہ تضاد کہ جو لوگ مسجد کے منبروں سے اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کی دعائیں کرتے ہیں وہی لوگ غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کو اقتدار سونپنے کے لئے فتوے جاری کرتے ہیں۔

اے خدا کے رسولؐ! آپ نے تو یہ کہا تھا کہ کفر ملۃ واحدۃ ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں، معاون اور رفیق ہیں لیکن ہم میں کچھ ایسے عقل مند پیدا ہوگئے ہیں جو بعض کافروں کو سیکولر بتاتے ہیں، مسلمانوں کا مونس و غمخوار گردانتے ہیں حالانکہ ان ہی سیکولر کافروں کے ہاتھوں گذشتہ پچاس برسوں سے امت پر قیامت ٹوٹتی رہی ہے اور -- اے خدا کے رسولؐ -- آپ نے مومن کی فراست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی تو فرمایا تھا کہ وہ ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا ہے لیکن اب ہمارے درمیان ایسے لوگ عنقا ہوگئے ہیں۔ آپ کی امت پچاس برسوں سے ایک ہی بل سے بار بار ڈسی جاتی رہی ہے۔ طرفہ تو یہ ہے کہ اب بھی آپ کی امت میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اس ملک میں سیکولر جمہوری قدروں کی بحالی کو اپنا فریضہ قرار دیئے بیٹھے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو بزعم خود اپنے آپ کو شریعت کا محافظ گردانتے ہیں۔ اے خدا کے رسولؐ! ان کی عقل کو کیا ہوگیا ہے۔ آپ نے تو اپنے پیچھے خلافت کا نظام چھوڑا تھا پھر اہل شریعت کو سیکولر ڈیموکریسی کے قیام کا ایجنڈا کہاں سے ہاتھ آگیا؟

ہاں -- اے خدا کے رسولؐ -- یہی اہل شریعت آپ پر یہ بہتان بھی لگاتے ہیں کہ آپ نے نعوذ باللہ جمہوری حکومت قائم کی تھی حالانکہ آپ کی بنیادی دعوت بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلانے پر

مرکوز تھی۔ آپ نے بندوں سے قانون سازی کا حق چھین کر انہیں خدائے واحد کے قوانین کا تابع بنایا لیکن آج -- اے خدا کے رسولؐ -- آپ کی امت کے بڑے بڑے اہل تقویٰ جمہوری قدروں کی بحالی کے لئے کام کر رہے ہیں حتیٰ کہ بعض لوگوں نے اب غیر اسلامی خیالات کو الٰہی کا سند بھی عطا کر دیا ہے۔

اے خدا کے رسولؐ! آپ ہی بتائیے کہ آپ کی امت اب رہنمائی کے لئے دیکھے تو کدھر دیکھے کہ جن لوگوں سے رہنمائی کی توقع تھی وہ اسلامی ایجنڈے سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ وہ اس ملک کو دوبارہ دار الاسلام بنانے کے بجائے یہاں جمہوریت اور سیکولرزم کا قیام چاہتے ہیں۔ ان کی نظروں میں شریعت محمدی کا مطلب صرف نکاح و طلاق کے مسائل ہیں۔ مصیبت تو یہ ہے -- اے خدا کے رسولؐ -- کہ ان حضرات نے اپنے اردگرد تقدس کی ایسی قبا لپیٹی ہے کہ ان کی تقدس بھری شخصیت کے آگے آپ کی حدیث بھی پھیکی پڑ جاتی ہے اور جب کہیں کسی گوشے سے آپ کا انقلابی پیغام سنائی دیتا ہے تو عام مسلمان یہ کہنے لگتے ہیں کہ اگر اسلام کا مطالبہ یہی کچھ ہوتا تو پھر اس ملک میں بڑی بڑی تقدس والی شخصیتیں خاموش کیوں بیٹھتیں؟ اے خدا کے رسولؐ! ایک طرف ان کا تقدس ہے اور دوسری طرف آپ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے کلمات۔ لیکن افسوس کہ ان حضرات کے مکروہ تقدس اور بزدلانہ تاویلات کے آگے آپ کی باتوں کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے -- اے خدا کے رسولؐ -- کہ خدا کی کتاب تو صاف الفاظ میں کہتی ہے کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے امور کا نگراں نہیں بنایا جاسکتا (ولن یجعل اللّٰہ للکافرین علی المومنین سبیلا) لیکن مکروہ تقدس والی شخصیتیں علی الاعلان کفار و مشرکین کو ووٹ دینے اور انہیں برسراقتدار لانے کے لئے کام کرتی ہیں۔ کتنے جری ہیں یہ لوگ کہ اس جرم عظیم کے ارتکاب کے باوجود وہ آپ سے اپنا تعلق بتانے میں تکلف محسوس نہیں کرتے۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے بظاہر تو آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رکھا ہے لیکن پس پردہ ان کی وفاداریاں کافر سیاسی آقاؤں کے ساتھ ہیں۔

اے خدا کے رسولؐ! ایسا بھی نہیں کہ آپ کی تعلیمات بالکل ہی مسخ ہو گئی ہیں۔ یقیناً اسی ملک میں ایسے اہل دل بھی ہیں جو شریعت کے مطالب سے پوری طرح آگاہ ہیں لیکن اہل علم کے بڑے حلقے پر نہ جانے کیوں مدت سے مداہنت کا عذاب طاری ہے۔ ان میں سے بہت کم ایسے لوگ ہیں جو موجودہ نظام کفر کو الٹ پھینکنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ بیشتر نے عافیت کا بپتسمہ قبول کر رکھا ہے۔ مدارس کی چہار

دیواریوں کے اندر سکون ہے، تبدیلیوں کا گزر ادھر سے نہیں ہوتا۔ بعض لوگ روحانیت کے مدارج طے کرنے میں منہمک ہیں تو بعض اوراد و وظائف کے شغل میں مبتلا۔ گویا جنت کا حصول کوئی اعداد و شمار کا کھیل ہو۔ اپنے نجات کی فکر میں تو لوگ دبلے ہوئے جاتے ہیں لیکن آپ کے دین کو مغلوب دیکھ کر کسی کا وجود نہیں لرزتا، کسی دل میں ہلچل برپا نہیں ہوتی، کہیں اضطراب کا لاوا نہیں پھٹتا۔ اے خدا کے رسولؐ! آپ کے دور میں ان جیسے رجال اہل اللہ کی کوئی قبیل نہیں پائی جاتی تھی پھر یہ مذہب کا کون سا ایڈیشن ہے جو ہمارے عہد میں اعتبار پا گیا ہے۔

اے خدا کے رسولؐ! آپ کی یہ پریشان امت جائے تو کہاں جائے؟ دیکھیے تو کدھر دیکھیے؟ بہت سے ایسے ہیں جو آپ کے عشق میں شب و روز دبلے ہوئے جاتے ہیں۔ جن کی پوری زندگی آپ کا نام لیتے گزرتی ہے۔ ان کی صورت شکل پر تقویٰ کی مہر ثبت ہے لیکن نہ جانے کیوں جب ہم آپ کے اسوہ سے ان تصویروں کو ملاتے ہیں تو ہمیں یہ تصویریں کسی اور خود ساختہ اسلام کا ایڈیشن معلوم ہوتی ہیں۔ آخر یہ کیسی اسلامی زندگی ہے کہ جہاں پوری زندگی آپ کی اتباع میں گزری لیکن اللہ کی راہ میں جسم پر ایک ہلکا سا خراش بھی نہ لگا۔ آخر اللہ کی کبریائی کا یہ کیسا نعرہ تھا جس نے نظام کفر کے ایوانوں میں ارتعاش برپا نہ کیا؟ آخر یہ کیسے لوگ ہیں جو اہل ایمان کے درمیان بھی معتبر ہیں اور نظام کفر بھی ان کی پذیرائی میں پیچھے نہیں؟ -- اے خدا کے رسولؐ -- آپ ہی بتائیے کہ اگر اس طرح ٹھنڈے ٹھنڈے جنت کو راستہ جاتا تھا تو آپ نے اپنے عہد کے مسلمانوں سے جان و مال کے نذرانے کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ اگر ٹھنڈے ٹھنڈے اوراد و وظائف سے نظام کفر کو ہلا پھینکنا ممکن تھا تو پھر آپ کو تلوار اٹھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ آپ تو سراپا رحمت ہیں -- اے خدا کے رسولؐ -- پھر یہ کون لوگ ہیں جو آپ ہی کے راستے پر چلنے کے دعویدار ہیں لیکن تلوار کا عنصر ان کی زندگیوں سے یکسر غائب ہے؟ آپ ہی بتائیے کہ ان چاکلیٹ مسلمانوں کا اسلام کس قدر قابل اعتبار ہے؟

نظام کفر کی عملداری میں اسلام کی عجیب عجیب شکلیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان میں سب سے مقبول لولی پاپ اسلام ہے جس پر عمل کرنا بہت آسان، بالکل میٹھا میٹھا، اپنے بھی خوش، غیر بھی مطمئن۔ اہل ایمان اس زعم میں مبتلا کہ تسبیح کا ہر دانہ جنت میں ان کا مقام بنا رہا ہے اور نظام کفر بھی خوش کہ اس اسلام سے اسے کوئی خطرہ نہیں۔ اے خدا کے رسولؐ! سرزمین ہند میں آج اسی اسلام کو قبولیت عام ہے۔ رہا

وہ اسلام جو اللہ کی کبریائی کے علاوہ کسی اور کی کبریائی کو تسلیم نہیں کرتا تو -- اے خدا کے رسولؐ -- اسلام کا وہ ایڈیشن یہاں مغضوب ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی باتیں نہ کرو امن کو خطرہ ہوجائے گا، یہ ایک سیکولر ملک ہے، یہاں اس قسم کی انتہا پسندانہ باتیں نہیں کی جانی چاہیئے۔

کس غریب الوطنی سے دوچار ہے -- اے خدا کے رسولؐ -- آپ کا قافلہ اس ملک میں۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اب اس قافلے کو دیکھ کر یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہ وہی قافلہ ہے جو آپ کے دین کے غلبے کے لئے جزیرۃ العرب سے چل کر یہاں تک پہنچا تھا۔ یقیناً اس قافلے میں نیابت رسولؐ کے دعویدار بھی ہیں اور وہ بھی ہیں جن کی زبانیں قال اللہ و قال الرسولؐ کے ورد سے تر بتر ہیں لیکن ان میں سے کم ہی ہیں جنہیں نیابت رسولؐ کے عالی منصب کا احساس ہے۔ان کی اونچی ٹوپیوں اور جبہ و دستار پر نہ جائیے -- اے خدا کے رسولؐ -- کہ اس کی حیثیت تو بس ایک یونیفارم کی سی ہے۔ جس طرح ڈاکٹر اور وکیل اپنی شناخت کے لئے خاص قسم کا یونیفارم پہنتے ہیں، جس طرح نرسیں خاص وضع قطع کا لباس اختیار کرتی ہیں، اسی طرح مذہبی لوگوں نے خاص تراش خراش کی وضع بنائی ہوئی ہے۔اس کا بھلا تقویٰ سے کیا تعلق، کہ آپ کے عہد میں تو مذہبی لوگوں کی کوئی خاص وضع قطع نہ ہوا کرتی تھی بلکہ آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کے خلفاء کا یہ طرز رہا کہ اگر وہ مجلسوں میں بیٹھے ہوں تو ان کی وضع قطع عام مسلمانوں سے اتنی ملتی جلتی ہوتی کہ باہر سے آنے والوں کو یہ پتہ لگانا مشکل ہوجاتا تھا کہ اس مجلس میں مسلمانوں کا خلیفہ اور ان کا امیر کون ہے ؟ لیکن آج آپ کی نیابت کے دعویداروں نے ایسی خاص وضع قطع اختیار کر رکھی ہے جو دور ہی سے ان کے تقویٰ کی چغلی کھاتی ہے۔

اے خدا کے رسولؐ! آپ کا عام امتی جو اب بھی آپ کے دین کی خاطر ہر لمحہ اپنی گردنوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے تیار بیٹھا ہے وہ رہنمائی کی تلاش میں ان ہی اہل تقویٰ کی طرف دیکھتا ہے اور جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ بڑے بڑے اصحاب کرامت اور حاملین شریعت آپ کے لہ جھنڈے سے منہ موڑ کر کافر و مشرک سیاسی آقاؤں کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں اور برضا و رغبت وہ اس نظام کفر کے بقا و استحکام میں حصہ لے رہے ہیں تو اسے ایسا لگتا ہے جیسے یہی سب کچھ شریعت کے مطالب ہوں۔

اے خدا کے رسولؐ! آپ کا ایک عام امتی سخت ذہنی تشنج کا شکار ہے۔کرے تو کیا کرے ؟ دیکھے تو کدھر دیکھے ؟ کوئی پون صدی گزری تب سے اس امت کا کوئی امیر نہیں۔ خلافت کا شیرازہ منتشر

ہے۔ پوری امت کسی قیادت اور رہنمائی سے یکسر خالی ہے۔ حالانکہ آپ نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے امام عادل کی موجودگی کو لازم قرار دیا تھا اور آپؐ کے بعد آپ کے لائق خلفاء نے بھی اس امر کے اہتمام میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ خلافت کی کرسی تین دن سے زیادہ خالی نہ رہے۔ آپؐ نے اجتماعی زندگی کی اہمیت بتاتے ہوئے یہ بات بھی کہی تھی کہ جو کوئی نظام امارت سے الگ ہوکر مرا اس نے گویا جہالت میں موت پائی لیکن آج پون صدی ہونے کو آئی ہے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی ہنوز منتشر ہے۔ بڑے بڑے اہل تقویٰ خلیفہ المسلمین کی بیعت سے خالی عالم جہالت میں موت کی طرف اپنے قدم بڑھا رہے ہیں۔ خلافت کا تصور ماند پڑ گیا ہے۔ آپ کی منتشر امت پر اغیار کچھ اس طرح ٹوٹے پڑتے ہیں جیسے یتیم کا مال ہو۔ ہر کوئی اسے اپنی سمت میں ہانک لے جانا چاہتا ہے۔ اصل امارت کے خاتمے اور خلیفہ المسلمین کے غیاب کا نتیجہ یہ ہے کہ امت میں بہت سی امارتیں وجود میں آگئی ہیں۔ ہر مہم جو امارت کا دعویدار ہے اور ان امراء میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے کافر و مشرک سیاسی آقاؤں کے ہاتھوں پر بیعت نہ کر رکھی ہو۔

کتنی تکلیف دہ ہے یہ صورت حال -- اے خدا کے رسولؐ -- پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ ایک مہیب تاریکی ہمارے ملی وجود کو مسلسل اپنی گرفت میں لیتی جارہی ہے۔ سرنگ کے دوسری طرف روشنی کا فقدان ہمیں اذیت ناک مایوسی اور ہلا دینے والی بے بسی سے دوچار کر دیتا ہے۔ ہمیں ہر لمحہ ایسا لگتا ہے کہ شاید حالات کی درستگی اب انسانی فہم و فراست سے باہر ہے۔ ایسی سنگین صورت حال میں ہم جیسے ٹوٹے پھوٹے نفوس کے لئے کوئی راستہ بنانا یقیناً آسان نہیں۔

ہاں اگر کوئی امید ہے تو اس ذات بزرگ و برتر سے جو یقیناً آپؐ کی امت کو ہند کی سرزمین میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ آج اگر یہ مٹھی بھر لوگ مٹا دیئے گئے تو آنے والے دنوں میں سرزمین ہند آخری رسولؐ کی امت سے خالی ہو جائے گی۔ اے خدا کے رسولؐ! اب اگر کوئی امید ہے تو اسی ذات باری سے جو آپ پر خصوصیت کے ساتھ فضل فرماتا ہے اور جس کی نصرت کے بھروسے ہم نے اپنی امیدوں کا پتوار ابھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اب دیر نہ کیجئے۔ اے خدا کے رسولؐ! اب ہاتھ اٹھا بھی دیجئے۔

اے خاصہ خاصان رسلؐ وقت دعا ہے
امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

خطبات

- مسلم اُمّت: ملکی اور بین الاقوامی مسائل
- مابعد انہدام ہندوستان میں ایک نئے لائحہ عمل کی ضرورت
- ایک منصفانہ سیاسی متبادل کی تلاش
- ہندوستانی مسلمان: فکری اور عملی ارتداد کی زد میں

مسلم اُمّـت: ملکی اور بین الاقوامی مسائل

خطبہ صدارت

(۱۶/مارچ ۱۹۹۱ء۔ پیارے لال بھون، نئی دہلی)

برادران اسلام! اسلامیان ہند کا یہ ملک گیر کنونشن ایک ایسی صورت حال میں منعقد ہو رہا ہے جب ملک پر سیاسی بے یقینی کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ آئندہ دنوں میں ملکی سیاست کا نقشہ کار کیا ہوگا اور خود مسلمان آنے والے دنوں میں کیا رول ادا کریں گے اس بارے میں گہرے شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ گزشتہ ایام، امت مسلمہ پر جس قدر سخت گزرے ہیں اس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ اسلامیان ہند پر جو گزری سو گزری عالم اسلام میں جو متواتر حوادث رونما ہوئے ہیں اس نے ہر صاحب نظر کو یہ احساس دلایا ہے کہ امت اسلامیہ آج جس ضعف کا شکار ہے شاید ایسی بے لبسی چنگیز اور ہلاکو کے وقت میں بھی امت پر طاری نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے دل خون کے آنسو روتے رہے لیکن آنسوؤں کی اس برسات سے موہوم امید کا بھی کوئی باغ لہلہا نہ سکا۔ اغیار کی سازشیں اور ان کے مکروفریب کا مقابلہ تو کجا ہمارے بڑے بڑے دانشوروں کی سمجھ میں بھی یہ بات نہ آسکی کہ آخر یہ سب کچھ ہو کیا رہا ہے۔ مغرب نے ایک طرف تو ہماری سرزمین کو اپنی فوجی مشق و ستم کا نشانہ بنایا اور دوسری طرف پوری امت کے لئے جذبات و احساس اور اس کی غیرت و حمیت کا اس طرح اغوا کیا جس کی نظیر شاید تاریخ میں ملنا مشکل ہوگی۔

بد قسمتی سے امت اسلامیہ کفر کی عالمی سازش کا شکار ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج امت لہولہان ہے، اس کا اتحاد پارہ پارہ ہو چکا ہے، باہمی خانہ جنگی کے مناظر عام ہیں۔ مسلمانوں کا خون مسلمانوں نے حلال کر رکھا ہے۔ جو تلواریں دشمنوں کے لئے صف بستہ ہونی چاہیئے تھیں آج ان کی ضرب اپنوں کی گردنوں پر ہے۔ روتی، سسکتی، بلبلاتی اس امت کے زخموں پر نہ کوئی مرہم رکھنے والا ہے اور نہ کسی گوشے سے

ہمدردی کے دو بول ملنے کی توقع ہے۔ مغرب کے ذرائع ابلاغ نے مسلمانوں کے درمیان باہمی نفرت و عداوت کی مہم کو بین الاقوامی وسعت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کے درمیان زبردست اختلاف رائے پیدا ہوگیا۔ بھائی بھائی کا دشمن ہوا اور انتہائی خلوص سے اختلاف کرنے والوں کو اسلام کا سب سے بڑا دشمن گردانتا رہا، اس کی نیکی اور ایمانداری، زہد و تقویٰ، خلوص اور للہیت کا شاکی ہوا۔ دلوں میں ایسی خلیج پیدا ہوگئی کہ مشترکہ مسائل پر مل جل کر غور کرنا اور اس کے حل کے لئے مشترکہ کوشش کرنا ناممکن ہوگیا۔ دشمنوں کے ذرائع ابلاغ نے ایک طرف تو صدام حسین کی بربریت کا شور بلند کیا اور دوسری طرف اسے اسلام کے مسیحا اور عالم عرب کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتا رہا۔ مقصد یہ تھا کہ اولاً اسلام کے غلبے کی آرزو رکھنے والے مخلص مسلمانوں کے جذبات کو صدام سے منسلک کر دیا جائے یہاں تک کہ صدام حسین غلبہ اسلام کی علامت بن جائے۔ ایک ایسی صورت حال پیدا کی جائے جس میں صدام اور اسلام ایک ہی سکے دو رخ معلوم ہوتے ہوں۔ اس کی محدود جنگی قوتوں کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے جس سے نہ صرف یہ کہ مغرب کو بڑھ چڑھ کر فوجی کارروائی کا جواز فراہم ہوسکے بلکہ خود مسلمان اسے ایک ایسا ناقابل تسخیر ہیرو سمجھنے لگیں جس میں صلاح الدین ایوبی کی جھلک نظر آئے، خالد بن ولید اور طارق بن زیاد کی عظمت دکھائی دے اور اس نام نہاد ہیرو کی تشکیل اور چہار سو اس کا ڈنکا پیٹنے کے بعد ایک ایسی صورت حال پیدا کی جائے کہ دنیا کے مخلصین مسلمانوں کی خواہشات اور آرزوؤں کا محور و مرکز صدام حسین قرار پائے گویا مسلمانوں کو ایسا لگے کہ اسلام کے عالمی غلبے کا خواب اب شرمندہ تعبیر ہونے والا ہے۔ اسلام کا عالمی غلبہ اب واقعات عالم کے دروں پر دستک دے رہا ہے۔ کفر کی بساط اب لپیٹی ہی جانے والی ہے۔ صدام حسین کی قیادت میں دنیا ایک بار پھر اسلام کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے والی ہے۔

اور جب یہ سب کچھ ہوجائے تو صدام حسین کے غبارے سے ہوا نکال دی جائے تاکہ غلبہ اسلام کے لئے جینے والوں کی آخری امید دم توڑ دے، پوری دنیا میں مسلمانوں پر مایوسی کی ایک ایسی فضا طاری ہو جس کا تدارک برسہا برس تک ممکن نہ ہوسکے اور اس طرح اسلام کی احیائی تحریکوں سے مغرب کو جو زبردست خطرہ پیدا ہوچلا ہے اسے ایک قابل ذکر عرصے کے لئے مؤخر کیا جاسکے۔

برادران اسلام! بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغرب کو اس مہم میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن امید کی آخری کرن اب بھی روشن ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ جب آپ دیکھیں گے کہ خو

ہوئی ہے لیکن امید کی آخری کرن اب بھی روشن ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ جب آپ دیکھیں گے کہ خود ان کا یہ مکر و فریب ان پر الٹ دیا جائے گا۔ اللہ کا ارشاد ہے۔

اَمۡ یُرِیۡدُوۡنَ کَیۡدًا ؕ فَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ہُمُ الۡمَکِیۡدُوۡنَ (الطور ۴۲)

آج جو لوگ غلبہ اسلام کی آرزو لئے جیتے ہیں اور جن کے دل اس راہ میں اپنی گردنوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے مچلے جاتے ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ کفر کی بین الاقوامی سازشوں کو سمجھیں، اس طریقہ کار کا ادراک حاصل کریں جو مغرب کی کافر قوتیں مسلمانوں کو کمزور کرنے اور ان کے جذبات کے استحصال کے لئے بروئے کار لاتی ہیں۔ یہ عجیب سانحہ ہے کہ ہماری امت کا سواد اعظم نعروں کی تحقیق کئے بغیر مسائل کی تفہیم سے قطع نظر، اس کے مالہ وما الیہ کی جانچ پڑتال کئے بغیر محض جذبات کے ریلے میں بہہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کبھی جمال عبدالناصر جیسا دشمن اسلام عالم عرب کا ہیرو قرار پاتا ہے۔ کبھی رضا شاہ پہلوی وقت کا کریز (Craze) بنتے ہیں تو کبھی صدام حسین کی مقبولیت آسمان چھونے لگتی ہے۔ اسلام دشمن قوتیں، صیہونی سازش کے شکار، بش اور گورباچوف جیسے شریر لڑکے ہمارے ذہنی افلاس پر ہنستے ہیں۔

اسلامیان ہند کا یہ ملک گیر کنونشن آپ کو دعوت دیتا ہے کہ کفر کی عالمی سازش کی صحیح تفہیم حاصل کریں اور اسلام کے عالمی غلبہ کے لئے اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر لے کر نکل کھڑے ہوں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ باطل کی ہمالیائی قوتوں کی تسخیر شاید اب ممکن نہیں لیکن میرے خیال میں یہ انداز فکر باطل کی زبردست پروپیگنڈہ مشینری کا پیدا کردہ ہے۔

ذرا غور کیجئے! خلافت کے حتمی سقوط کو ابھی پون صدی بھی نہیں گزری ہے۔ بارہ سو سال تک سپر پاور بنا رہنے والا اسلام عالمی سیاست کے افق پر صرف ۶۶ سال سے غائب ہے۔ موجودہ دنیا کی دونوں تسلیم شدہ بڑی قوتوں کی عمر ہی کیا ہے، یہی کوئی نصف صدی سے بھی کم۔ گویا یہ سب کچھ بہت زیادہ پرانا عمل نہیں ہے۔ چند دنوں قبل کا واقعہ ہے جب قوت کی سیاست میں بدقسمتی سے متواتر ایسے حوادث پیش آگئے جن سے اسلام کی سیاسی قوت اجنبی قوتوں کی مشترکہ سازش کا شکار ہوگئی۔ عالم اسلام کا تار و پود بکھر گیا۔ تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اسلام کی منتشر قوت کو ایک بار پھر نئے سرے سے منظم کیا جائے، ایک بار پھر وحدت اسلامی کی تشکیل ہو اور ایک زبردست کوشش اور سرتوڑ جدوجہد کے نتیجے میں عالمی قوت کا نیا توازن تشکیل دیا جائے۔ قوت کے موجودہ تسلیم شدہ مراکز تباہ کردئے جائیں اور بڑی قوتوں کے کھنڈر پر اسلام کی

حال پیدا ہو کہ اسلام موجودہ متمدن دنیا کے قائد کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اسے سیاسی غلبہ اور تفوق حاصل ہو اور اس کے بغیر دنیا کی قسمت کا فیصلہ ناممکن ہو جائے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ایام زوال کی مجبور و بے بس امت جس کے عزائم شکستوں سے چور اور جس کا وجود بے پناہ زخموں کے کرب میں مبتلا ہو، باطل کی منظم قوتوں کے مقابلے میں اس طرح کھڑی ہو جائے کہ باطل لرز جائے، خوف کھائے، پیچھے ہٹ جائے اور یہ زخم خوردہ ہاتھ اس کی کلائی مروڑ دے، اس کی گردن دبوچ لے یہاں تک کہ اس مردود لاشے میں زندگی کی کوئی علامت بھی باقی نہ رہے۔ میرے خیال میں اس سوال کا جواب بہت حد تک جدید دنیا کی صحیح تفہیم و تشریح اور اس نظریہ کی قوت کے ادراک پر ہے جو شکست خوردہ امت کو آج بھی باطل کی ہمالیائی قوتوں کے مقابلے میں کھڑا کر سکتا ہے۔

ایک طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ سب کچھ عین ممکن ہے۔ آج بھی اسلام دنیا کا سپر پاور بن سکتا ہے، آج بھی امت اسلامیہ اسلام کے عالمی غلبے میں ملت واحدہ کا بنیادی رول ادا کر سکتی ہے، چشم زدن میں دنیا کی صورت حال تبدیل ہو سکتی ہے۔

اسلام کے عالمی غلبے کا راستہ اجتہاد، جہاد اور شہادت سے ہو کر گزرتا ہے۔ اہل ایمان کی کامیابی کا سارا دارومدار اس امر پر ہے کہ وہ کس حد تک اپنی زندگی کو اسلامی انقلاب کے ان ناگزیر مراحل سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔ دنیا میں اگر ایک عالمی نظام عدل وجود میں نہ آسکے، بین الاقوامی ظلم و استحصال اور استبدادی قوتوں کا وجود باقی رہے تو پھر اہل ایمان کو اس دنیا میں زندہ رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ الٰہی انقلابی مشن کے حاملین کے کرنے کا واقعی کام کیا ہے اس بارے میں قرآن میں متواتر اور واضح احکام موجود ہیں۔ "اب دنیا میں بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" (قرآن)

نظام زندگی کے سارے زمینی منشور خواہ وہ کسی قوم و ملک کے لئے کتنے ہی مقدس و محترم کیوں نہ ہوں اسلام اسے باطل قرار دیتا ہے۔ اس کی نظر میں صرف اور صرف نظام زندگی کا آسمانی الٰہی منشور ہی معروف ہے باقی سب کچھ منکر، خواہ اسے جمہوریت و حریت یا انسانی آزادی اور انسانی حقوق کا خوب صورت نام ہی کیوں نہ دے دیا گیا ہو۔ لہٰذا منکر کی ساری رائج شدہ شکلوں کو سرے سے نیست و نابود کر دینے اور اس کی جگہ قرآن کے تصور معروف کو پوری طرح قائم کر دینے کے لئے ہر مسلمان پر لازم ہے

کہ وہ اپنی گردنوں کو ہتھیلیوں پر لے کر میدان میں نکل آئے۔

برادران اسلام!

گذشتہ چند برسوں میں ملکی صورت حال میں جو زبردست تبدیلی واقع ہوئی ہے اس سے آپ یقیناً واقف ہوں گے۔ انتہا پسند تنظیموں کی مسلسل کوشش یہ رنگ لائی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اب ان کی اپنی جان و مال کا تحفظ بن گیا ہے۔ کہنے کو تو مسلمان اپنی مدافعت کی عزیمانہ جدوجہد میں مصروف ہیں لیکن ان کے پاس اپنی مدافعت کے لئے ہی سہی، کوئی واضح لائحہ عمل ہے اور نہ ہی مستقبل کے لئے کوئی واقعی نشان راہ۔ چیخ و پکار اور جذباتی نعروں کا بازار گرم ہے۔ نعرہ تکبیر اور اللہ اکبر کی صدائیں تو ضرور سنائی دیتی ہیں لیکن شعور سے خالی۔ گویا بھنور میں ڈوبتے ہوئے کسی بے بس انسان کی چیخ و پکار ہو۔ یہ یقیناً وہ نعرہ حیدری نہیں جس سے دریاؤں کے دل دہل جائیں اور طوفانوں کا رخ موڑا جاسکے۔

یہ تو ہے عامۃ المسلمین کا حال۔ رہیں مسلم تنظیمیں، اسلامی ادارے، دینی درس گاہیں اور علماء و شیوخ کی مجالس، تو یہاں بھی کچھ زیادہ فرق نہیں یقیناً کچھ اہل دل ہمارے درمیان اب بھی موجود ہیں اور کچھ اہل فکر کا دل بھی خون آلود ہے اور یقیناً چند اہل نظر پر امت کی موجودہ بے بسی اور اغیار کی سازشیں واضح ہیں لیکن ان کے یہاں اس جرات کا فقدان ہے جو طوفانوں کا رخ موڑنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ پھر ان کی گروہی اور جماعتی وابستگیاں ہیں جو انہیں "ملت میں گم ہوجا" کے عمل سے روکے دیتی ہیں۔ ایسی صورت میں ان بازاری لیڈروں کی بن آئی ہے جن کے لئے بے چاری مظلوم اور بے بس امت ایک نوالہ تر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور جو امت کے ہر بحران کو اپنی ذاتی حوصلہ آوری کے لئے ایک موقعہ جانتے ہیں۔ دوسری طرف اغیار کی کھاجانے والی نگاہیں پوری امت مسلمہ کو جذباتی احمقوں کے ایک ٹولے سے زیادہ نہیں گردانتی ہیں۔ لہٰذا کبھی تو یہ امت کسی مخصوص سیاسی پارٹی کو سر پہ اٹھائے پھرتی ہے تو کبھی مترحم نگاہوں سے کسی قصائی صفت سے مسیحائی کی امید باندھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جدید ہندوستان میں امت کا سیاسی تشخص کھویا گیا ہے۔ اس کے خریداروں اور مسیحا صفت قاتلوں نے اسے ایک ایسی صورت حال سے دوچار کردیا ہے جہاں سے واپسی کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

یہ ہے وہ صورت حال جو آج ہمیں ہندوستان میں درپیش ہے۔ اب اس نازک صورت حال

میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے دفتر عمل کا جائزہ لیں۔ اپنا احتساب کریں اور یہ دیکھیں کہ گذشتہ ۴۴ سالہ سیاسی تجربات سے آخر ہمیں حاصل کیا ہوا؟ زندگی جینے کی ہوس نے ہمیں زندگی سے کتنا دور اور موت سے کتنا قریب کر دیا ہے اور اس سخت محاسبہ کے بعد ضرورت ہے کہ ایک نیا سیاسی اور ملی رویہ تشکیل دیا جائے کہ

* اگر پرانے طریقہ عمل کی اثر انگیزی میں شبہ ہے تو نیا طریقہ عمل وضع کیا جائے۔
* اگر پرانی تدبیریں کارگر نہیں ہو ئیں تو نئی تدابیر اختیار کی جائیں۔
* اگر پرانے چراغوں میں روشنی نہ رہی ہو تو نئے چراغ روشن کئے جائیں۔ اور
* اگر پرانی قیادت واقعی تھک ہار چکی ہو تو نئی قیادت فراہم کی جائے۔

برادران اسلام!

ہندو احیاء پرستوں نے ہندو عوام میں اپنے نفوذ کے لئے بابری مسجد کا قضیہ جس طرح اٹھایا تھا اس بات کی ضرورت تھی کہ ہمارے اہل فکر حکمت و بصیرت کے ساتھ اس مشن کو ناکام بنانے کی کوشش کرتے۔ آج سے چار سال قبل ہی ہم نے اس جانب توجہ دلائی تھی کہ اگر مسلمان بابری مسجد کو قومی لڑائی کا ایجنڈا بنانے کی روش سے باز نہ آئے تو احیاء پرستی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی اور پھر مسلمانوں کو نفرت کے ماحول میں دعوت و تبلیغ تو کجا سر چھپانے کے لئے بھی کوئی جگہ نہ مل سکے گی۔ لیکن بد قسمتی سے سیاسی مسلمانوں، ناعاقبت اندیش قائدین اور خود غرض سیاسی لیڈروں نے ایک نہ سنی اور اپنے زعم رہنمائی میں پوری امت کو ایک ایسی صورت حال میں پہنچادیا جہاں سے نہ تو پیچھے جانا ممکن ہے اور نہ آگے جانے کے لئے ان قائدین کے پاس حوصلہ اور بصیرت ہے۔ بہر حال ہمارے نہ چاہنے کے باوجود جو ہونا تھا وہ ہو چکا یہ وقت شکایات کا نہیں عمل کا ہے۔ ہمیں تو اب یہ دیکھنا ہے کہ امت کو موجودہ خطرات سے کیسے نکالا جاسکتا ہے؟

گذشتہ چند مہینوں میں امت اسلامیہ ہند جن صبر آزما و شوار مراحل سے گزری ہے وہ ایک عذاب سے کم نہیں۔ گویا ایک قیامت تھی، جو ٹوٹی پڑتی تھی۔ قتل و خون کا بازار گرم تھا۔ نفرت کی آندھیوں میں زندگیوں کے چراغ گل ہوتے رہے، متاع حیات لٹتی رہی، محافظوں نے قزاقی اختیار کی، امت اسلامیہ ہند کانپ گئی۔ ایسا محسوس ہوا گویا مسلمانوں کے لئے اس ملک میں اب کوئی صبح نہ ہوگی۔

لیکن پھر نفرت کی آندھیوں کا یہ طوفان کچھ تھما۔ میرٹھ، بھاگل پور، علی گڑھ اور حیدر آباد کے واقعات بھلائے جانے لگے گویا ایسا لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جذبات کی ہانڈی میں جو ابال آیا تھا وہ رخصت ہوگیا اور مسلمانوں پر وہی بے حسی اور بے خبری طاری ہوگئی۔ اس پورے واقعہ میں جو پہلو سب سے افسوس ناک ہے وہ یہ کہ ان فسادات میں امت مسلمہ کی ایک ایسی تصویر پیش ہوتی رہی ہے جو کسی بھی طرح اس کی اصلی نظریاتی تصویر سے میل نہیں کھاتی۔ مثال کے طور پر ان مسلم نوجوانوں کی موت کو یاد کیجیے جو پولیس کی گاڑیوں میں بھر کر اجتماعی قتل کے لئے لے جائے گئے اور یکے بعد دیگرے چند پولیس والوں کی گولیوں کا نشانہ بنائے گئے۔ مدافعت کے حوصلے سے خالی یہ ہماری تصویر نہیں ہے، ڈر اور خوف میں گرفتار یہ نفسیات امت مسلمہ کی نفسیات نہیں ہو سکتی، یہ یقیناً اس رسولؐ کے وارثوں کی داستان غم نہیں ہے جس کی ذات پر کبھی بھی خدائے واحد کے رعب کے علاوہ کسی اور کا رعب طاری نہیں ہوا۔ اسی طرح علی گڑھ کے حالیہ فساد میں گومتی کے ان مسلمانوں کا قتل یاد کیجیے جنھوں نے چند قاتلوں کے آگے اپنی ہمت کا سپر ڈال دیا، جو اسلحوں کی قوت کو عزم و ہمت کی تلوار پر بھاری سمجھ بیٹھے۔ بے بسی اور بے کسی کی یہ موت اس امت کی تصویر سے میل نہیں کھاتی جس کے خون کے ہر قطرے سے باطل کا ایک جہان تباہ ہوگیا ہو۔ ہندوستانی مسلمانوں کو جہاں اپنی اخلاقی، علمی، مذہبی اور روحانی تصویروں کی درستگی کی ضرورت ہے وہیں تصویر کا یہ رخ بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن (اقبال)

ضرورت ہے کہ ہم اپنی تصویر کو کتاب و سنت سے ہم آہنگ کریں کہ یہی ہندوستان میں ہماری بقا کا ضامن ہو سکتا ہے۔

نجات کی راہ

میں امت اسلامیہ ہند کے غیور افراد کو آواز دیتا ہوں کہ جو وقت خوف و غفلت میں گذرا سو گذرا، اب وہ خوف کے طلسم کو توڑ دیں، انہیں نہ صرف اپنا تحفظ کرنا ہے بلکہ ملک کی ڈوبتی کشتی کو کفر و مادیت کے بھنور سے نکالنا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ اس عمل کا پہلا مرحلہ یہ ہوگا کہ وہ کسی سیاسی اتحاد

میں شرکت یا کسی غیر مسلم سیاسی قوت کا آلہ کار بننے کے بجائے اس ملک میں ایمانی سیاست کے علمبردار کی حیثیت سے سامنے آئیں۔ اس اخلاق باختہ سیاسی نظام کو ایمانی سیاست کی شدید ضرورت ہے۔

ایمانی سیاست، ملی سیاست سے یکسر مختلف ہوگی کہ آخر الذکر سیاسی رویہ ملت کو بحیثیت قوم دنیا جینے کا فن سکھاتا ہے جب کہ اول الذکر امت مسلمہ کو ایک انقلابی نظریاتی گروہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ملی سیاست دوسری قوموں سے نفرت اور مقابلے کے جذبے سے تقویت پاتی ہے۔ اس کے استحکام کی بنیاد ہی یہ ہے کہ ملک کے سامنے ہمہ وقت خوفناک مسائل کی ایک طویل فہرست موجود رہے۔ دشمن کی قوت سے خوف و دہشت ہی ملی سیاست کے علم برداروں کو وقتی طور پر یکجا رکھتی ہے اور جوں ہی خطرہ ٹلتا نظر آتا ہے ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے جب کہ ایمانی سیاست کی ایک مستقل فلسفیانہ اساس ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ خوف و دہشت کی نفسیاتی کیفیت سے یکسر پاک اعتماد سے پر، اپنے لئے کچھ نہیں اور دوسروں کے لئے سب کچھ طلب کرنے کے انبیائی رویہ سے مسلسل غذا حاصل کرتی ہے۔ اس کی بنا کسی مقابل قوم کے لئے نفرت پر نہیں بلکہ اس کے لئے نصح و خیر خواہی اور جذبہ ہمدردی پر رکھی جاتی ہے۔ چونکہ یہ براہ راست مسلم قوم کے عروج یا غلبہ کی بات نہیں کرتی بلکہ دوسروں کے لئے سب کچھ حاصل کرنے کے انقلابی رویہ اور اس راہ میں زبردست قربانیوں کے بعد امت مسلمہ کو اس قائدانہ مقام پر فائز کرتی ہے اس لئے اس کی دعوت کے لئے دوسرے مسالک و مذاہب کے دل بھی کھلے ہوتے ہیں۔ یہ محض مسلمانوں کے سیاسی مسئلہ کے حل کے بجائے انسانیت کے سیاسی مسئلہ کی طرف توجہ کرتی ہے اور چونکہ مسلمان اس انقلابی مشن کے دعویدار ہیں اس لئے منطقی طور پر اولین مخاطب اور اولین معاون قرار پاتے ہیں۔

نئی سیاسی پارٹی کا منشور

ضرورت ہے کہ اس اخلاق باختہ ملک کو نئی سیاسی اخلاقیات سے متعارف کرانے کے لئے الٰہی پیغام کے حاملین پر مشتمل ایک ملک گیر سیاسی پارٹی وجود میں آئے۔ انبیائی انقلاب کے علمبرداروں کو چاہیئے کہ جہاں وہ لوگوں کے قلوب کی تبدیلی کے لئے دن رات کوشاں ہیں وہیں ملک کی ڈوبتی سیاسی کشتی کو بچانے کے لئے بھی سر توڑ جدوجہد کریں۔ اہل ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں سیاسی بے تدبیریوں کو ختم کرنے، سماجی انصاف قائم کرنے، معاشی استحصال کا خاتمہ کرنے اور ہر قسم کے فتنہ و فساد سے اس

ملک کو پاک کرنے کے لئے ایک انقلابی سیاسی جدوجہد کا آغاز کریں۔ نئی سیاسی پارٹی منحرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی نمائندہ ہوگی اس میں منحرف قسم کے نام نہاد مسلمانوں کو قائدانہ حیثیت حاصل نہ ہوگی الا یہ کہ وہ سابقہ روش سے تائب ہوکراپنے اندر انبیائی مشن کے حاملین کی خصوصیات پیدا کر سکیں۔ اس کے اہداف درج ذیل ہوں گے۔

۱۔ ملک میں قرآن کی سیاسی اخلاقیات کا نظری اور عملی تعارف۔

۲۔ ملک میں سماجی اور معاشی انصاف کا قیام اور ہر قسم کے ظلم کا خاتمہ۔

۳۔ ملک کے کارواں کو ایک ایسی راہ پر ڈالنا جو دنیا و آخرت میں کامیابی کا ضامن بن سکے۔

۴۔ ملک کو موجودہ جمہوریت جو دراصل بہت بڑا فراڈ ہے سے نجات دلانا اور اس کی جگہ ایک عادلانہ نظام کا قیام۔

۵۔ مسلم قومی عصبیت کا خاتمہ اور الٰہی انقلابی پیغام کی اشاعت۔

۶۔ امت اسلامیہ کی ایک ایسی عظیم روحانی اور مادی تعمیر نو جو اسے اقوام عالم کی صفوں میں قائدانہ حیثیت دلا سکے۔

بعض شکست خوردہ مسلمان اس اندیشے میں دبلے ہوئے جاتے ہیں کہ بھلا جو ملت ایک مدت سے کافرانہ سیاسی ماحول میں پرورش پاتی رہی ہے، جو بہت حد تک اس سیاسی نظام کی خوگر ہوچکی ہے، بھلا اس مفلوک الحال امت سے انقلابی قیادت کا اتنا بڑا کام کیسے لیا جاسکتا ہے؟ ان زوال زدہ مسلمانوں کو چاہئے کہ محض اس راہ کی طوالت اور خطرناکی سے خوف کھانے اور ہمت ہار جانے کے بجائے امت کی صحیح صورت حال کے واقعی ادراک کی کوشش کریں۔ یقیناً یہ راستہ انتہائی دشوار ہے، اس راہ کے خطروں سے بھی مجھے انکار نہیں لیکن جن لوگوں کو امت کی ہیئت ترکیبی کا کچھ بھی اندازہ ہے اور جن آنکھوں نے امت مرحومہ کی خاکستر میں دبی چنگاری کے شعلہ بننے کے مناظر بار بار دیکھی ہیں وہ یقیناً اس طریقہ عمل کا شاندار مستقبل رنگوں میں مجسم دیکھ رہی ہیں۔ بالخصوص موجودہ سیاسی ماحول میں جب پوری امت ایک بہتر لائحہ عمل کی متلاشی ہے اور جب دن رات کے قتل و خون کے مناظر نے اسے بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کردیا ہے، امت کے کارواں کا رخ انقلابی انبیائی راستے پر موڑ دینا بہت زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ماضی قریب میں پوری امت کو ایک اکائی کی حیثیت سے برتنے کا بڑی حد تک کامیاب تجربہ ہم کرچکے

ہیں۔ بابری مسجد اور مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ پر پوری امت نے قربانیوں اور عزائم کے جو مظاہر پیش کیے ہیں ان میں ہمارے شکستہ دل افراد کی ہمت افزائی کا خاصہ سامان موجود ہے اور جب قومی نوعیت کے دو بڑے مسائل پر یہ مفلوک الحال امت اس عزیمت کا مظاہرہ کر سکتی ہے، جب اس کے عام افراد اللہ کے گھر اور اس کی شریعت کی حفاظت کے واسطے اپنے سروں سے کفن باندھ کر نکل سکتے ہیں تو بھلا ایک واقعی انقلابی انبیائی مشن کی کامیابی کے لئے وہ کیا کچھ نہ کر گزریں گے۔ اس امت کا یہی وہ دل موہ لینے والا مقدس عمل ہے جو ان کی مساعی میں اللہ کی نصرت و حمایت کی ضمانت دیتا ہے۔ اب اتنی زبردست قوت کی موجودگی کے باوجود کسی کا ذہن اس طریقہ عمل کی کامیابی کے سلسلے میں شبہات کا شکار ہے تو اس کے لئے دلائل کی نہیں دعا کی ضرورت ہے۔

دوسرا اندیشہ جس کا اظہار عام طور پر کیا جاتا رہا ہے یہ ہے کہ اس طریقہ سیاست کی اپیل چونکہ ابتدائی مراحل میں صرف مسلمانوں تک محدود ہوگی اور ابتداً ایمانی سیاست کے علمبردار صرف اہل ایمان کے ووٹوں پر ہی پارلیمنٹ میں پہنچیں گے اس لئے ہوسکتا ہے کہ یہ طریقہ ملکی سیاست میں مسلمانوں کا موجودہ سیاسی عمل دخل بھی ختم کردے۔ اس خیال کے حاملین اس اندیشے کا بڑے زور وشور سے ذکر کرتے ہیں کہ پارلیمنٹ اور چند صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کی جو قابل ذکر تعداد مختلف پارٹیوں کے ٹکٹ پر منتخب ہوکر آتی ہے ایمانی سیاست مسلمانوں کو اس سے بھی محروم کردے گی۔ ان اندیشوں کے گرفتار شاید یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مسلم اراکین پارلیمنٹ اور اسمبلی کی خاصی بڑی تعداد اغیار کے ووٹ پر غیر مسلم پارٹیوں کے ٹکٹ کی وجہ سے کامیاب ہوتے ہیں۔ اس مفروضے کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں نے الیکشن کمیشن کی رپورٹوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ مختلف حلقوں میں مسلم اور غیر مسلم ووٹوں کا تخمینہ لگایا ہے۔ ان حلقوں کی مقامی سیاست اور ذات پات کے اثرانگیز عوامل کی تفہیم کی کوشش کی ہے اور اس طویل مطالعے کے بعد جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ایمانی سیاست تو درکنار اگر مسلمان اپنی سیاست خالص قومی بنیادوں پر بھی استوار کریں جب بھی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں (اشتناء چند نشستوں کے) ان کی نمائندگی میں کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوگا۔ مجموعی طور پر دوچار نشستوں کے اضافے ہی کا امکان ہے۔ گرچہ مسلم علاقوں کو پارلیمانی حلقوں میں بڑے مضحکہ خیز انداز سے شامل کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک خالص قومی سیاست کامیابی کے نتیجے میں کم از کم

اتنی نشستیں تو ضرور حاصل کر سکتی ہے جو اسے اب تک ذلت کی سیاست کے نتیجے میں حاصل ہوتی رہی ہے۔ رہی بات ایمانی سیاست کی، تو اس کی ہیئت ترکیبی ہی کچھ ایسی ہے کہ مظلوم و مقہور اکثریت کے دل اور ووٹ اس کی طرف خود بخود کھنچے چلے آئیں۔

گویا یہ حقیقت بڑی حد تک منکشف ہو چکی ہے کہ ایمانی سیاست اپنی کامیابی کے پہلے مرحلے میں اتنا کچھ حاصل کر سکتی ہے جس سے چالیس سال کی ہماری سیاسی بے تدبیری اور منحرف سیاسی کاوشوں کی جھولی خالی ہے۔ ایمانی سیاست کا پہلا مرحلہ جو بہت حد تک اہل ایمان کی مشترکہ سیاسی جدوجہد کا مرہون منت ہوگا۔ اپنی کامیابی کے پہلے مرحلے میں ہندوستانی پارلیمنٹ میں کوئی چالیس پچاس اہل ایمان پر مشتمل ایک نیا سیاسی گروہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یہ نیا سیاسی گروہ اپنی منفرد طرز سیاست اور بے لوث سیاسی مقاصد کی وجہ سے خود پارلیمنٹ میں کیا اثر مرتب کرے گا یہ تو بہت کچھ اہل ایمان کی سیاسی اور ایمانی بصیرت پر منحصر ہوگا۔ البتہ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ مختصر لیکن مؤثر گروہ ظلم و جبر کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوگا اور اگر کوئی ایک سیاسی پارٹی پارلیمنٹ میں غالب اکثریت کی حامل نہ ہو تو ملک کا کوئی فیصلہ شاید اس گروہ کی مرضی کے بغیر ممکن نہ ہو سکے گا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر مخلوط حکومتوں میں اس کے اخلاقی اور اتحادی وزن کی بڑی قیمت ہوگی۔ اور کیا عجب کہ یہ طرز سیاست اس ملک میں اسوہ یوسفی کے احیاء کا سبب بن جائے۔

ایمانی سیاست سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بیس کروڑ مسلمان سیاسی رہنمائی کے لئے کسی اور سمت دیکھنے کے بجائے آسمانی ہدایت کی طرف دیکھیں گے۔ ان کا سیاسی تعطل دور ہوگا، خوف و ہراس کی کیفیت ختم ہوگی اور ایک مشن کی موجودگی اور اس کے قابل عمل ہونے کا یقین انہیں ایک زبردست حرکی قوت سے مالا مال کر دے گا۔ سیاسی اور نظریاتی مشن کا امتزاج ان کے ہر سیاسی عمل کو دعوتی اور ہر دعوتی عمل کو سیاسی بنا دے گا اور بیس کروڑ کی امت کو ایک الٰہی فلسفہ حیات کے زیر اثر حرکت میں لے آنے کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ اس ملک کو جن مادی اور روحانی خطروں نے آ گھیرا تھا، جس ظلم و جبر کے خوفناک سمندر میں ملک کی کشتی کے ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، وہ خطرہ اب ٹل گیا۔

یہاں کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں ایمانی سیاست کو ہمہ گیر اسلامی انقلاب کے متبادل کے طور پر پیش کر رہا ہوں یا یہ کہ کسی نام نہاد جمہوری عمل میں شرکت کے ذریعہ واقعی اسلامی انقلاب کا

خواب دیکھنے لگا ہوں کہ جس شخص پر انبیائی انقلاب کا طریقہ کار اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ منکشف ہو چکا ہو اور جو موجودہ جمہوریت کو فراڈ سے زیادہ کچھ اہمیت نہ دیتا ہو، بھلا وہ اس فراڈ سے کوئی انبیائی انقلاب بر آمد کرنے کی توقع کیونکر کر سکتا ہے۔ ایمانی سیاست کا آغاز اور امت مسلمہ کو نئی سیاسی اخلاقیات کے ساتھ متحرک کر دینے سے ہمہ گیر انبیائی انقلاب تو برپا نہ ہوگا البتہ یہ عمل دعوت کی راہ کا سنگ میل ضرور ثابت ہوگا اور امت مسلمہ کا نظریاتی احیاء کہ جو اس طرز سیاست کی بنیاد ہے، ہمہ گیر انقلاب کے لئے راہ ضرور ہموار کر دے گا۔ معترضین کو یہ سمجھنا چاہئے کہ انقلاب اسلامی کا لائحہ عمل، ماحول، ضرورت اور وقتی عوامل سے ترتیب پاتا ہے۔ اس لئے کسی بھی ایسے لائحہ عمل میں ہمیشہ اس بات کی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ بدلتے حالات میں انقلابی روح اور انبیائی طریقہ کار کو برقرار رکھتے ہوئے مسلسل ضروری ترمیم کی جاتی رہے۔ پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ مدت سے سیاسی حکمت عملی سے بے بہرہ ۲۰ کروڑ اسلامیان ہند کا کارواں جن سیاسی بے تدبیریوں کا شکار رہا ہے، سیاسی مسائل میں اپنی نظریاتی شناخت کو جس حد تک مسخ کر چکا ہے اسے بہر حال اغیار اور دشمنوں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا کہ یہ کوئی عام ملت نہیں، الٰہی مشن کی دعویدار آخری رسولؐ کی امت ہے۔

اس عظیم الشان انبیائی مشن کو انجام دینے کے لئے ضرورت ہے ایک ایسی انقلابی قیادت کی، ایک ایسی بے لوث اور صالح امامت کی، ایک ایسی مخلص اور درویش صفت شخصیت کی جو اسلامیان ہند کے قلوب کو اپنی مٹھی میں لے سکے اور جس کی انقلابی بصیرت کم سے کم قوت کے زیاں پر بڑی سے بڑی فتح حاصل کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ جب تک امت ایک ایسے محور و مرکز پر جمع نہیں ہوتی اور جب تک بھانت بھانت کی بولی لگانے والوں کو الٰہی مشن کی طرف متوجہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک کوئی بڑی اور قابل ذکر تبدیلی ممکن نہیں۔

اسلامیان ہند پر لازم ہے کہ وہ معاصر کرداروں میں، چلتے پھرتے مخلص مسلمانوں میں، پرعزم جواں حوصلہ اور بابصیرت انسانوں میں ایسا مرد درویش تلاش کریں جو تاریخ کے بہتے دھارے پر ضرب لگانے کا حوصلہ رکھتا ہو، جس کے پاس کفر کی عالمی قوت کو شکست دینے کا کامیاب منصوبہ موجود ہو، جو انقلاب کے انبیائی اصولوں کو نئی صورت حال پہ منطبق کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو اور جس کا دل ہر لمحہ شہادت کی شدید آرزو سے مچلا جاتا ہو۔ گو کہ معاصر انقلابی شخصیت کی شناخت ایک نازک اور مشکل مسئلہ

ہے لیکن ہندوستان میں ایک بڑی تبدیلی کے لئے لازم ہے کہ اسلامیان ہند اس منزل کو اولین فرصت میں سر کریں۔

ہمارے یہاں متقدمین کی انقلابی تحریکیوں کا بالعموم کچھ اس انداز سے تذکرہ کیا گیا ہے کہ وہ عام گوشت پوست کے انسانوں سے بالکل مختلف کشف و کرامات کی شخصیت معلوم ہوتے ہیں۔ بھاری بھرکم القاب و آداب کے نیچے ان کی انقلابی شخصیت کھو سی گئی ہے۔ اس رویے سے ایک نقصان یہ ہوا کہ مخلص مسلمانوں کی نگاہیں معاصر انقلابی قیادت میں بھی "رحمۃ اللہ علیہ" کی شان ڈھونڈھتی ہیں جس کی عدم موجودگی انہیں اس مشن میں پوری طرح تعاون سے روکے رکھتی ہے۔ البتہ انقلابی قیادت کی موت کے بعد جب تاریخ کی گرد اس معاصر شخصیت پر پردہ ڈال دیتی ہے تو پھر یہ انقلابی شخصیت بھی محترم و مقدس بنادی جاتی ہے۔ یہی وہ رویہ ہے جو سید احمد شہید، مہدی سوڈانی، عثمان وان فودیو، حسن البنا اور ابوالاعلیٰ مودودی پر جان نچھاور کرنے والے اور ان کی تحریکوں سے والہانہ وابستگی رکھنے والوں کو معاصر انقلابی مہم میں شرکت سے روکتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو جماعتی گروہ بندیوں سے آزاد ہیں تو انقلابی مشن سے واقف کار لوگوں کے مقابلے میں انہیں زیادہ حق پہنچتا ہے کہ وہ معاصر انقلابی تحریک میں شرکت کے سلسلے میں تعطل کا رویہ اختیار کریں۔

ماضی کی جن انقلابی شخصیات کا آج آپ انتہائی احترام و عقیدت سے نام لیتے ہیں اور جن کی بعض افہام و تفہیم کی غلطیوں کی نشاندہی پر آپ کی جبین شکن آلود ہوجاتی ہے وہ لوگ اپنے عہد میں اس تقدس کے حامل یقیناً نہ تھے۔ وہ معاصر معاشرے کے ایک فرد تھے، بازاروں میں چلنے پھرنے والے عام لوگ تھے جنہیں خود مسلمانوں کے ہاتھوں مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدا میں ان کی انقلابی شخصیت کو دریافت کرنے والی نگاہیں بہت کم تھیں۔ البتہ آج جب وہ اپنی اہمیت تاریخ کے اوراق میں محفوظ کراچکی ہیں، ان کی انقلابیت کا نغمہ گانے والوں کی کمی نہیں۔ حتیٰ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی انقلابی دعوت کا آغاز کیا اس وقت آپ قریش کے لئے صرف ایک معزز فرد تھے گو کہ اہل مکہ آپ کی بعض خوبیوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے لئے یہ مشکل ہوگیا کہ اپنے جیسے چلتے پھرتے آدمی کو خدا کا آخری رسول تسلیم کرلیں۔ البتہ جب رفتہ رفتہ دعوت حق اپنا اثر دکھاتی گئی تو لوگوں کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں ایک رسول کی شناخت آسان ہوتی گئی، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو مکہ پر رسولؐ

کے غلبہ کو ان کی صداقت کا پیمانہ سمجھ بیٹھے تھے، فتح مکہ کے بعد پورے اطمینان قلب کے ساتھ اسلام میں داخل ہوگئے۔ لیکن ذرا غور کیجئے! رسالت جیسی ممتاز و منفرد شے کو، محمد جیسی صادق و امین شخصیت میں، ابتداً کتنے لوگ دریافت کرپائے؟ یہی وہ لوگ تھے جو پیغمبر اسلام کے دست و بازو بنے اور جن کی والہانہ سپردگی سے اسلام کی تحریک غلبے کے مرحلے میں داخل ہوسکی اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سابقون الاولون کو امتیازی مراتب سے نوازا ہے۔ "تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان کے برابر نہیں ہوسکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔" (قرآن) انقلابی تحریک کے لئے واقعی تعاون وہ ہے جو اسے بالکل ابتدائی مراحل میں اس وقت پیش کیا جائے جب کہ دور دور تک فتح و کامرانی کے آثار دکھائی نہ دیتے ہوں اور جب اس کے مد میں اپنا سرمایہ لٹانا یا اس شخصیت کے ابرو و اشارے پر حرکت میں آجانا دیوانگی قرار پائے، دنیا اسے پرلے درجے کی حماقت قرار دے۔ صحابہ کرام نے جب رسول اکرمؐ کے قدموں میں سب کچھ لاکر ڈال دیا تھا، اپنے کاروبار کو تباہ کر کے اس قافلے میں شامل ہوگئے تھے اس وقت دور دور تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کا امکان نہ تھا، بلکہ رفتہ رفتہ صورت حال اتنی خراب ہوتی گئی کہ محمد سمیت ان کے اصحاب کو جان کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ایسی خطرناک صورت حال میں اپنا سب کچھ اس مہم کو پیش کردینا یقیناً دیوانگی سے کمتر درجے کا عمل نہ تھا۔ عصر حاضر کی انقلابی مہم کو آج پھر اسی دیوانگی کی ضرورت ہے۔

عام ذہنوں میں انقلابی شخصیت کے لئے تقدس کا جو عنصر پایا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری انقلابی شخصیتوں کو رحمۃ اللہ علیہ کی شان پیدا کرنے میں عمر گذر جاتی ہے۔ جب واقعی رحمۃ اللہ علیہ کی شان پیدا ہوجاتی ہے اور لوگوں کا ایک حلقہ ان کے گرد جمع ہونے لگتا ہے اس وقت اولاً ان کے قویٰ کسی انقلابی عمل کے لئے موزوں نہیں رہتے۔ ثانیاً اگر انھوں نے کسی انقلابی دعوت کا آغاز کر بھی دیا تو اس دعوت کے موثر ہونے سے قبل ہی بے چارہ قائد واقعتاً رحمۃ اللہ علیہ ہوچکا ہوتا ہے اس کے برعکس انقلابی قیادت کو اگر بالکل ابتدائی مرحلے میں تعاون ملا ہوتا تو یقیناً صورت حال مختلف ہوتی۔ اگر انقلابی قیادت میں غلبہ اسلام کے لئے شدید تڑپ اور انقلابی ماڈل کی صحیح تفہیم موجود ہے تو مخلص مسلمانوں کی والہانہ سپردگی انقلابی تحریک کی کامیابی کی ضمانت بن سکتی ہے۔ رہا انقلابی شخصیت کے عملی مظاہر کا مسئلہ تو اس کا اظہار جدوجہد کے عملی میدان ہی میں ہوگا اور وہی اس کی انقلابی شخصیت کی مکمل نشوونما کا حقیقی

میدان ہے۔

انقلابی آرکی ٹائپ کے مطابق انقلابی قیادت لٹی پٹی خستہ حال شخصیت ہوتی ہے۔ یہ باہر سے خالی اندر سے بھرپور ہوتی ہے۔ اس کے گرد جمع ہونے والے لوگ اعلی روحانی اقدار کے حامل ہوتے ہیں جن کے لئے مادے کی دنیا وقعت کھو چکی ہوتی ہے۔ ان کا گوہر مقصود اپنا سب کچھ لٹا دینا ہوتا ہے۔ اس مشن کے لئے کچھ کھونا در اصل پانے کا احساس دلاتا ہے۔ قائد سے تعلق جس قدر بڑھتا ہے ان کی قربانیوں کے مظاہر بڑھتے جاتے ہیں۔ حب دنیا اور حب جاہ کے دیوانے اگر وسائل کی وصولیابی کے لئے کسی شخصیت کے گرد جمع ہو گئے ہوں تو اس پر انقلابی قیادت کا گمان نہیں ہونا چاہیے۔

اسلامی انقلاب کے آرزو مندوں پر لازم ہے کہ لٹی ہوئی وسائل سے تہی دست قیادت کو بالکل ابتدائی مرحلے میں اپنا سب کچھ پیش کر دیں۔ ایک ایسی صورت حال میں جب بظاہر اس انقلابی قیادت سے کچھ ہوتا ہوا محسوس نہ ہو، وہ عصری تاریخ کا ایک چلتا پھرتا کردار ہو اور اس کی مہم میں اپنے جسمانی اور مادی وسائل لگانے میں ڈوب جانے یا ضائع ہو جانے کا بھرپور اندیشہ ہو، آپ کا تعاون واقعتاً فی سبیل اللہ ہو گا کہ آپ بالکل ابتدائی مرحلے میں جس مہم میں اپنا سرمایہ لگا رہے ہیں، اس کے پس پشت صرف اور صرف آپ کا جذبہ جہاد فی سبیل اللہ ہے کہ آپ کسی شخصیت کے زیر سحر نہیں بلکہ صرف اور صرف اللہ کے لئے انقلابی مشن میں اپنا سرمایہ لگا رہے ہیں، جب کہ بعد کے مراحل میں شخصیت کا عقیدت واعتبار بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی تحریک کی طرح آج بھی اسلامی انقلابی تحریک ان لوگوں کے تعاون سے آگے بڑھے گی جو کسی شخصیت، جماعت یا تسلیم شدہ ہستی کے زیر اثر جمع ہونے کے بجائے صرف اور صرف غلبہ اسلام کے انقلابی منشور پر جمع ہوں، جو اس راہ میں انتہائی شرح صدر کے ساتھ خلوص دل سے صرف اور صرف اللہ کے لئے سب کچھ لٹانے پر آمادہ ہوں اور جو نازک ترین لمحات میں بھی حضرت سعد بن معاذ کی طرح قائد انقلاب سے کہہ سکیں:

"اے خدا کے رسول آپ جو کچھ چاہتے ہیں اسے کر گذریئے، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ سمندر بھی ہمارے سامنے لے آئیں اور اس میں داخل ہوں تو ہم آپ کے ساتھ داخل ہو جائیں گے۔ ہمارا ایک بھی شخص پیچھے نہ ہٹے گا۔ ہم اس بات کو ناپسند نہیں کرتے کہ کل آپ ہمیں لے کر دشمن سے

ٹکرا جائیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہنے والے اور مقابلہ کے وقت سچے اترنے والے لوگ ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھاوے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔"

(ابن ہشام)

آج پھر انقلابی مشن کو آپ کی جان و مال کی ضرورت ہے۔ آج پھر الٰہی انقلابی مشن آپ سے قرض کا طالب ہے۔ کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟

عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ جب قران میں یہ آیت نازل ہوئی کہ "کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے" (الحدید) تو ابو دحداح انصاری نے کہا۔ یا رسول اللہ کیا اللہ واقعی ہم سے قرض کا طالب ہے؟ فرمایا ہاں ابو دحداح۔ کہا اے اللہ کے رسول اپنا ہاتھ لائیں۔ راوی کہتا ہے کہ آپ نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا۔ کہا کہ میں نے اپنا باغ اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ ان کا ایک کھجور کا باغ تھا جس میں چھ سو درخت تھے۔ اس وقت ام دحداح بچوں کے ساتھ باغ میں تھیں۔ ابو دحداح باغ میں واپس آئے اور آواز دی، اے ام دحداح۔ کہا ہاں۔ باہر نکلو کہ ہم نے باغ رب عزوجل کو قرض میں دے دیا ہے۔ بیوی نے کہا اے دحداح آپ کی تجارت کامیاب رہی اور اپنے سامان اور بچوں کو لے کر باغ سے نکل آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابو دحداح کے لئے جنت میں کتنے ہی ہرے بھرے پھل دار درخت ہیں۔" (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

جب تک انقلابی مشن کو اس درجے کا تعاون نہیں ملتا، جب تک ایثار کے مظاہر پھر عام نہیں ہوجاتے اور جب تک دیوانگی کی یہ ریت دوبارہ قائم نہیں ہوتی اسلامی انقلاب کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ رہے وہ لوگ جنہیں غلبہ اسلام کا خیال خوش کن تو ضرور لگتا ہے البتہ وہ اس مہم میں کسی عملی شرکت سے جی چراتے ہیں تو یہ دراصل متزلزل ایمان کے لوگ ہیں۔ بھلا ان بیچاروں میں اتنی تاب کہاں کہ سابقون الاولون کا بار اٹھا سکیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی ایمان کا ان کے دلوں میں اترنا باقی ہے۔

مابعد انہدام ہندوستان میں

ایک نئے لائحہ عمل کی ضرورت

برادران گرامی اور دختران ملت! السلام علیکم و رحمتہ اللہ!

لال قلعے سے مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد یہ پہلا موقع ہے جب دہلی کی سرزمین پر مسلمان اپنی پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد کر رہے ہیں۔ آج دلی کی سرزمین پر ایک نئی تاریخ رقم ہو رہی ہے۔ ہم میں سے بہتوں کو شاید ملی پارلیامنٹ کے اس اجلاس کی تاریخی اہمیت کا اس قدر اندازہ نہ ہو لیکن آنے والا مؤرخ لکھے گا کہ بیسویں صدی کے اختتام پر اسلامی نشاۃ ثانیہ کا نقطہ آغاز مٹھی بھر لوگوں کا یہ اجتماع تھا۔ کسے معلوم لٹے پٹے، تہی دست، پریشاں حال اور مادی ناآسودگیوں کے شکار لوگوں کا یہ مختصر سا قافلہ جو آج ملک بھر سے اپنے دلوں میں اضطراب کا سمندر سموئے اس ہال میں جمع ہوا ہے وہ دراصل غلبہ اسلام کی تحریک میں سبقت لے جانے ولوں کا گروہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے منتخب فرمالیا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کے لئے یہ ہرگز ناممکن نہیں کہ وہ کمزور انسانوں سے کوئی بڑا کام لے لے۔ خدا کرے ہماری یہ آرزو پوری ہو۔

برادران اسلام! ملی پارلیمنٹ کے تصور کے آغاز سے ہی یہ سوال پوچھا جاتا رہا ہے کہ آخر مسلمانوں کو اس ملک میں ایک علیحدہ پارلیامنٹ کی ضرورت کیوں پیش آگئی اور یہ کہ کوئی ایسی پارلیمنٹ جس کے پاس قوت نافذہ نہ ہو کیا ملکی حالات پر کوئی واقعی اثر ڈال سکے گی؟ بعض لوگ اس خوف کا اظہار کرتے نہیں تھکتے کہ مسلمانوں کا خالص مذہبی و ملی بنیادوں پر کوئی اجتماع ہندو احیاء پرستی کو تقویت دے گا اور یہ کہ اس طرح دشمنوں کو واویلا مچانے اور مسلم دشمنی کی بنیاد پر منظم ہونے کا ایک اور موقع ہاتھ آجائے گا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی کوئی علیحدہ پارلیامنٹ وجود میں لانے کا

واضح مطلب گویا اس بات کا اعلان ہے کہ ان کا اس سیکولر نظام سے اعلان جنگ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اندیشے کسی حد تک درست ہوں لیکن ہمیں محض اندیشوں یا اعتراضات سے خوف کھانے کے بجائے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس ملک میں ملی پارلیامنٹ کا قیام مسلمانوں کے مذہبی وجود کے تحفظ، عظیم انقلابی مشن کی ترویج و اشاعت اور اس ملک سے ظلم و ناانصافی کا خاتمہ کرکے بالآخر قرآنی اصولوں پر کسی صالح، پرامن اور عادلانہ معاشرے کے قیام میں معاون ہوسکتا ہے یا نہیں؟ کہ اگر یہ سب کچھ ممکن ہے اور ملی پارلیامنٹ کے قیام سے ان عظیم انبیائی مقاصد کی طرف کوئی پیش قدمی ہوتی ہے تو پھر ہمارے لئے ان اعتراضات کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ پھر ہمارے پاس اس بات کے لئے بھی موقع نہیں کہ ان لغو اور بزدلانہ وسوسوں پر غور کرنے کے لئے لمحہ بھر بھی ضائع کریں۔

رہے وہ لوگ جن کے ذہنوں میں کسی پارلیامنٹ یا قوت نافذہ رکھنے والی کسی مجلس شوریٰ کا خاکہ، کسی خطہ زمین، عسکری قوت یا منظم اور معروف حکومتی اداروں سے وابستہ ہے تو ان کی وضاحت کے لئے صرف اتنا عرض ہے کہ موجودہ ملی پارلیامنٹ غیر عرضی (Non-territorial) بنیادوں پر قائم کی گئی ہے۔ یہ مٹھی بھر انقلابیوں پر مشتمل ایک ایسا گروہ ہے جس کے عزائم کی سلطنت خطوں، ملکوں اور قاروں میں نہیں سماسکتی۔ یہ نہ تو ملکوں اور سلطنتوں کی عسکری فتح کو کوئی اہمیت دیتی ہے اور نہ ہی اس کا انحصار کسی سیاسی نظام پر براہ راست یا بالواسطہ قبضے پر منحصر ہے۔ اس کے برعکس ملی پارلیامنٹ کا دائرہ عمل معلوم سیاسی حدود سے کہیں آگے اور محسوس سیاسی قوت سے کہیں پرے لوگوں کے قلوب کی سلطنت تک پھیلا ہوا ہے۔ کسی ظاہری سیاسی قوت اور معلوم سیاسی اداروں کے بغیر اس کے پاس وہ حیرت انگیز قوت نافذہ ہے جو چشم زدن میں بڑی سے بڑی سیاسی قوت اور عسکری تنظیموں کے پرانچے اڑا سکتی ہے۔ گویا اگر اسلامی مشن کے حاملین کا ایک منظم گروہ وجود میں آجائے اور وہ حالات کی تبدیلی کے لئے سب کچھ کر گذرنے پر آمادہ ہو تو اللہ کی نصرت کے طفیل اس کی کامیابی ممکن ہی نہیں یقینی بھی ہے۔ یہ محض گرمی گفتار نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ جب مٹھی بھر انقلابیوں کی ایک انتہائی قلیل تعداد نے تبدیلی حالات کے لئے منظم کوششوں کا آغاز کردیا تو دنیا کی کسی سیاسی قوت کے بس میں نہ رہا کہ وہ ان انقلابیوں کا راستہ روک سکے۔ جن لوگوں کی تسکین ماضی کے ان حیرت انگیز واقعات اور نصرت الٰہی کے ان واضح اشارات سے نہ ہوتی ہو یا جن حضرات کو نصرت

الٰہی کے سہارے لشکر اسلامی کی حیرت انگیز فتوحات اساطیری قصے معلوم ہوتے ہیں ان کے لئے عصر حاضر میں لڑی جانے والی دنیا کی سب سے بڑی فوج کے خلاف مٹھی بھر افغانیوں کی وہ جدوجہد کافی ہے جس کے نتیجے میں انتہائی تہی دست، مفلوک الحال اور غیر تربیت یافتہ اہل ایمان کے ایک گروہ نے حالات کی تبدیلی کا عزم مصمم کرلیا تو دنیا کی سب سے بڑی عسکری قوت ان انقلابی اقدامات کی تاب نہ لاکر پاش پاش ہوگئی۔ مٹھی بھر انقلابیوں کی تنظیم سے پیدا ہونے والی یہی وہ قوت ہے جو کسی بھی لمحے اپنے اندر بڑے سے بڑا دھماکہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس انبیائی انقلاب کی تربیت و تنظیم انبیائی اصولوں پر ہو اور یہ کہ حاملین انقلاب کے دل ظاہری اسباب اور مادی و حربی وسائل کے بجائے آسمانوں پر اٹکے ہوں۔

ملی پارلیامنٹ کی تاسیس سے اگر بعض ذہنوں میں کسی متبادل سیاسی نظام کی ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو یہ عجب نہیں کہ ایسا ہونا عین فطری ہے۔ کسی جمہوری نظام میں جہاں فکر و نظر کی آزادی کو مستحسن خیال کیا گیا ہو۔ آخر ایک متبادل نظام کی تلاش اور اس کے عملی پہلوؤں پر غور کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ سیاسی نظام میں یہ قوت نہیں کہ وہ بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ اور ظلم و ناانصافی کے خاتمے کی طرف کسی پیش قدمی کی بشارت دے سکے۔ پھر ۴۶ سالہ سیاسی تجربہ آہوں اور کراہوں کی ایک سیاہ رات ہے، ایک ایسی رات جس میں نوید صبح کا کوئی امکان نہ پایا جاتا ہو، پھر بھلا اگر بعض دلوں میں طلوع صبح کی خواہش شدت اختیار کر جائے اور حالات سے تنگ آکر بعض ہاتھ رات کی سیاہ نقاب اتار پھینکنے پر مصر ہوجائیں تو یہ لوگ مبارکباد کے مستحق ہوں گے نہ کہ مذمت کے۔ طلوع صبح کی ضرورت کا یہی وہ شدید احساس ہے جو آج ملک بھر سے دردمندان امت کو یہاں کھینچ لایا ہے۔

برادران گرامی! ملی پارلیامنٹ کا یہ اجلاس تاریخ کے ایک ایسے مرحلے میں منعقد ہو رہا ہے جب نام نہاد سیکولر ہندوستان کے ڈھانچے کو زمین بوس ہوئے ابھی صرف چند ماہ گذرے ہیں، ایک سیاسی نظام جس کے قابل عمل ہونے کا مغالطہ گذشتہ ۴۶ برسوں سے باشندگان ملک کے ذہنوں پر طاری تھا، ابھی چند ماہ ہوئے سیکولرزم کے اس غبارے سے ہوا نکلی ہے۔ اس نظام کے ناکام ہونے کا یقین تو سب کو آگیا ہے البتہ کسی نئے اور متبادل نظام کی عدم موجودگی نے ایک بار پھر اسی قدیم اور ناکارہ نظام کی اصلاح و مرمت کی ضرورت کا احساس ہمارے اہل فکر کے ذہنوں میں پیدا کر دیا ہے۔ گویا موجودہ ایام کو ملک کے لئے ایک

عبوری دور کہا جاسکتا ہے۔ ایک متبادل، توانا، قابل عمل اور صحت مند نظام کی اس ملک کو شدت سے تلاش ہے۔ ایسی صورت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ جو لوگ کسی صالح اور عادلانہ نظام پر مشتمل کوئی قابل عمل طریقہ حیات کے حامل ہوں وہ انہدام کے بعد پیدا ہونے والے اس سیاسی و نظری خلاء کو پر کرنے کے لئے میدان میں آئیں۔ گویا مسلمانوں کا ایک مذہبی اکائی کی حیثیت سے منظم ہونا اور انبیائی لب و لہجے کی تشکیل جدید ان کی اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ اس ملک کی ضرورت ہے۔ ملی پارلیامنٹ کا یہ اجلاس مابعد انہدام ہندوستان میں اس لئے اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔

گذشتہ چند ماہ میں اس احساس نے خاصی شدت اختیار کر لی ہے کہ اس ملک کی کشتی ڈوبتی جارہی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ ناعاقبت اندیش سیاست دانوں نے اس ملک کے سیاسی کارواں کو ایک ایسی اندھی گلی میں پہنچا دیا ہے جہاں راستے مسدود ہیں اور ترکیبیں کھوئی گئی ہیں۔ اگر حالات اسی رخ پر چلتے رہے تو مجھے کہہ لینے دیجئے کہ اس ملک کا کوئی مستقبل نہیں۔ آگے جو کچھ نظر آتا ہے وہ گہری کھائی ہے، قبرستان کی سی خاموشی ہے، خوفناک سناٹا ہے، آگ اور خون کا موجیں مارتا ہوا ایک لامحیط سمندر ہے، ایک ایسی خانہ جنگی ہے جس میں صرف تخریب ہے، تباہی ہے۔ گویا ایک ایسی صورت حال ہے جس کے تصور سے ہی ذی ہوش انسانوں کا دم نکل جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس انتہائی سنگین صورت حال میں مٹھی بھر انسانوں کا یہ اجتماع کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج جس امت کو ملک کی ڈوبتی کشتی بچانے کا فریضہ انجام دینا ہے وہ خود اپنے تحفظ کے خوف میں مبتلا ہے اور یہ کہ ایک انبیائی انقلابی گروہ میں تبدیل ہونے کے لئے خود اسے ایک صبر آزما اور ہلا مارنے والی جدوجہد درکار ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر غور و فکر اور افہام و تفہیم کے لئے ہم اس دو روزہ اجلاس میں سر جوڑ کر بیٹھیں گے۔

برادران گرامی! کسی کام کو کرنے سے پہلے کرنے والوں کو اپنی قوت کا صحیح اندازہ لگانا ضروری ہوتا ہے۔ آج جس امت کو ملک کے تحفظ کا فریضہ انجام دینا ہے، جسے اس ملک میں جاری مسلسل قتل و غارت گری کو روکنا ہے اور جسے بالآخر ظالموں کے جابر پنجوں سے قوت سلب کرنے کا کام انجام دینا ہے، خود ان کے ہاتھوں میں قوت کی اتنی مقدار تو ضرور ہی ہونی چاہئے کہ وہ اس منظم انقلابی جدوجہد کا کمال ہنرمندی سے آغاز کر سکیں۔ بظاہر صورت حال انتہائی مایوس کن ہے کہ گذشتہ ۴۶ سال سے ایک قتل گاہ میں زندگی گذارنے کی وجہ سے کسی حقیقی زندگی کے خیال سے آج جمہور امت کے قلوب ناآشنا ہیں۔

امت کے بڑے بڑھوں کو اب بھی یہ خوف ستائے دیتا ہے کہ نوجوانان امت کا کوئی انقلابی قدم کہیں مصائب اور تکالیف میں مزید اضافے کا سبب نہ بن جائے۔ دوسری طرف نوجوانان امت کسی فکری تربیت اور عملی منصوبہ بندی سے خالی غیر منظم اور بے ترتیب اقدامی عمل کے حامی بنتے جارہے ہیں۔ ایسی صورت میں خود امت کے اندر انتشار فکر و عمل کا مزید پیدا ہونا عبث نہیں، بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب اس کا روحانی ڈھانچہ زمین بوس ہو چکا ہو، جب روحانی تربیت اور قلوب کی اصلاح و تطہیر کے عمل سے امت کی ایک عظیم اکثریت نا آشنا ہو، جب مصیبت کی ہر گھڑی میں صرف اور صرف اللہ کی نصرت کے خیال کے بجائے ان کی نگاہیں بار بار غیر مسلم سیاسی پارٹیوں، قاتل سیاسی رہنماؤں اور درندہ صفت سیکولر بازی گروں کی طرف اٹھتی ہوں، جب اس کے اندر ایسے لوگوں کی قابل ذکر تعداد پیدا ہو چکی ہو جو محض حقیر ذاتی منفعت کے لئے امت کی متاع کا سودا کرنے میں بیباک ہوں اور جنہیں بد قسمتی سے معاشرے میں عزت و توقیر کی نگاہ سے بھی دیکھا جارہا ہو، جب صورت حال اس قدر خراب ہو چکی ہو کہ قاتل حکمراں جماعت کا مقاطعہ تو درکنار اصحاب اقتدار سے راہ و رسم کو باعث افتخار سمجھا جاتا ہو تو ایسی صورت میں اس تباہ حال امت سے کسی انقلابی کام کا لیا جانا عبث نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ البتہ وہ لوگ جن کے قلوب ضمیر فروشی کے داغ سے نا آشنا ہیں اور جو ہر لمحہ غلبہ اسلام کی قندیل کو اپنے سینوں میں روشن رکھے ہوئے ہیں اور جو ہر گھڑی تحفظ اسلام کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے گویا تیار بیٹھے ہیں تو ان کی مسلمہ روحانی عظمت کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ انہیں موجودہ سیاسی ڈھانچے میں اور خود مسلمانوں کے زوال زدہ معاشرے میں تقریباً بے وقعت بنا دیا گیا ہے، اس کی وجہ کچھ تو ان کی مسائل دنیا سے لاتعلق رہنے کی روش ہے اور کچھ موجودہ سیاسی نظام کی وہ برکت ہے جس میں امت کے درمیان مفاد پرست قیادت کے ابھرنے کا بھرپور امکان پایا جاتا ہے۔ پھر کسی واقعی صالح قیادت کی عدم موجودگی ان سعید روحوں کو بہت کچھ کرنے سے روکے دیتی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً نصف صدی کی غیر منصوبہ بند کوششوں کے بعد ان کے انقلابی عزائم اب ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ انہیں ایسا لگتا ہے گویا اب اس ملک کے حالات کو یکسر تبدیل کیا جانا ممکن نہیں۔ یعنی ہندوستان میں غلبہ اسلام کا خیال عبث ہے، عظمت رفتہ کی بازیابی ناممکن ہے اور یہ کہ قوت اسلامی کا نیا میزانیہ تشکیل دینا تو کجا اس سنگین، اذیت ناک اور ہلا مارنے والی کیفیات سے نجات بھی شاید اب ممکن نہیں۔

گذشتہ نصف صدی کے دوران اس ملک میں ہمارا سفر سمتوں کے تعین کے بغیر جاری رہا ہے۔ جن لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اسلام کے تحفظ کے لئے علوم اسلامی کی ترویج واشاعت ضروری ہے وہ غیر منصوبہ بند انداز میں دانش گاہیں کھول کر بیٹھ گئے پھر علوم اسلامی کے نام پر جو باقیات مروجہ مدارس میں موجود تھے انہیں جوں کا توں قبول کر لینے کو ہی کافی سمجھا گیا۔ نہ تو اس امر پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ علوم پر ہونے والے جدید اضافے کی شرعی حیثیت کیا ہے اور یہ کہ خود ان سے استفادے کے بغیر محض قدیم طریقہ تعبیر جدید دنیا میں کہاں تک مؤثر ہو سکتا ہے اور نہ ہی کبھی اس بارے میں کسی منصوبہ بندی کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ بے شمار فارغین مدارس علوم اسلامی کی ترویج و اشاعت کا کام کس طرح انجام دیں گے۔ ان کے لئے سماج کے مختلف طبقات میں خدمات کا انداز کیا ہوگا اور یہ کہ امت کے پاس اتنی بڑی تعداد میں مبلغین اسلام کو تحفظ دینے کا کوئی معاشی نظم بھی موجود ہے یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دینی علوم کے فارغین خود مسلم معاشرے میں وہ مقام نہ پاسکے جس کے وہ مستحق تھے اور نہ ہی مذہبی اور سماجی قیادت میں انہیں ان کا جائز حق مل سکا۔ ان کی ناقدری نے خود کتاب وسنت کے عظیم روحانی دبدبے کو عوام کی نگاہ میں بے وقعت بنا دیا۔ دوسری طرف جسے دنیا کی فکر سمائی وہ محض دنیا کے حصول میں سرگرداں ہو گیا، نسلیں گذر گئیں اور انہیں یہ خیال بھی نہ آیا کہ ان کا تعلق کسی ایسے نظریاتی گروہ سے ہے جو محض کھانے کمانے اور دنیا جینے کے بجائے ایک عظیم انبیائی مقصد کی خاطر تشکیل دیا گیا ہے۔ گویا دونوں سطح پر امت نے اپنے بہترین افراد کو کھو دیا، کچھ تو دین کے نام پر گئے اور کچھ دنیا جینے کے ہوس میں ضائع ہو گئے۔

آج جس امت کو اس ملک کی ڈوبتی کشتی بچانی ہے خود اس پر نزاع کی کیفیت طاری ہے۔ گذشتہ نصف صدی کے سیاسی استحصال نے اسے ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں خود اس کی نظریاتی شناخت مسخ ہو چکی ہے۔ کہنے کو تو یہ بیس کروڑ مسلمان حاملین قرآن ہیں لیکن عملی زندگی میں ان پر ہندو تہذیب و ثقافت کا غلبہ ہے۔ اب ان کی شناخت انقلابی عمل اور انبیائی پیغام نہیں بلکہ ہندوستانی ثقافت کا وہ مخصوص لب و لہجہ ہے جو صدیوں کے تعاون سے اس ملک میں انہیں حاصل ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو ملی شناخت کی لڑائی کا بڑا حصہ ہند اسلامی علامتوں کے تحفظ پر صرف ہو رہا ہے جس کا مسلمانوں سے کوئی تعلق ہو تو ہو براہ راست انبیائی انقلابی اسلام کے چوکھٹے میں ان علامتوں کی بہت زیادہ اہمیت نہیں۔ میرے خیال میں

اگر ان علامتوں کو برقرار رکھنے میں ہم کامیاب بھی ہوگئے اور اصل انقلابی لب ولہجے کی تشکیل نو کا خیال پیدا نہ ہوا تو یہ عمل اس ملک میں اسلام کے مستقبل کی ضمانت نہیں بن سکتا۔ دیکھا جائے تو اس ملک کی بیشتر مسلم جماعتیں، تنظیمیں دراصل انہی ملی ثقافتی علامتوں کے تحفظ کی جنگ لڑرہی ہیں۔ البتہ جو امر انتہائی باعث حیرت ہے وہ یہ کہ ہر عامل کامل، عالم شریعت اور شیخ طریقت نے ان ہی ثقافتی علامتوں کے تحفظ کو جہاد اسلامی کا عین لہ بجنڈا قرار دیا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے نام پر متحرک افراد، ادارے، جماعتیں اور انجمنیں اصل انقلابی پیغام کی ترویج و اشاعت سے بہت دور محض ثقافتی سرمائے کے تحفظ پر اپنا زور صرف کئے ہوئی ہیں۔ گذشتہ نصف صدی کے دوران تحفظ اسلامی کی یہ لے یہاں تک بڑھی کہ انقلابی اور اقدامی لب ولہجے والا اسلام اب تقریباً نامانوس ہو چکا ہے۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ کی سرگرمیوں کا جائزہ لیجئے تو حیرت ہوتی ہے کہ آخر یہ کس اسلام کے مبلغ ہیں اور کس کتاب سے انہیں یہ رہنمائی ملی ہے کہ وہ اسلام کی اقدامی اور انقلابی قوت سے صرف نظر کرتے ہوئے محض اسے ایک ورثے کے طور پر محفوظ کرنے کے کام میں لگ جائیں؟ آخر یہ میوزیم میں رکھا جانے والا اسلام انہیں اس قدر عزیز کیوں ہے؟ میرے نزدیک ورثہ اسلامی کے محض تحفظ کا خیال اور کسی طرح سکون سے اسلامی زندگی جئے جانے کا مغالطہ نہ صرف یہ کہ اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں خطرناک اندیشے پیدا کرتا ہے بلکہ یہ عمل خود اسلام کی اس عظیم اقدامی، انقلابی اور مسخرانہ قوتوں کا انکار ہے جو چشم زدن میں اس ملک میں اسلامیان ہند کی ایک نئی تاریخ لکھ سکتی ہے۔ رہی بات علامتوں کے تحفظ کی تو میرے نزدیک شیروانی، بریانی اور اردو زبان کی اس قدر اہمیت نہیں کہ اس کی قیمت پر اصل انقلابی پیغام کی ترویج و اشاعت سے سرمو بھی انحراف کیا جائے۔

ذرا غور کیجئے! اس ملک میں مسلمانوں کے بڑے بڑے مؤقر اور معتبر ادارے جن میں سے بعض کو مخصوص مذہبی تقدس بھی حاصل ہے یا وہ جماعتیں جو مسلمانوں کے درمیان اپنا مقام بنا چکی ہیں آخر ان سبھوں کی چلت پھرت کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ کیا یہ سب کی سب کسی نہ کسی حیثیت سے ہند اسلامی سرمائے کے تحفظ کے لئے کوشاں نہیں ہیں؟ پھر اس بات کا بھی جائزہ لیجئے کہ گذشتہ نصف صدی کے سفر میں انقلابی لب ولہجے والا اسلام آخر کہاں کھو گیا ہے؟ آخر یہ تمام حضرات محض زندہ رہنے اور اس ملک میں محض ایک کمزور اقلیت کی حیثیت سے اپنے آپ کو برقرار رکھنے پر کیوں قانع ہوگئے ہیں اور جب علماء و

مشائخ کا یہ حال ہو تو اس کا اثر امت کے سواد اعظم پر پڑنا عین فطری ہے۔

براداران گرامی! توقع تھی کہ مابعد انہدام ہندوستان میں حالات کی سنگینی سے متاثر ہوکر اور تہہ در تہہ مسائل کے بوجھ سے تنگ آکر فکر و عمل کا ایک نیا رویہ تشکیل پائے گا اور یہ کہ امت اسلامیہ ہند جس انقلابی انبیائی پیغام کی ترویج و اشاعت سے اب تک غافل رہی ہے اسے اب اپنی غفلت کا احساس ہوگا اور اب نئے جذبے، نئی امنگوں اور نئے ولولوں کے ساتھ غلبہ اسلام کا قافلہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہوجائے گا لیکن افسوس کہ ان توقعات کی بیل ابھی چڑھنے بھی نہ پائی تھی کہ ازکار رفتہ مسلم قائدین کے غول کے غول "سب کچھ ٹھیک ہے" کا احساس دلانے کے لئے میدان میں آگئے اور جمہور امت کو ایک بار پھر مصالحانہ اور ناصحانہ تھپکیوں سے سلانے کی مہم کا آغاز ہوگیا۔ گویا صورت حال کی تبدیلی کا جو شدید احساس پیدا ہوا تھا اس احساس کے قاتل خود وہ لوگ بن بیٹھے جنہوں نے گروہی اور جماعتی دائرے بناکر امت میں تقدس کا مقام حاصل کر رکھا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بمبئی میں مسلمانوں کے قتل عام کے دوسرے دور کے بعد ایک بڑے اردو اخبار میں مسلم پرسنل لاء کے تین اراکین کی طرف سے ایک اشتہار شائع کیا گیا جس میں ان حضرات نے دستور ہند سے اپنی تجدید وفاداری کا گویا اعلان کیا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر ہمارے رہنماؤں کو اس قسم کی تجدید وفاداری کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی ہے۔ کیا انہیں اس بات کا احساس نہیں کہ وہ اپنی ان حرکات سے بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی دستوری حیثیت کو مضحکہ خیز بنادیتے ہیں اور یہ کہ خود اس قسم کے بیانات سے اب ان کی حیثیت امت میں مضحکہ خیز بنتی جارہی ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ گذشتہ نصف صدی کی مسلم سیاست تحفظ کی سیاست رہی ہے۔ البتہ بابری مسجد کے انہدام نے اس پچاس سالہ سیاسی رویے پر ایک سوالیہ نشان ضرور لگا دیا ہے، یعنی دب کر معاملہ کئے جانے کا انداز اور بزدلانہ سیاسی رویے کی تلقین اس ملک میں مسلمانوں کو ایک ایسے مقام پر لے آئی ہے جہاں زندگی کے سراب میں ہر سمت موت ان کا تعاقب کررہی ہے۔ انہیں موت اور موت کے درمیان ہی کسی موت کا فیصلہ کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسلامیان ہند میں ایک ایسی موت کی خواہش جاگ رہی ہے کہ جو زندگی کی طرف لے جاتی ہو۔ البتہ اس ڈرامے کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ شریعت اور مذہبی تقدس کے حوالے سے خود اس عظیم انبیائی انقلابی رویے کی نفی کی مہم کا آغاز ہوچکا

ہے۔ جبہ و دستار والے معروف و غیر معروف ناموں کی گویا باڑھ سی آگئی ہے جو ہر لمحہ امت کو سکون کی نیند سلانے اور سابقہ سیاسی رویے پر پھر سے ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ یعنی جو لوگ بابری مسجد کی کمیٹیوں میں بے وقعت قرار پائے وہ مختلف ناموں سے نئے پرانے بیرزوں کے تحت پھر سے سرگرم عمل ہوگئے ہیں۔ بابری مسجد کی لڑائی پھر اسی انداز سے لڑنے کی کوشش کی جارہی ہے البتہ فرق یہ ہے کہ اب اس پورے عمل پر شریعت کی مہر لگ چکی ہے اور ان حضرات کی گفتگو میں گاہے بگاہے شریعت اور شرعی حیثیت کا تذکرہ بھی آجاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ امت کو اس کے اصل کام سے ہٹاکر آخر کب تک چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھا رکھا جائے گا اور یہ کہ مختلف حوالوں سے مسلمان کب تک اس ملک میں بزدلی کی سیاست کرتے رہیں گے؟

گذشتہ چند ماہ سے اس امت پر جس شدید بے بسی، بے چارگی اور ضعف کی کیفیت طاری ہے، اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ انہدام سے چند ہفتوں تک تو ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے اس ملت کا کوئی پرسان حال نہ ہو۔ پورا ملک مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوگیا۔ ہر مسلم محلہ آہ و بکا کی دردناک صداؤں سے گونج اٹھا، ہر مسلم گھر ماتم کدہ میں تبدیل ہوگیا۔ کوئی ایسی آنکھ نہ رہی جو خون کے آنسو نہ روتی ہو، کوئی ایسا مسلم نوجوان نہ رہا جو اس ملک میں کسی خوشگوار مستقبل کا خواب بن سکتا ہو، کوئی مسلم دوشیزہ نہ رہی جو اپنی عصمت و آبرو کو اس ملک میں محفوظ سمجھ رہی ہو۔ البتہ ان ہلا مارنے والے ایام میں جو چیز سب سے زیادہ شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے وہ دراصل مسلمانوں میں کسی مرکزیت یا قیادت کا فقدان ہے۔ آج ۲۰ کروڑ کی عظیم الشان امت کو یہ معلوم نہیں کہ اس سنگین صورت حال میں اسے کرنا کیا ہے اور یہ کہ اس اذیت ناک صورت حال سے نکلنے کے لئے کتاب و سنت میں کس انقلابی لائحہ عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟ رہے وہ لوگ جو شریعت اور تقدس کے حوالے سے ایک بار پھر سابقہ سیاسی رویے کی ترویج و اشاعت کے لئے میدان میں آگئے ہیں تو ان بے چاروں کو نہ تو کتاب و سنت کے عظیم انقلابی مشن کا کچھ علم ہے اور نہ ہی وہ زبردست حوصلہ جو کسی ایسے مشن کے آغاز کے لئے ہوا کرتا ہے۔

اس سنگین صورت حال میں جب امت کے بڑے بوڑھوں کو حالات کی ہیبت ناک تاریکی میں روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی ہو، جب بڑے بڑوں کے ذہنی افق پر کنفیوژن کے سیاہ بادل منڈلا رہے ہوں اور جب پوری امت، کیا چھوٹے کیا بڑے، کیا عوام کیا خواص، کیا علماء کیا دانشور، ہر شخص کسی واضح

لائحہ عمل سے یکسر خالی ہو تو ایسی صورت حال میں لازم ہے کہ پٹی ڈگر پر بے سوچے سمجھے چلتے رہنے یا اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بجائے سمت سفر کا صحیح تعین کر لیا جائے اور اگر سرنگ کے دوسری طرف کوئی روشنی نظر نہ آتی ہو تو تھوڑی دیر کے لئے کارواں کا سفر موقوف کر دینا ہی مناسب ہے، یہاں تک کہ وہ مطلوبہ روشنی حاصل ہو جائے جس کے بغیر کارواں کو اس طویل، تاریک اور پر خطر سرنگ سے بہ کمال کامیابی نکال لے جانا ممکن نہ ہو۔ پھر جن قلوب پر اللہ تعالیٰ نے کسی انبیائی طریقہ سفر کا مکمل نقشہ واضح کر دیا ہو ان کا بھی فرض ہے کہ وہ پوری احساس ذمہ داری اور فراست مومنانہ کے ساتھ امت کے کارواں کو اس انبیائی راستے پر یکسر موڑ دینے کے لئے ہمہ تن لگ جائیں کہ ہر دور میں یہ عظیم اور مبارک کام اللہ تعالیٰ نے کچھ بظاہر بے وقعت اور کمزور نفوس سے لیا ہے۔ لہٰذا ایسے شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا رونا رونے کے بجائے محض اللہ کے بھروسے میدان میں آئے کہ جب مسائل کی سنگینی اور حالات کی پیچیدگیاں انسانی فراست کو ماؤف کرنے لگے، جب تدبیریں الٹ جائیں، ترکیبوں کی اثر انگیزی ختم ہو جائے اور جب بصیرت کی مشعل باد مخالف کی تاب نہ لا کر بجھ جائے تو ایسی صورت میں مومن کے لئے لازم ہے کہ وہ مایوس ہونے یا تھک ہار کر بیٹھ جانے کے بجائے دوبارہ اپنی مشعل کو کتاب و سنت کے عظیم اور ابدی سرچشمہ سے منور کر لے۔ آج ایک بار پھر تاریخ کے اس نازک مرحلے میں پوری امت کو کتاب و سنت کے نور سے اپنی امیدوں اور آرزوؤں کا چراغ روشن کرنے کی ضرورت ہے۔

ملی پارلیامنٹ : ایک پیش قدمی

ملی پارلیامنٹ کا قیام دراصل اسی انبیائی عمل کا نقطہ آغاز ہے۔ پوری امت کو پھر سے اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش ہے۔ امت کے کارواں کا رخ ایک بار پھر عظیم انقلابی راستے کی طرف موڑ دینے کی سر توڑ جدو جہد کی ابتدا ہے۔ امت کے موجودہ مسائل کو کسی مخصوص نظام کے حدود اربعہ میں حل کرنے کی کسی ناکام کوشش کے بجائے اس کے اصلی ماخذ کی روشنی میں حل کرنے کی طرف ایک قدم ہے۔ ایک ایسے گروہ کی تشکیل کی کوشش ہے جس کا دل مصیبت کی ہر گھڑی اور جدو جہد کے ہر لمحے میں آسمانوں پر اٹکا ہو۔ جو رات کے عابد اور دن کے مجاہد ثابت ہوں۔ جن کی رقت قلبی اور گریہ و زاری میں ہر لمحہ اللہ کی بے پایاں نصرت کی ضمانت پائی جاتی ہو۔ بہ الفاظ دیگر ایک ایسے طوفان کی تیاری ہے جس

سے دریاؤں کے دل دہلتے ہوں۔ ایک ایسے عظیم لائحہ عمل کی تشکیل کی کوشش ہے جو پوری امت کو پھر سے قائدانہ مقام پر فائز کرسکے۔ ایک ایسی عظیم انقلابی قوت کے ارتکاز کی تیاری ہے جس سے بڑے سے بڑے مضبوط اور جابر حکمرانوں کو پیروں تلے زمین سرکتی محسوس ہو۔

البتہ ان عظیم مقاصد کی باریابی کے لئے لازم ہے کہ دردمندان امت ایک جاں گسل اور صبر آزما جدوجہد کے لئے خود کو پوری طرح آمادہ کرلیں۔ اس راہ میں بڑی سے بڑی پریشانیوں کو خندہ پیشانی سے قبول کریں اور بڑی سے بڑی قربانی کے لئے ہر لمحہ تیار ہوں کہ اتنے بڑے کام کے لئے کم از کم اتنی سپردگی تو لازماً درکار ہوگی۔ پھر جو لوگ اس عظیم کام کو لے کر اٹھے ہوں ان کی قوت کا سرچشمہ ان کے اندرون میں بہتا ہو۔ وہ اپنی روحانی قوت اور خدا سپردگی کے معاملے میں اتنے آگے ہوں کہ دنیا اپنی تمام تر نیرنگیوں کے ساتھ بھی ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو اور وہ اپنے رب سے ملاقات کے لئے ہر لمحہ بیتاب رہتے ہوں۔ پھر اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ مبارک عمل کسی مخصوص طرز کے افراد تک محدود ہونے کے بجائے پوری امت کو اپنے اندر سمولے اور امت کا ہر فرد، خواہ اس کی ایمانی کیفیت کیسی ہی گئی گذری کیوں نہ ہو، اس عمل میں اپنی توفیق بھر ضرور شریک ہو۔ نہ تو یہاں مسالک، مکاتب یا فہم و تدبر کی بنیاد پر کوئی تفریق ہو اور نہ کسی کی ایمانی کیفیت کا فیصلہ کرنے اور اسے درجہ امتیاز عطا کرنے کا کسی کو حق حاصل ہو۔ پوری کوشش اس بات کی ہو کہ اس عمل میں شامل ہو کر انتہائی عاصی اور گنہگار شخص بھی اللہ کے رنگ میں اس طرح ڈوب جائے کہ اس کا ماضی ناقابل یقین بن جائے۔ یعنی امت کے اندر پھر سے ایمان کی ایک ایسی بہار آجائے جو موجودہ مایوسیوں اور محرومیوں کا مداوا کر آرزوؤں کا انبیائی چراغ روشن کرسکے۔ افراد امت کے قلوب میں پھر سے وہ ایمان افروز ہوائیں چلنے لگیں جو قرون اولیٰ میں اس امت کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔

احیائے امت : مرحلہ در مرحلہ

اللہ کا فضل ہے کہ احیائے امت کی جو صدا گذشتہ چند ماہ قبل لگائی گئی تھی وہ رائیگاں نہ گئی۔ آج اس شدید گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں ملک بھر سے آئے ہوئے دردمندان امت کا یہ اجتماع گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو موجودہ پستی سے نجات دلانے، انہیں پھر سے انبیائی مقام پر فائز کرنے اور اس ملک کے کارواں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر میں میں تنہا نہیں ہوں۔ اللہ کا جتنا شکر

ادا کیا جائے کم ہے کہ آج اس نے ہم سبھوں کو اتنے بہت سے معاون و مددگار فراہم کر دیئے ہیں پھر اب کسی منصوبے کے آغاز کے لئے کس بات کا انتظار ہے؟

ملی پارلیامنٹ کے قیام کا بنیادی مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اب تک جو لوگ انفرادی طور پر ملک کے مختلف گوشوں میں اسلامیان ہند کی صورت حال میں کسی بڑی تبدیلی اور اس ملک میں غلبہ اسلام کے لئے سرگرم ہیں، جو نام و نمود سے بے پروا محض اللہ کی رضا کی خاطر شب و روز اس عظیم جدوجہد میں مصروف ہیں، انہیں ان کی پوری فکری، روحانی اور عملی توانائی کے ساتھ اس طرح یکجا کیا جائے کہ یہ سب کچھ مخصوص سطح پر اثر انداز ہونے کے بجائے وسیع اثر انگیزی کے امکانات کا حامل ہو۔ پھر ان دردمندان امت کی جڑیں براہ راست مسلم عوام میں ہوں تاکہ ملی پارلیامنٹ کے مختلف پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں عوام کی ہر طرح کی حمایت اور شمولیت حاصل ہوسکے۔ ایسا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر ملی پارلیامنٹ ہندوستانی مسلمانوں کو من حیث الامت انقلابی مشن کے لئے متحرک کر دینا چاہتی ہے تو اسے ایسے بے لوث خادمین امت بھی درکار ہوں گے جو مسلم عوام میں اپنی للہیت اور بے لوث خدمات کے لئے معتبر گردانے جاتے ہوں۔ جن کی سرگرمیوں کا مقصد رضائے الہیٰ کے حصول کے علاوہ اور کچھ بھی نہ ہو کہ جب تک ملی پارلیامنٹ اپنے اراکین کی اس قدر تطہیر قلبی نہیں کر لیتی اور جب تک حقیقی معنوں میں درویشوں کا ایک ایسا گروہ وجود میں نہیں آجاتا کوئی بڑی عوامی تحریک برپا کرنا ممکن نہیں۔

بعض ذہنوں میں یہ التباس پایا جاتا ہے کہ کسی انقلابی انبیائی لب و لہجے والی تحریک کے لئے یہ ممکن نہیں کہ مسلمانوں کی مدافعت یا ان کی فلاح و بہبود کا کام بھی سنبھال لے۔ اس خیال کے حاملین کے مطابق کسی انبیائی اور دعوتی گروہ کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنی قوم کے لئے کوئی خصوصی پروگرام تشکیل دے یا اس کو دوسری اقوام پر ترجیح دے۔ بعض حلقوں میں ان بظاہر مثالیت پسند خیالات نے ایسے مغالطوں کو جنم دیا ہے جن کی بنا پر ان حضرات کے نزدیک بے عمل عبداللہ اور بے عمل رام بھگت میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ میرے خیال میں ایسا سمجھنا ان بے شمار عبداللہ کے دلوں میں پائے جانے والے سرفروشانہ جذبات کو نظر انداز کر دینا ہے جو ہر لمحے انہیں کسی اسلامی علامت کے تحفظ کے لئے سڑکوں پر نکال لاتا ہے۔ گویا اللہ کی راہ میں اپنی گردنوں کا نذرانہ پیش کر دینے کا مبارک خیال تو ان کے دل کے کسی گوشے میں ضرور پایا جاتا ہے البتہ عام حالات میں نہ تو اس کا اظہار ہو پاتا ہے اور نہ ہی ان کی

معمول کی زندگی میں اسلام چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ ایمان کا فقدان نہیں بلکہ تربیت کی کمی ہے، اس احساس کا فقدان ہے کہ ان کا مسلمان ہونا ان سے بہت کچھ طلب کرتا ہے۔ اب جو لوگ اس ملک میں غلبہ اسلام کی آرزو کے لئے کوئی عظیم الشان عوامی تحریک برپا کرنے کی کوشش کر رہے ہوں وہ بھلا ان قیمتی نفوس کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟ یقیناً اسلام کی تحریک کسی مخصوص قوم کے افراد کے تعاون کی محتاج نہیں ہے اور نہ ہی اسلام میں مسلم قومی تعصب کے لئے کوئی گنجائش موجود ہے لیکن اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ امت کا کوئی بھی فرد کسی بھی زمانے میں جب احیائے دین کے لئے اٹھے گا تو اسے بنیادی معاونین اسی امت سے ملیں گے پھر نبی کے علاوہ کسی شخص کو اس بات حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں کی ایمانی کیفیت یا انقلابی مشن سے ان کی عدم سپردگی کی بنا پر ان حضرات کے ایمان پر شک کی نگاہ بھی ڈالے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات کی عدم شمولیت کی وجہ محض بعض غلط فہمیاں ہوں اور بعض حضرات اس غلط فہمی میں اتنے آگے چلے جائیں کہ انہیں مخالفت کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔ لیکن کسی بھی صورت میں انہیں دشمن اسلام گرداننا تو یقیناً مناسب نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس انقلابیوں کا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ دوسروں کے اعتراضات کی روشنی میں اپنے قلب کی اصلاح و تطہیر کا کام جاری رکھیں اور معترضین کے لئے بارگاہ الٰہی میں خصوصی دعا کا اہتمام کریں، پھر یہ کہ امت کے ہر فرد سے یکساں سپردگی اور قربانی کی توقع کے بجائے ہر شخص سے اس کی توفیق بھر تعاون کو کھلے دل سے قبول کریں۔ کمزور مسلمانوں کے لئے ہر لحہ اس انقلابی مہم میں شرکت کا دروازہ کھلا رکھیں کہ اس مشن میں شمولیت خود ایک ایسا عمل ہے جو ذروں کو ہیروں میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مرکزیت کی تلاش

ایک ہمہ گیر انقلابی تحریک کی ابتدا کے لئے جہاں یہ لازم ہے کہ ملی پارلیامنٹ پوری امت کے لئے ایک مرکز و محور بن کر سامنے آئے اور امت کو کسی صالح اجتماعی قیادت کے وجود میں آجانے کا احساس ہو وہیں اراکین ملی پارلیامنٹ کے لئے بھی لازم ہوگا کہ وہ ان ہی کمزور نفوس میں سے نسبتاً کسی بہتر شخص کی قیادت پر مجتمع ہو جائیں۔ یعنی کسی پیش رفت کے آغاز سے قبل لازم ہے کہ دردمندان امت اپنی صلاحیتوں کے خزانہ کو استعمال کرنے کی اجازت کسی ایسے شخص کو دے دیں جن کے اندر مطلوبہ انقلابی

بصیرت اور جرات پائی جاتی ہو پھر یہ کہ خود سپردگی کا یہ عمل محض اللہ کے لئے ہو۔ نہ تو یہ کسی شخصیت کے سحر کے تابع ہو اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی رورعایت یا مروت کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ صالح قیادت کے قیام کا یہ مبارک کام خالص اسلامی اصولوں پر انجام پائے اس کی بنیاد شورائی ہو نہ کہ جمہوری، تاکہ جمہوری نظام کے اثرات بد مثلاً آپسی منافقت، گروہ بندی، مشن کو ہائی جیک کرنے کا غیر صحت مندانہ رویہ جیسے مسائل سے اس پارلیامنٹ کو محفوظ رکھا جاسکے۔ مثبت اور مفید تنقید کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھا جائے اور کتاب وسنت کی کسی بھی خلاف ورزی کی فورا سرزنش کی جاسکے، البتہ قائد کی بصیرت اور اس کے پروگرام کو منجمد کرنے کے لئے کوئی حربہ کارگر نہ ہو اور نہ ہی مستقبل میں کسی ایسی اسکیم کی حوصلہ افزائی کے امکانات پائے جاتے ہوں۔

ملی پارلیامنٹ کے اندر ایک ایسی مرکزیت وجود میں آجانے کے بعد کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ ملک بھر میں پھیلے ہوئے حامیان پارلیامنٹ مسلم عوام میں اس متحدہ محاذ کو مقبول عام بنانے کی مہم تیز تر کردیں۔ یعنی مسلمانوں کو واقعی محسوس ہو کہ ان کی ملی پارلیامنٹ وجود میں آگئی ہے جو ایک نئے انقلابی لائحہ عمل کے ذریعہ حالات میں حیرت انگیز تبدیلی لانے کے لئے سرگرم ہے اور یہ کہ اس انقلابی مہم میں ان کی شمولیت لازم ہے۔ یاد رکھئے ملی پارلیامنٹ کے دست و بازو مسلم عوام بنیں گے اور اس لئے حامیان اور اراکین پارلیامنٹ پر لازم ہوگا کہ وہ مسلم عوام کے لب و لہجہ میں ان سے کلام کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہوں۔ انہیں ان علامات اور استعاروں کے استعمال کا بھی ملکہ ہو جن سے مسلم عوام کے دلوں کے مضراب بج اٹھتے ہوں کہ کسی انقلابی تحریک کے برپا کرنے والوں کی کامیابی کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے دانشورانہ خیالات کو عوامی نعرہ بنانے میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔ گویا ہم میں سے ہر شخص کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ وہ اپنے اپنے دانشورانہ خول سے نکل کر مسلم عوام کی آرزوؤں کا مرکز بن جائے اور اس طرح حرکت فکر و عمل کا ایک ایسا زبردست غلغلہ بلند ہو جس کے جلو میں پوری امت کے کارواں کو پھر سے اس ابدی انبیائی سرچشمہ سے جوڑا جاسکے جو اسے ایک نئی سربلند زندگی کی ضمانت دیتا ہو، بہ الفاظ دیگر ایک ایسی صورت حال پیدا کی جائے جس میں امت دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرسکے اور انقلابی لب و لہجے والا اسلام ایک بار پھر دنیا میں خوشگوار تبدیلیوں کے ایک لامتناہی سلسلے کا آغاز کردے۔

(خطبہ صدارت: ملی پارلیامنٹ کا پہلا ہمہ گیر اجلاس، ماؤلنکر ہال نئی دہلی ۱۹۹۳ء)

بصیرت اور جرات پائی جاتی ہو پھر یہ کہ خود سپردگی کا یہ عمل محض اللہ کے لئے ہو۔ نہ تو یہ کسی شخصیت کے سحر کے تابع ہو اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی رورعایت یا مروت کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ صالح قیادت کے قیام کا یہ مبارک کام خالص اسلامی اصولوں پر انجام پائے اس کی بنیاد شورائی ہو نہ کہ جمہوری، تاکہ جمہوری نظام کے اثرات بد مثلاً آپسی منافقت، گروہ بندی، مشن کو ہائی جیک کرنے کا غیر صحت مندانہ رویہ جیسے مسائل سے اس پارلیامنٹ کو محفوظ رکھا جاسکے۔ مثبت اور مفید تنقید کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھا جائے اور کتاب وسنت کی کسی بھی خلاف ورزی کی فوراً سرزنش کی جاسکے، البتہ قائد کی بصیرت اور اس کے پروگرام کو منجمد کرنے کے لئے کوئی حربہ کارگر نہ ہو اور نہ ہی مستقبل میں کسی ایسی اسکیم کی حوصلہ افزائی کے امکانات پائے جاتے ہوں۔

ملی پارلیامنٹ کے اندر ایک ایسی مرکزیت وجود میں آجانے کے بعد کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ ملک بھر میں پھیلے ہوئے حامیان پارلیامنٹ مسلم عوام میں اس متحدہ محاذ کو مقبول عام بنانے کی مہم تیز تر کردیں۔ یعنی مسلمانوں کو واقعی محسوس ہو کہ ان کی ملی پارلیامنٹ وجود میں آگئی ہے جو ایک نئے انقلابی لائحہ عمل کے ذریعہ حالات میں حیرت انگیز تبدیلی لانے کے لئے سرگرم ہے اور یہ کہ اس انقلابی مہم میں ان کی شمولیت لازم ہے۔ یاد رکھئے ملی پارلیامنٹ کے دست و بازو مسلم عوام بنیں گے اور اس لئے حامیان اور اراکین پارلیامنٹ پر لازم ہوگا کہ وہ مسلم عوام کے لب و لہجہ میں ان سے کلام کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہوں۔ انہیں ان علامات اور استعاروں کے استعمال کا بھی ملکہ ہو جن سے مسلم عوام کے دلوں کے مضراب بج اٹھتے ہوں کہ کسی انقلابی تحریک کے برپا کرنے والوں کی کامیابی کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے دانشورانہ خیالات کو عوامی نعرہ بنانے میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔ گویا ہم میں سے ہر شخص کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ وہ اپنے اپنے دانشورانہ خول سے نکل کر مسلم عوام کی آرزوؤں کا مرکز بن جائے اور اس طرح حرکت فکر و عمل کا ایک ایسا زبردست غلغلہ بلند ہو جس کے جلو میں پوری امت کے کارواں کو پھر سے اس ابدی انبیائی سرچشمہ سے جوڑا جاسکے جو اسے ایک نئی سربلند زندگی کی ضمانت دیتا ہو، بہ الفاظ دیگر ایک ایسی صورت حال پیدا کی جائے جس میں امت دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرسکے اور انقلابی لب ولہجے والا اسلام ایک بار پھر دنیا میں خوشگوار تبدیلیوں کے ایک لامتناہی سلسلے کا آغاز کردے۔

(خطبہ صدارت، ملی پارلیامنٹ کا پہلا ہمہ گیر اجلاس، ماؤلنکر ہال نئی دہلی ۱۹۹۳ء)

ایک منصفانہ سیاسی متبادل کی تلاش

اس ملک کے مقہور و مجبور مسلمانو! السلام علیکم و رحمتہ اللہ

ہندوستانی مسلمانوں کے اس تاریخ ساز اجلاس میں اپنے آپ کو موجود پاکر میں بے انتہا خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ منقسم ہندوستان کی پچاس سالہ سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب اس مکروہ سیاسی نظام کے ظلم و جبر سے پریشان ہوکر، اس عقوبت گاہ کی پچاس سالہ اذیت ناک زندگی سے تنگ آکر آج ملک بھر سے دردمند اور باحوصلہ مسلمان اس نظام کفر کے انکار کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ پٹنہ کی سرزمین پر منعقد ہونے والا ملی پارلیامنٹ کا یہ سیاسی اجلاس گویا پہلا موقع ہے جب مسلمانان ہند کا پچاس سالہ سیاسی سکوت ٹوٹ رہا ہے۔ یہ خود اتنا بڑا تاریخ ساز قدم ہے کہ اس سے اس ملک میں نئی تبدیلیوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

موسم کی سخت خرابی اور انتہائی شدید سردی میں جو چیز ملک بھر سے ملی پارلیامنٹ کے اس سرمائی اجلاس میں آپ کو یہاں تک کھینچ لائی ہے وہ صرف یہ احساس ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو اس سرزمین پر کسی اور قوم کو حاصل نہیں۔ یہ احساس بھی ہمارے ذہنوں سے محو نہ ہو کہ خدا کے آخری پیغام کی حامل اس سرزمین پر کوئی امت اگر اس وقت ہے تو وہ صرف ہم ہیں۔ اب بھلا ایسی عظیم الشان انقلابی امت کو یہ کب گوارا ہو سکتا ہے کہ وہ اس ملک میں کفار و مشرکین کی دست نگر بن کر رہے۔ یہ صرف ہماری تذلیل نہیں اس رسول کی توہین ہے جس کے ایک اشارہ ابرو پر آج بھی بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں میں سے ایک ایک شخص اپنی گردنوں کا نذرانہ پیش کر سکتا ہے۔ جب رسولؐ سے ہماری محبت کا یہ عالم ہے تو ہمارے لئے یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم آخری رسولؐ کی اس عظیم الشان امت کو کفار و

مشرکین کی تابعداری پر مامور کردیں۔

ملی پارلیامنٹ کا یہ اجلاس گذشتہ پچاس سالہ سیاسی رویے کی نفی کرتا ہے۔ ہم آج اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ شرعی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ زندگی کے کسی بھی گوشے میں کفار و مشرکین کی اتباع قبول کرلیں۔ جو لوگ مسجدوں میں ہماری امامت کے اہل نہیں ہوسکتے انہیں مسجد سے باہر بھی یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ ہماری قیادت سنبھال لیں۔ یہ ایک ایسا مسلمہ شرعی اصول ہے جس کے خلاف بڑے سے بڑا سرکاری عالم بھی کوئی دلیل نہیں لاسکتا اور نہ ہی قرون اولیٰ کی اسلامی تاریخ سے کوئی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔

آیئے آج ہم اس بات کا اقرار کریں کہ ہم اول تا آخر مسلمان ہیں، صرف اور صرف مسلمان۔ ہماری شناخت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت سے عبارت ہے۔ ہم نہ شیعہ ہیں نہ سنی، نہ حنفی ہیں نہ شافعی، نہ بریلوی ہیں نہ دیوبندی، ہم صرف اور صرف مسلمان ہیں۔ ہمارے لئے اگر کوئی کتاب کتاب ہدایت ہے تو وہ صرف خدا کا آخری پیغام قرآن مجید ہے اور ہم اگر اپنے کسی عمل کے لئے کوئی دلیل لاسکتے ہیں تو وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے اور یہ ایمان کی ایک ایسی تعریف ہے جس میں بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام سے اپنی گہری وابستگی اور اس برملا اقرار کے بعد ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم ہر لمحہ خدا کے آخری پیغام کو اس ملک میں عام کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو تازہ کرنے کے لئے سرگرم رہیں۔ ہمیں کوئی رکاوٹ یا کوئی دنیاوی قوت اس راہ سے ذرہ برابر نہ موڑے۔ جابر حکومتیں اور حکمراں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری وفاداری پر روک نہ لگاسکیں۔ دنیا کچھ بھی کہتی ہو ہم اپنے رسول کی محبت میں اس طرح سرشار ہوں کہ ہمیں ان کے برا بھلا کہنے کی کچھ بھی پروا نہ ہو۔ کفار و مشرکین تالیاں پیٹتے ہوں یا ان کے نامزد کردہ ایجنٹ ہمارا مذاق اڑاتے ہوں، کافرانہ نظام ہمارے اوپر جیلوں کے دروازے کھولتا ہو یا ہمارے حصے میں عقوبت گاہوں کے تاریک کمرے آتے ہوں۔ یہاں تک کہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے وفاداری ہمارے لئے پھانسی کے پھندوں تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہو۔ اپنے رسول کی محبت میں ہمیں یہ سب خوشی خوشی قبول کرلینا چاہئے کہ

کل جب حشر کا میدان سجا ہوگا اور آج کے رتبے والے کفار و مشرکین اس کے حضور شرمندہ ہوں گے، ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی تو آپ اپنے رب کے حضور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے صلے پھانسی کے پھندوں تک پہنچنے کا عمل پیش کر سکیں اور آپ کے نوجوان یہ بتا سکیں کہ ان کی ہڈیاں صرف اس لئے توڑی گئی تھیں کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی وابستگی کا دم بھرتے تھے۔ آپ کی بہنیں خدا کے حضور اپنی آبرو ریزی کا مقدمہ پیش کرتے ہوئے یہ بتا سکیں کہ ہمیں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے کے جرم میں کفار و مشرکین کی ہوسناکیوں کا نشانہ بننا پڑا اور تختہ دار تک پہنچنے والے آپ کے باحوصلہ افراد خدا اور اس کے رسولؐ کے حضور اپنا یہ مقدمہ پیش کر سکیں کہ آخری رسولؐ کی امت کو کفار و مشرکین کی سیاسی غلامی سے نجات دلانے کی کوششوں سے ان کا یہ حال ہوا ہے۔

برادران اسلام اور دختران ملت! گذشتہ پچاس برسوں میں اذیت کی کون سی قسم ہے جو آپ کے حصے میں نہیں آئی ہے۔ سرکاری عقوبت گاہوں کے دروازے آپ پر آج بھی کھلے ہیں اور اس ملک میں مسلم خواتین کی اجتماعی آبرو ریزی بھی بار بار دہرایا جانے والا عمل ہے، پھر مسلم کش فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو کسی بھی وقت ملک کے کسی بھی حصے میں مسلمانوں کی زندگی کا چراغ گل کر سکتا ہے۔ عقوبت گاہوں کے دروازے تو آپ پر آج بھی کھلے ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ آپ کی یہ ساری قربانی رسولؐ کی محبت سے خالی ہے۔ آنے والا ہر دن آپ سے مزید قربانیوں کا مطالبہ تو ضرور کرتا ہے لیکن اس کی قیمت پر کسی نئی صبح کے طلوع کی امید نہیں بندھتی۔ سیاسی غلامی کے سائے مزید گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ کفار و مشرکین کے لئے آپ کا شکار آسان تر ہوتا جاتا ہے پھر یہ بزدلانہ رویہ ایک شرمناک عمل ہے جس کے لئے خدا کے حضور آپ کوئی معقول دلیل بھی نہیں لاسکتے، کہ خدا کی کتاب اس سنگین صورت حال میں بھی جو رہنمائی فراہم کرتی ہے اور عمل کے لئے جو راستے متعین کرتی ہے اس سے آپ نے آنکھیں پھیر رکھی ہیں۔ افسوس کہ بیشتر سیاسی مسلمانوں اور ناسمجھ قائدین کے لئے آج خدا کی یہ کتاب کتاب ہدایت نہیں ہے۔ وہ برملا اس بات کا اظہار کرتے نہیں تھکتے کہ اس ملک کی بین الملی ثقافت کے پیش نظر سیکولرزم ہی اس ملک کے لئے مناسب نظام حیات ہے۔ گویا یہ کہہ کر وہ صاف صاف خدا کی کتاب کے خلاف جنگ کا اعلان کرتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان دنیا کے کسی بھی خطے اور تاریخ کے کسی بھی لمحے میں قرآن کے علاوہ کسی اور نظریے کو نظام حیات کے طور پر مستند گردانتا ہے تو گویا وہ کھلے الفاظ میں اپنے ایمان کا انکار

کرتا ہے۔ ہم میں سے بہتوں سے گذشتہ پچاس سالوں سے یہ غلطی ہوتی رہی ہے کہ ہم کبھی شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن کو اس ملک میں ایک قابل عمل نظام حیات کے طور پر تسلیم کرنے، اس کا ببانگ دہل اعلان کرنے اور اس نظام حیات کے نفاذ کے قیام کی کوشش سے کتراتے رہے ہیں۔

تاریخ کے اس نازک موڑ پر جب سیکولر ڈیموکریسی کے تازیانوں سے ہمارا ملی وجود چھلنی چھلنی ہو چکا ہے، جب ہم میں سے ہر شخص پر یہ حقیقت عیاں ہو چکی ہے کہ سیکولر ڈیموکریسی کی حقیقت ایک دستوری فراڈ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، جب ہمارے کور چشم سیاسی قائدین نے بھی سیکولر ڈیموکریسی کے سائے تلے بابری مسجد کے گنبد منہدم ہوتے دیکھ لئے ہیں، جب ہمارے روشن خیال مسلمانوں پر بھی سیکولرزم کا مطلب مسلم کش فسادات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے اور جب ہماری مغرب زدہ بہنوں پر بھی سیکولر نظام کی برکتیں اجتماعی آبروریزی کی شکل میں ظاہر ہو چکی ہیں اور جب امت کے ہر چھوٹے بڑے پر اس نظام کا مکروہ منافقانہ چہرہ بے نقاب ہو چکا ہے، ایک ایسے لمحے میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم غیض و غضب میں اس نظام پر تبرا کرنے یا اس کے خلاف زبانی احتجاج کرنے کے بجائے اجتماعی طور پر اس کافرانہ نظام کا انکار کریں اور ایک نئے منصفانہ نظام کے قیام کے لئے اپنی جدوجہد تیز تر کردیں۔

ملی پارلیامنٹ کا یہ اجلاس دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جہاں ملک بھر سے آئے ہوئے پریشان حال مسلمان اس کافرانہ نظام کے قہر و جبر سے نکلنے کے لئے ایک عملی راستے کی تلاش کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ ملک بھر سے آئی ہوئی سعید روحوں کے ان قافلوں کو دیکھ کر ہمت بندھتی ہے کہ نظام جبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور اس نظام کفر کو چیلنج کرنے کے عمل میں میں تنہا نہیں ہوں۔ اس بات سے بھی حوصلہ ملتا ہے کہ سیاسی غلامی کی اس زندگی سے نجات پانا آج بے شمار بے چین دلوں کا اولین ہدف بن چکا ہے۔

ہم میں سے بہتوں کو شاید اس حقیقت کا احساس نہ ہو لیکن کل کا مؤرخ لکھے گا کہ پٹنہ کی سرزمین پر منعقد ہونے والے ملی پارلیامنٹ کے اس اجلاس سے جو صدا اٹھی تھی اس نے مستحکم نظام کفر کی طناب لپیٹنے کی ابتدا کر دی تھی۔ اس وقت اس لمحے اس سرزمین پر آپ محض لٹے پٹے، پریشان حال، تہی دست اور مضطرب مسلمانوں کے ایک اجتماع میں نہیں بیٹھے ہیں بلکہ عین اس لمحے آپ ایک ایسی تاریخ بنانے کے عمل میں حصہ لے رہے ہیں جو آنے والے دنوں میں اس ملک کے تاریک سیاسی افق پر

ایک روشن صبح کی شکل میں طلوع ہوگا۔ عین اس لمحے تاریخ کروٹ لے رہی ہے۔ پچاس سالہ سیاسی غلامی کے خلاف علم بلند ہوچکا ہے اور امت کے مٹھی بھر دردمندوں نے اپنا سب کچھ دے کر اس ملک میں ایک نئی صبح کے قیام کے لئے ہر ناممکن کو ممکن بنانے کا عزم کرلیا ہے۔ یہ محض ہماری خوش قسمتی ہے کہ تاریخ کے ایک ایسے مبارک لمحے میں ہم آج اس مبارک اجتماع میں موجود ہیں۔ آئیے اس مبارک لمحے کو اپنے رب کی حمد وثنا اور رسول پر صلوۃ و سلام سے بھر دیں۔

برادران گرامی اور دختران ملت! تاریخ کے اس فیصلہ کن موڑ پر لازم ہے کہ ہم پھر سے اپنے وہ خواب ترتیب دیں جو گذشتہ پچاس سالہ نظام جبر میں پارہ پارہ ہوچکا ہے۔ آج ہم ایک بار پھر اپنے رسول کے اس آخری خطبے کو اپنے ذہن میں تازہ کریں اور اس ذمہ داری کو یاد کریں جو ایک منصفانہ نظام کے قیام کے سلسلے میں ہمارے محبوب رسولؐ نے ہم پر ڈالی تھی اور تب ہم نے یہ عہد کیا تھا کہ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے جانے کے بعد ہم رسول کے ورثے یعنی اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے رہیں گے تب ہم نے اپنے محبوب رسولؐ سے یہ عہد بھی کیا تھا کہ ہم اس کے پیغام کو پوری دنیا میں پہنچادیں گے۔ لیکن ابھی صرف چودہ صدیاں گزری ہیں ابھی یہ سب کچھ بالکل تازہ تازہ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ جبل رحمت کی چوٹیاں اور فاران کی وادی ہم سے پوچھتی ہیں کہ ہمارے وہ عہد و پیماں کیا ہوئے؟ اپنے رسول سے کئے گئے وعدے کا حق ہم نے کہاں تک ادا کیا؟ توقع تو یہ تھی کہ ہم پوری دنیا کو آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نعرہ انقلاب سے بھر دیں گے، ہم دنیا کے گوشے گوشے میں نظام انصاف کا قیام ممکن بنائیں گے۔ لیکن افسوس کہ عالمی انقلاب کا نعرہ بلند کرنے والے، قاہر حکومتوں کو اپنی ٹھوکروں سے الٹ پھینکنے والے آج اس وطن عزیز میں کفار و مشرکین کی سیاسی اتباع پر مجبور ہیں، کتنی عجیب ہے یہ صورت حال۔

صفا کا میدان اور رحمت کی پہاڑی تو آج بھی موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ آج بھی فضا میں گونج رہا ہے۔ لیکن نہ جانے کہاں گئے وہ نفوس جو اس پیغام کو لے کر پوری دنیا میں کچھ اس شان سے نکلے تھے کہ ان مٹھی بھر نفوس پر بڑے بڑے جابروں کے لئے بھی روک لگانا ممکن نہ تھا اور اسی قافلے کے ایک معمولی نوجوان محمد بن قاسم نے جب ہندوستان کی طرف رخ کیا تو وقت کے بڑے بڑے جابروں نے اپنے سر اس کے قدموں میں ڈال دئے۔ تب وہ ایک تنہا نوجوان تھا اور اس کے

ساتھ مٹھی بھر اہل ایمان کا ایک چھوٹا سا جتھا، ایک ایسا نوجوان جس کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ دنیا کے حالات سے بہت زیادہ باخبر بھی نہ تھا اور نہ ہی اس کے پاس سیاسی الٹ پھیر کا کوئی تجربہ تھا لیکن آج اسی نوجوان سے اپنا ملی تعلق بتانے والی بیس کروڑ کی امت مسلمہ نے اس ملک میں کفار و مشرکین کی تابعداری قبول کر لی ہے۔

آج جب اس ملک میں پچاس سالہ سیاسی سکوت ٹوٹ رہا ہے، جب اللہ کی رحمت کے طفیل ہم پر غور و فکر کے نئے دروازے کھل چکے ہیں اور جب ہمیں یہ توفیق حاصل ہوئی ہے کہ ہم اپنی گردنوں سے کفر کی سیاسی اتباع کا قلادہ نکال پھینکیں تو ہم پر لازم ہے کہ نصرت کی ایک ایسی گھڑی میں ان تمام خوابوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیں جس کا تعلق اس خواب سے نہ ہو جو رسول کے ذریعہ ہم تک منتقل ہوا ہے۔ ہم صرف اور صرف اس خواب کے اسیر ہوں جس کے قیام کی ذمہ داری ہم پر ڈالی گئی ہے۔ آج ہندوستانی مسلمانوں کے اس نمائندہ اجتماع میں میں اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ قرآنی نظام انصاف کے علاوہ دنیا میں جتنے بھی نظام حیات پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب باطل ہیں۔ بیس کروڑ ہندوستانی مسلمان قرآن کے علاوہ نظام حیات کے ہر تصور کو کالعدم قرار دیتے ہیں اور بلاخوف و خطر اس آرزو کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کا اولین مقصد اس ملک میں ایک ایسے نظام کا برپا کرنا ہے جو خدا کی کتاب اور رسولؐ کی سنت کی اتباع پر قائم کیا گیا ہو۔ آج کا یہ دن تجدید ایمان کا دن ہے۔ آج ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ جو وقت غفلت میں گزرا سو گزرا، اب ہم رسولؐ کی محبت کو ایک لمحے کے لئے بھی اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیں یہ ہرگز گوارا نہیں کہ ہم رسولؐ کی قیادت کے علاوہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر کسی اور کی قیادت قبول کر لیں۔ ہم اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم پر جس نظام کے قیام کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے وہ قرآن کا نظام انصاف ہے۔ ایک ایسا نظام انصاف جس میں ہر شخص کو یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔ رنگ و نسل، برادری یا جنس کی بنیاد پر نہ کسی کو برتر قرار دیا جائے گا اور نہ کمتر۔ یہی ہمارا منشور ہے اور اسی عمل میں ہم اپنی دنیا و آخرت کی کامیابی سمجھتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو مسلمانوں کا سا نام رکھ کر کسی غیر اسلامی نظام کے غلبے کے لئے کوشاں ہیں یا جو موجودہ سیکولر ڈیموکریسی کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں یا جو مسلمانوں کی جدوجہد سے کفار و مشرکین کو اس ملک کا اقتدار سونپنے کے لئے شب و روز متحرک ہیں تو یہ سب کے سب صریح شرک میں مبتلا ہیں۔

یہ بات بھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہے کہ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑی مسلم آبادی کا ملک ہے۔ یہ بیس کروڑ اہل ایمان کا مسکن ہے۔ اتنی بڑی عددی قوت کو اقلیت قرار دینا ایک کھلی سازش ہے۔ اقلیت واکثریت کی اصطلاحیں دراصل نظام کفر کی اصطلاحیں ہیں جو اہل ایمان کو ان کی اصل قوت کے ادراک سے روکتی ہیں۔ ہمیں ان غیر قرآنی اصطلاحوں سے احتراز کرنا چاہئے۔ شریعت کی رو سے انسانوں کے گروہ کو صرف دو خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ملت کفر اور ملت ایمان، ایک کو دوسرے سے ازلی بیر ہے اور دونوں کا ایک ہی معاشرے میں گھل مل کر رہنے کا خیال بھی لایعنی ہے۔ ہم اس تاریخی حقیقت سے بھی انکار نہیں کرسکتے کہ اس ملک کو کوئی ہزار سال تک دارالاسلام کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تاریخی اعتبار سے ہندوستان کا شمار مسلم دنیا کے ایک اہم ملکوں میں ہوتا رہا ہے۔ یہ بہت پرانی بات نہیں جب تاریخ کے بعض حوادث کے نتیجے میں شوکت اسلام کی نمائندہ عظیم الشان سرزمین پر اہل ایمان کی سیاسی قیادت کا چراغ گل ہوگیا۔ قوموں کی تاریخ میں ایسے حوادث تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ زندہ قومیں پسپائی کو بھی فتح میں بدل ڈالنے کا ہنر جانتی ہیں۔ پھر آخر کیا بات ہے کہ نظام کفر کی صرف پچاس سالہ حکمرانی نے آپ کے کس بل نکال دیئے ہیں۔ آپ کے دلوں میں اب یہ خیال بھی مشکل سے ہی آتا ہے کہ آپ اس عظیم سرزمین کو مومن سیاسی قیادت دینے کے لئے پھر سے اپنی تلواریں نیام سے نکال لیں۔ اپنے ہی ملک میں آپ اغیار سے سہولتوں کے طالب ہیں۔ کوئی آپ کو پانچ سو کروڑ روپیوں کی تھیلی دکھاتا ہے تو کوئی آپ کی جھوٹی حمایت میں ریزرویشن کا مطالبہ لاتا ہے۔ کبھی آپ کو اردو یونیورسٹی کے کھلونوں سے بہلایا جاتا ہے تو کبھی آپ کی تعلیمی اور معاشی حالت کی درستگی کے لئے اعلانات کئے جاتے ہیں۔ گذشتہ پچاس سالوں سے آپ ان وعدوں کے تقریباً عادی سے ہوگئے ہیں۔ آپ کے دل میں یہ خیال بھی کم ہی آتا ہے کہ جس ملک کے وسائل سے مراعات دینے کا اعلان کیا جاتا ہے وہ دراصل وہی ملک ہے جہاں کوئی ایک ہزار سال تک آپ وسائل تقسیم کرتے رہے ہیں۔ اپنی اس تاریخی حیثیت کو آپ کیسے فراموش کرسکتے ہیں۔

اس ملک کی تباہ حالی، وسائل کا اتلاف، معاشی ناہمواریاں، سماجی بے چینی اور ملک میں ہر لمحہ جاری خانہ جنگی کی سی کیفیت آپ سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ایک بار پھر اس سرزمین کو آپ کی قیادت کی ضرورت ہے۔ جو لوگ الٰہی احکامات کے باغی ہوں، جن کی نگاہیں صرف اس مادی زندگی کی دوڑ دھوپ تک محدود ہوں ان کی قیادت میں اس ملک کے کارواں کو دے دینا نہ تو اس ملک کے ساتھ انصاف

ہے اور نہ ہی اس ملک کے کروڑوں دبے کچلے انسانوں کے ساتھ۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب ملک کے وسائل میں نقب لگانے کی خبریں اخبارات کی زینت نہ بنتی ہوں۔ ملکی سطح پر آئے دن بڑے بڑے گھپلوں سے پردہ اٹھتا رہتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرے گھپلے کے انکشاف کا سلسلہ جاری ہے۔ ہم نے اخلاقی طور پر اس صورت حال کو قبول کر رکھا ہے۔ سیاسی دنیا اخلاقی زوال کی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ بڑا مجرم بڑے عہدے پر فائز ہے۔ لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ چہار سو جاری ہے۔ نہ تو کسی کو اس ملک کے مستقبل کی فکر ہے اور نہ ہی کسی کے دل میں اس ملک کی حقیقی ترقی کا درد ہے۔ وطن عزیز کے وسائل لٹیروں کے ہاتھ لگ گئے ہیں اور ہم اس سنگین صورت حال کو کچھ اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے اس ملک سے ہمارا کوئی تعلق ہی نہ ہو گویا کسی اور کا گھر لٹ رہا ہو۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس لوٹ کی ہر ضرب براہ راست ملک کے ہر باشندے پر پڑتی ہے۔

دوسری طرف داخلی امور کی پالیسی انتہائی مبہم ہے۔ ہمارے پالیسی ساز اس شعور سے قطعی نابلد ہیں کہ وہ اس ملک کو آخر کدھر لے جانا چاہتے ہیں؟ کبھی ملک کے ایک حصے پر فوج کشی کا حکم صادر کیا جاتا ہے تو کبھی دوسرے حصے پر اپنے ہی شہریوں کو لگام دینے کے لئے فوجیں اتار دی جاتی ہیں۔ گذشتہ چار سالوں سے کشمیر میں جنگجوؤں سے نمٹنے کے نام پر بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی جاری ہے۔ ملکی وسائل کو انتہائی بے دردی کے ساتھ اس خطے میں ضائع کیا جارہا ہے۔ کبھی سری لنکا میں مہم جوئی کی جاتی ہے تو کبھی گلیشیر پر لایعنی جنگ کے لئے وسائل داؤ پر لگادئے جاتے ہیں، اس بے مقصد پالیسی پر روک لگانے والا کوئی نہیں۔ اس ملک کے باشندوں کی ایک بہت بڑی تعداد دانے دانے کو ترستی ہے، بچے تعلیم سے محروم ہیں، صحت کی دیکھ ریکھ کے لئے کوئی معقول انتظام نہیں۔ نہ جانے کتنے نونہالوں کے دلوں میں پلنے والے مستقبل کے خواب ہر لمحے ٹوٹتے بکھرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان ضروری اور بنیادی مسائل سے توجہ ہٹاکر ملک کے وسائل کا ایک بڑا حصہ اسلحوں کی تیاری اور نیوکلیائی مادوں کے حصول میں ضائع کیا جارہا ہے۔ ملک کے وسائل کو آخر کب تک ہم یوں تباہ ہوتا ہوا دیکھتے رہیں گے۔ اس ملک کے بیس کروڑ اہل ایمان پر لازم ہے کہ وہ اس وطن عزیز کو ایک صالح قیادت دینے کے لئے اپنی تیاری تیز تر کردیں۔

ہماری ان باتوں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف منظم کرنا چاہتا ہوں۔ نہیں! ہرگز نہیں! ہم کسی بھی قوم کے مخالف نہیں، ہم تو دراصل اس

نظام کے خلاف ہیں جس میں کیا ہندو کیا مسلمان، کیا عیسائی اور کیا غیر قومیں سب کے سب اس نظام کفر کی قہر سامانیوں سے پریشان ہیں۔ ہم تو مسلمانوں کو صرف ان کا یہ بھولا ہوا سبق یاد دلانے اٹھے ہیں کہ خدا کے آخری رسولؐ کی امت کی حیثیت سے ان کا کام ہے کہ وہ اس ملک کے دبے کچلے عوام کو نظام کفر کے جابر پنجوں سے چھٹکارا دلائیں۔ ہم ان شاطر حکمرانوں کے خلاف ہیں جنھوں نے ایک شیطانی نظام کی ترتیب کے ذریعہ ملک کے پچاسی فیصد عوام کو اس ملک کے پچاسی فیصد وسائل سے محروم کر رکھا ہے۔ پندرہ فیصد لوگ پچاسی فیصد وسائل پر قابض ہیں۔ وسائل کی سرمستی کبھی انہیں راکٹ سازی پر اکساتی ہے تو کبھی ان کا یہ شوق نیوکلیائی دھماکوں کی شکل لیتا ہے۔ ہم اس صورت حال کو بدل ڈالنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک منصفانہ سیاسی نظام کے قیام کے لئے آج ہم سر جوڑ کر بیٹھے ہیں۔ اس عمل میں مسلمانوں کے علاوہ اگر ہمارا کوئی مددگار بننا چاہتا ہے تو شوق سے بنے، ہمیں اس کا تعاون قبول ہے۔ البتہ یہ بات واضح رہے کہ سماجی انصاف کی کسی جنگ میں ہم ان کے شریک کار نہیں بن سکتے اس لئے کہ وہ ایک نظام جبر کو ہٹا کر اپنی پسند کا دوسرا نظام جبر قائم کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے لئے ہرگز ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ ہم اس صورت حال کو قبول نہیں کر سکتے کہ امت مسلمہ کو برہمنوں کی سیاسی اتباع سے نکال کر نیچی ذات کے کفار و مشرکین کی اتباع میں دے دیا جائے۔ ہمارے لئے دونوں صورت حال یکساں ناقابل قبول ہے۔ ہم دونوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔

برادران گرامی اور دختران ملت! آئیے آج ہم اس بات کا مصمم ارادہ کریں کہ بیس کروڑ ہندوستانی مسلمان اب اس ملک کو خاموش تماشائیوں کی طرح لٹتا ہوا نہیں دیکھیں گے۔ خدا کے باغیوں کو اب اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ خدا کی اس سرزمین پر لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رکھیں۔ اب اس ملک میں کمزوروں کو ستانے کا رواج ختم ہوگا۔ مظلوم کی آہ رائیگاں نہیں جائے گی۔ ہر کمزور کو سہارا ملے گا اور ہر ظالم کے ہاتھ سے قوت سلب کر لی جائے گی۔ مٹھی بھر یہ اہل ایمان تہی دست سہی لیکن اگر انہیں اپنے رب کی ذات پر بھروسہ ہے تو یہ ایک ناقابل تسخیر قوت میں تبدیل ہوسکتے ہیں اور اللہ کا وعدہ ہے کہ اگر اہل ایمان اپنی بات پر جم گئے تو وہ مدد کے لئے آسمانوں سے فرشتے نازل کرے گا۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ آپ فرشتوں کی رفاقت سے منہ موڑ کر اہل کفر کی حاشیہ نشینی کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بات بھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہے کہ اس ملک کے جابر حکمراں وسائل سے کتنے ہی مالامال کیوں نہ ہوں کفر و

شرک کی روش نے انہیں اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا ہے۔ انہیں خوب احساس ہے کہ سیکولر ڈیموکریسی اور انسانی آزادی جیسے خوشنما الفاظ اب ان کی زبان کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ اپنے مکر و فریب کو چھپانے کے لئے خواہ کتنے ہی پر اثر الفاظ کا سہارا کیوں نہ لیں انہیں ہر جھوٹ کے بعد جھوٹ کے افشاء ہو جانے کا احساس ہوتا ہے اور ایسی صورت میں اگر کسی گوشے سے احتجاج کی کوئی کمزور آواز بھی اٹھتی ہے تو انہیں اس پر صدائے جرس کا گمان ہوتا ہے۔ بھلا جو لوگ زبردست روحانی خلفشار اور اخلاقی بحران کے شکار ہوں، بت پرستی جن کی گھٹی میں پڑی ہو، جو ہر قوت کے آگے سر ٹیکنے کے عادی ہوں ان پر قابو پانا کوئی ایسا عمل نہیں جس کے لئے کسی بڑی مہم جوئی کی ضرورت ہو۔

البتہ انقلابی عمل کے کسی بھی مرحلے میں ہمیں انتہائی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہوگی تاکہ کم سے کم قوت کے صرفے پر زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کئے جا سکیں۔ انقلابی عمل محض کود پڑنے، فلک شگاف نعرے بلند کرنے یا جان و مال کی قربانی کا نام نہیں بلکہ ان عوامل کو کمال احتیاط سے برتنے کا نام ہے۔ پھر اس کے لئے وہ اطمینان قلب اور آمادگی بھی ضروری ہے جو اس مشن کے حاملین کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔ آپ کی نگاہیں دشمنوں کی توپ و تفنگ یا ٹینکوں اور راکٹوں سے مرعوب ہونے کے بجائے ان آسمانوں کی طرف اٹھتی ہوں جہاں سے فرشتوں کے اتارنے کا وعدہ ہے اور آپ کو خدا کے اس وعدے پر اس درجہ کا ایقان حاصل ہو کہ آپ کو ہر لمحے الٰہی مشن میں ان کی سرگرم رفاقت کا احساس ہوتا ہو۔ قلب و نظر کی اس آمادگی کے بعد دنیا کی کوئی قوت ایسی نہیں جس کی تسخیر ممکن نہ ہو۔ یاد رکھئے اللہ کی دنیا میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس کا حل موجود نہ ہو۔ ایسی کوئی مصیبت نہیں جسے ٹالنا ممکن نہ ہو، ایسا کوئی عذاب نہیں جس سے نجات کی سبیل نہ بتائی گئی ہو۔ پھر بھلا ہندوستانی مسلمانوں پر پچھلے پچاس سالوں سے جاری مصنوعی عذاب کا حل کیونکر نہیں ہو سکتا۔

آپ نے لہراتے بل کھاتے پانی کی موجوں میں بھنور کا منظر دیکھا ہوگا۔ جہاں کہیں بھی زیر زمین کوئی خلا پیدا ہوا سطح آب کو برقرار رکھنے کے لئے پانی کی فوری ضرورت ہوئی، لہروں نے اپنا راستہ تبدیل کر بھنور کے مقام پر اپنا اجتماع پیش کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح انسانی معاشرے میں بھی بحران کے عین لمحے میں اللہ تعالیٰ ایسے افراد پیدا کر دیتا ہے جو انسانی سوسائٹی کو پیش آجانے والے بھنور میں انتہائی برق رفتاری کے ساتھ اپنی خدمات پیش کر سکیں۔ فی زمانہ امت مسلمہ میں ایسے دردمندوں اور اعلیٰ صلاحیت

کے حامل مخلصین کی کمی نہیں البتہ ہم میں سے ہر کوئی ایک ایسے بھنور سے خائف ہے۔ ہمارے اندر تاریخ کی کشتی کو ایک ایسے بھنور سے دوچار کرنے کی ہمت نہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید کسی ایسی صورت حال کے مقابلے کے لئے امت مسلمہ ابھی تیار نہیں اور شاید اسی لئے کسی انقلابی اقدام کے خوف سے ہم کانپ جاتے ہیں حالانکہ فطرت کا یہ اصول ہے کہ بھنور پانی کے اچانک ازدہام کا سامان خود ہی کر لیتا ہے۔ ضرورت ہے کہ کسی انقلابی اقدام سے خوف کھانے کے بجائے صرف اور صرف اللہ کی نصرت کے سہارے اس ملک میں ایک انقلابی عمل کی بنیاد رکھ دی جائے۔

ہماری انقلابی دعوت پر امت کے بعض مخلص بڑے بڑھوں نے انتہائی محتاط رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایک طرف ہمارے احساسات سے اتفاق کا اظہار کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ابھی ملک میں کسی ایسی تبدیلی کے لئے فضا سازگار نہیں ہے۔ بعض لوگ نظام کفر کے انکار میں دل سے ہمارے ساتھ ہیں البتہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی زبان سے اس انکار کا وقت نہیں آیا ہے۔ بعض مخلصین نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ نئی صبح کے آرزومند ابھی تھوڑے ہیں اور اس لئے اس کام کو مناسب وقت کے لئے ملتوی کر دینا چاہئے لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کفر کے ساکت سمندر میں جب تک پتھر نہیں پھینکا جاتا لہروں کا ارتعاش عمل میں نہیں آتا۔ دیر یا سویر ٹھہرے پانی میں انقلاب کا پہلا پتھر تو ہمیں ہی پھینکنا ہے۔ رہی بات کسی مناسب وقت کے لئے اس کام کو اٹھا رکھنے کی تو واقعہ یہ ہے کہ ہم نے بہت انتظار کیا۔ ہم نے ان ناصحانہ مشوروں کے طفیل کوئی نصف صدی گنوا دی، جو لوگ مزید انتظار کا مشورہ دیتے ہیں وہ دراصل اس امت کو درپیش سنگین صورت حال سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ ایک ایسی صورت حال میں جب مسلح حملہ آوروں نے چہار طرف سے ہلہ بول رکھا ہو، خون کے پیاسے باوردی درندے آپ کے گھر میں گھس آئے ہوں، جب کرفیو کی مہیب سرد راتوں میں تلاشی کے نام پر باوردی درندوں کے ہاتھ آپ کی مستورات کے دامن تک پہنچ گئے ہوں، جب اسلحہ رکھنے کے الزام میں پکڑا جانے والا آپ کا لخت جگر سرکاری عقوبت گاہ میں سخت تعذیب کا شکار ہو، جب فاشسٹ گروہوں کے نرغے میں آکر آپ کا چھوٹا سا گھر تباہ ہو چکا ہو اور اس پر طرہ یہ کہ کبھی نہ ختم ہونے والے جھوٹے مقدمات سے آپ کا اجڑا اجڑا مستقبل الجھا دیا گیا ہو، جب زندگی کا ہر لطف اور جینے کا ہر مزہ آپ کو بدمزہ لگتا ہو، جب آپ کا معصوم بیٹا مسائل کے بوجھ سے تنگ آکر پوچھتا ہو کہ آخر آپ روز روز کی اذیت کے خاتمے کے لئے

سڑکیوں پر کیوں نہیں نکلتے اور جب آپ کو پس و پیش میں مبتلا پاکر وہ خود کسی انتہائی اقدام کے منصوبے بنانے لگتا ہو، تب آپ سمجھتے ہیں کہ اب سکوت اور انتظار کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی جبر بھری تاریخ کا یہی وہ مرحلہ ہے جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ ہم لاکھ چاہیں اب اس انقلابی منصوبے کو مزید ٹالے رکھنا ممکن نہیں۔ کر گزرنے کا یہ لمحہ اب ہمارے دروں پر دستک دے رہا ہے۔

جو لوگ انقلاب کی تاریخ سے واقف ہیں وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کریں گے کہ انقلابی عمل کی ابتدا کے لئے وقت آتا نہیں بلکہ لایا جاتا ہے۔ اگر آپ انقلابی عمل کی ابتدا ہی نہیں کرتے، اگر آپ کے دلوں سے نئی صبح کے قیام کا داعیہ جاتا رہے، اگر آپ ایک جبری نظام میں زندگی جینے کو معمول کی زندگی سمجھنے لگیں تو انقلابی اقدام کے آغاز کا لمحہ کبھی نہیں آسکتا۔ ضرورت ہے کہ مناسب وقت کا انتظار کرنے یا انتظار میں وقت گنوانے کے بجائے ایک لمحے کے توقف کے بغیر اس ملک میں اللہ کی کبریائی کا کلمہ بلند کر دیا جائے۔ جب باطل کے پرستار ہر لمحہ حرکت میں مصروف ہوں انہیں صحیح وقت کے انتظار کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ہو تو ہم نظام حق کے قیام میں توقف کا رویہ کیوں اختیار کریں۔ انتظار کی نصیحت کرنے والے دراصل بظاہر اس مخلصانہ مشورے کے ذریعے اپنی بزدلی کو چھپانا چاہتے ہیں۔ یاد رکھئے! ایمان اور بزدلی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ ملی پارلیامنٹ کے اس انقلابی مشن کو ایک قبل از وقت اقدام بتانے کے بجائے ضرورت ہے کہ آپ اپنی ایمانی حالت کی درستگی کی فکر کریں اور بار بار اپنا احتساب کرتے ہوئے یہ دیکھیں کہ کہیں آپ کے دلوں میں خدائے واحد کے خوف کے علاوہ ان کفار و مشرکین کے ظاہری دبدبے نے تو جگہ نہیں لے لی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ اس ملک میں اسلامی علوم کے ادارے، معروف دینی درسگاہیں، چھوٹے بڑے مدارس، اہل دل کی خانقاہیں اور علماء و مشائخ کے حلقوں سے اللہ کی کبریائی کے اس اعلان کو پر جوش تعاون ملے گا۔ مجھے امید ہے کہ بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف سطح کی مذہبی اور روحانی قیادت اس ملک میں ایک نئی صبح کے قیام کے لئے کسی بھی ممکنہ قربانی سے دریغ نہیں کرے گی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا جب بھی میں ایک قدم پیچھے نہ ہٹوں گا۔ نتائج کی پرواہ کئے بغیر میری کوشش جاری رہے گی۔ مجھے بھروسہ ہے کہ میرا رب مجھے ضائع نہیں ہونے دے گا۔

میں ایک طویل غور و فکر اور ذاتی تجربے کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس ملک میں ایک نئی صبح کے قیام کو موخر کرنے میں معروف اسلام دشمن طاقتوں کے مقابلے میں سیکولر جادوگر، مسلم

دوست سیاسی تنظیمیں اور سیاسی قسم کے مسلمان زیادہ فعال کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کے نام نہاد ہمدرد ہوں، سیکولر بازیگر ہوں، سیاسی جماعتیں ہوں یا ان جماعتوں میں متحرک نظر آنے والے سیاسی مسلمان ہوں، یہ سب کے سب موجودہ نظام جبر کو برقرار رکھنے میں ہی اپنی خیر سمجھتے ہیں۔ یہ کچھ دے دلاکر مسلمانوں کو اپنی اصل قوت کے ادراک سے روکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک قسم ان درباری علمائے کرام کی ہے جنہوں نے قال اللہ اور قال الرسول کے حوالے سے اپنی نا انقلابی دنیادار شخصیت کے گرد تقدس کی طناب کھینچ رکھی ہے۔ کسی انقلابی عمل کو روکنے میں ان کا رول اول الذکر سے زیادہ ہے کہ یہ حضرات اپنے ہر مکروہ عمل کے لئے کتاب وسنت سے دلیل لانے میں انتہائی بے باک اور جان بوجھ کر حق کو چھپانے میں انتہائی جری ہیں۔ ان کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کی رسائی وزیروں کے ایوانوں تک ہو، وزرائے اعلیٰ اور وزیر اعظم ان سے مل کر خوش ہوں، ان کے چھوٹے موٹے کام ہوتے رہیں اور بس۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ رسولؐ کی نیابت کا فریضہ انجام دینے والے کفار و مشرکین کی صحبت پر فخر کریں۔ اے کاش کہ انہیں اپنی عزت نہ سہی آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا ہی احساس ہوتا۔

میں اس رویے کا بھی سخت مخالف ہوں جو ہماری محترم ملی شخصیات اور مذہبی قائدین کو مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے بار بار وزیر اعظم کے دروں پر لے جاتا ہے۔ ہم اس عمل کو آخری رسول کی امت کی تذلیل گردانتے ہیں۔ ہم نے بار بار اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ کفار و مشرکین کے سامنے دامن پھیلانے کے بجائے ہم پوری امت کو خدائے قادر المطلق کی پناہ میں دے کر اپنی صفوں کو درست کریں۔ بھلا کفار کو آپ کے مسائل سے کیا دلچسپی۔ انہیں یہ کب گوارا ہوسکتا ہے کہ آخری رسولؐ کی امت اس ملک میں سکون و اطمینان سے رہے۔ وہ تو ہر لمحے ہماری زندگی کے درپے ہیں پھر بھلا بار بار قاتل کے سامنے ہی قتل کا مقدمہ لے کر جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ ضرورت ہے کہ نازک لمحات میں مدد یا استعانت کے لئے ہماری نگاہیں کسی وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم کی کوٹھی تک اٹھنے کے بجائے آسمانوں تک اٹھیں۔

گذشتہ دنوں میرے اور روایتی دینی قیادت کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ بعض محترم حضرات نے مجھے گرم الفاظ کھلانے والا قائد بھی بتایا۔ کبھی کبھی ہماری بعض معروضات ان حضرات پر گراں بھی گزریں لیکن ہر بار ہم نے یہی بتانے کی کوشش کی کہ خدارا آپ ہمارے درد کو اپنا

درد سمجھئے کہ یہ درد واقعتاً اتنا اپنا ہے کہ آپ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ نہ تو اس کا علاج موجودہ سیاسی نظام میں ہے اور نہ ہی بار بار ملحد و مشرک سیاسی آقاؤں کے دروں پر حاضری اس مسئلے کا حل ہے۔ ہم نے تب بھی کہا تھا کہ اے کاش! آپ اپنے آپ کو اور اس امت کو سیاسی شیاطین کی حفاظت میں دینے کے بجائے خدائے قادر مطلق کی پناہ میں دے دیتے۔ تب بھی ہم نے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ ہم میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں۔ ہم آپس میں ایک دوسرے سے جتنے بھی خفا ہوں، اصلاً ہم ایک ہی امت ہیں۔ ہم اور آپ کافروں کے خلاف ایک دوسرے کی قوت بن سکتے ہیں۔ رہے وہ مکار مشرک سیاسی بازی گر تو نہ وہ آپ کے خیر خواہ ہوسکتے ہیں اور نہ ہی ان سے وابستگی آپ کے لئے دنیا و آخرت میں سرخروئی کا سامان بن سکتی ہے۔

تب سے اب تک تاریخ کے پل تلے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ امت کے ضعف میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ اس کا کوئی مسئلہ حل کیا ہوتا نئے نئے بے شمار مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ آج پہلے سے کہیں زیادہ ہماری معروضات پر توجہ کی ضرورت ہے اور بظاہر فلاح امت کے ہر سرکاری وعدے کو ایک حقیقت پسندانہ تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ نازی جرمنی میں جب محض رنگ و نسل کی بنیاد پر انسانوں کے ایک گروہ پر قیامت ٹوٹی تو نازیوں نے بے بس انسانوں کی موت سے لطف اندوز ہونے کا انوکھا طریقہ ایجاد کیا۔ شیشوں کی شفاف دیواروں والے چیمبر میں انسانوں کو بٹھا دیا جاتا۔ دیواروں کے باہر سے موت کے تماشائی اس منظر کا مشاہدہ کرتے کہ کسی شخص پر موت کے لمحات میں کیا گزرتی ہے، مرنا کیسا لگتا ہے۔ موت کو قبول کرنے کا ہر انسان کا الگ الگ انداز کتنا دلچسپ ہوتا ہے۔ پھر جب اس چیمبر میں زہریلی گیس چھوڑی جاتی تو خونخوار تماشائی یہ جان کر محظوظ ہوتے کہ زندگی کے آخری لمحے میں موت کا استقبال کرتے ہوئے مرنے والے نے کون سے بول ادا کیئے۔ آہستہ آہستہ گھٹ گھٹ کر مرنا، مرنے والے کو کیا لطف دیتا ہے۔ زہریلی گیس کے اس چیمبر میں نازیوں کے لئے انسانی موت کا تماشا کسی تفریحی تجربے سے کم نہ تھا۔ کچھ یہی مذاق اس ملک میں گذشتہ پچاس سالوں سے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ جاری ہے۔ سیکولرزم کے زہریلے گیس چیمبر میں بحیثیت امت ان کی آہستہ آہستہ موت یقینی ہے البتہ وحشی سیکولر بازی گروں نے اپنے تفریحی مشاغل کے لئے بے بس مسلمانوں کے اس چیمبر میں تعذیب کی مختلف گیس دے کر ان کی آہستہ رو موت کا تماشا دیکھنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ کبھی پانچ سو کروڑ روپیوں کی تھیلی دکھا

کر تو کبھی ریزرویشن اور اردو یونیورسٹی کے حوالے سے بے بس امت کی حرکتوں کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جانکنی کے عالم میں کبھی سول کوڈ کی تعذیبی دھمکی دے کر یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ گیس چیمبر کے قیدیوں کا اس مسئلے پر رویہ کیا ہے۔ جھوٹی آرزوؤں پر دوڑ پڑنے، منافقانہ وعدوں پر تالیاں پیٹنے، اس گیس چیمبر میں کبھی خوش ہونے اور کبھی مغموم ہوجانے کے عمل کو مشرک سیاسی بازی گر تفریحی دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ یہ ہے وہ صورت حال جس سے ہمیں نجات کی فکر کرنی ہے۔

مسائل کی اس سنگینی کے پیش نظر ملی پارلیامنٹ نے بعض بنیادی اقدمات کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک منصفانہ سیاسی نظام کی خواہش گویا اس بات سے عبارت ہے کہ اب موجودہ نظام کے اندر ہمارا سانس لینا مشکل ہے۔ پٹنہ کے اس اجلاس میں بحث کا یہ موضوع بہت سوچ سمجھ کر منتخب کیا گیا ہے۔ ہم نے مسلم سیاسی بل کو اس اجلاس میں پیش کرنے کا فیصلہ صرف اس لئے نہیں کیا ہے کہ سیاسی بل کے مندرجات اہم ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ ایک نئے سیاسی رویے کی تشکیل کے بغیر اس ملک میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ البتہ ہماری کامیابی کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ ہم آنے والے دنوں میں سیاسی امکانات کو کتنی بصیرت کے ساتھ اپنے حق میں استعمال کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ اس دو روزہ اجلاس میں سیاسی بل کے مسودے پر سیر حاصل گفتگو کے بعد امت کے دردمند ایک واضح سیاسی راستے کی نشاندہی میں کامیاب ہوں گے اور اس طرح اس ملک میں کفار و مشرکین کی سیاسی غلامی کے تاریک دور کا خاتمہ ہو سکے گا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے اس تاریخی اجتماع میں ایک نئے سیاسی مستقبل کے خواب کی منتقلی کے بعد آج میں اپنے آپ کو کچھ ہلکا ہلکا سا محسوس کر رہا ہوں۔ مدت سے میرے دل پر ایک بوجھ تھا کہ نئی دنیا کا جو خواب اللہ تعالیٰ نے میرے دل پر منکشف کیا ہے اسے نئی صبح کے قیام کے آرزومندوں تک منتقل کر دوں۔ کفار و مشرکین کی سیاسی غلامی سے اس امت کو نجات دلانے کے لئے جو داعیہ اللہ نے میرے دل میں پیدا کیا ہے اسے بروئے کار لاتے ہوئے ایک مؤثر انقلابی عمل کی بنیاد رکھ دوں اور ملک بھر میں مجھ سے بھی زیادہ اسلامی انقلاب کے لئے مضطرب آرزومندوں کو ایک لڑی میں پرو کر ناقابل تسخیر قوت میں تبدیل کر دوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس خواب کی عملی تعبیر کے لئے سعید روحوں کے اس اجتماع کو آج عملی طور پر ممکن کر دکھایا۔ نظام کفر کے منکر اس تاریخی اجتماع سے ایک ایسا

انقلابی پیغام لے کر جائیں گے جس سے ملک بھر میں انقلابی سرگرمیوں کو منظم کرنے کا کام لیا جائے گا۔ نئی صبح کے متوالے اب کفار و مشرکین سے یہ مطالبہ نہیں کریں گے کہ وہ ان کے لئے زندگی جینے کا سامان کریں۔ ان کی جدو جہد کا مرکزی نکتہ یہ ہوگا کہ وہ نئی صبح کے قیام کے لئے خود کیا کر رہے ہیں۔ ان کی ساری سرگرمیوں کا بنیادی ہدف اپنی صفوں کو درست کرنا، اپنے آپ کو کفر سے ایک فیصلہ کن معرکے کے لئے تیار کرنا اور اس ملک میں ہر قیمت پر اللہ کی کبریائی کا اعلان ہوگا۔ آپ میں سے ہر شخص قریے قریے کوچے کوچے اس نئی انقلابی فکر کو لے جانے کا ذریعہ بنے گا۔ ہم امت کے ہر فرد کو یہ باور کرائیں گے کہ تمہاری زندگی کفر کی رفاقت میں نہیں بلکہ رسول کی اطاعت میں ہے۔ ہمارے باصلاحیت افراد نظام کفر کے استحکام کے بجائے نظام حق کے قیام کے لئے اپنی صلاحیتیں صرف کریں گے۔ ہم امت کے ہر فرد کے دل پر دستک دیں گے کہ تمہاری حقیقی خیر خواہی کا سامان خدا اور اس کے رسول کے پاس ہے۔ امت کے چھوٹے بڑے، بھلے برے، کمزور قوی، مالدار غریب ہر فرد کو اس انقلابی مشن میں شرکت پر آمادہ کیا جائے گا اور اس طرح انتہائی قلیل مدت میں اس امت کو ایک بنیان مرصوص میں تبدیل کیا جانا ممکن ہو سکے گا۔ نئے ہندوستان کے خاکے میں رنگ بھرنے کے لئے امت کے باحوصلہ افراد آگے آئیں گے۔ اس ملک کو ہر قسم کی ناانصافیوں سے پاک کیا جائے گا۔ خدا کے باغی بندوں سے اس ملک کی زمام اقتدار چھین لی جائے گی اور نظام عدل کے قیام سے ایک ایسی فضا پیدا ہوگی جہاں اس ملک کے مجبور و مقہور باشندے صرف اور صرف ایک رب کی اطاعت میں جینے کا لطف لے سکیں گے۔ نئی صبح کے قیام کی ابتداء آپ سب کو مبارک ہو۔

(خطبہ صدارت، ملی پارلیامنٹ پٹنہ اجلاس بمقام شری کرشن میموریل ہال ۱۹۹۶ء)

ہندوستانی مسلمان: فکری اور عملی ارتداد کی زد میں

اس ملک کے مقہور و مجبور مسلمانو! بھائیو اور بہنو!

آپ کو یقیناً حیرت ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ آج ۲/ مارچ ۱۹۹۷ء نہیں بلکہ ۱۶/ ستمبر ۱۹۴۶ء کی تاریخ ہے۔ یہ بات کتنی ہی حیرت انگیز کیوں نہ ہو، ہے یہ حقیقت۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری ملی تاریخ کے کم و بیش کوئی پچاس سال کھو گئے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ پچاس برسوں میں بحیثیت امت ہم اپنے ملی ایجنڈے سے یکسر غافل رہے ہیں، جہاں دوسری قومیں اپنے قومی اور گروہی ایجنڈوں کے لئے شب و روز جد و جہد کرتی رہی ہیں، جہاں نظام کفر کے داعی مکار مشرک سیاست داں اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے ہر لمحہ سرگرم رہے ہیں وہیں ہم نے اپنے ملی ایجنڈے کو کچھ اس طرح نظر انداز کیا ہے کہ اب ہما شما تو کیا ہمارے خواص کے لئے بھی اس ایجنڈے کو دریافت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ہم نے بحیثیت امت اس ایجنڈے سے مجرمانہ پہلو تہی کا ارتکاب کیا، طرفہ یہ ہے کہ ہم نے دشمنوں کے ایجنڈے کو اپنا ایجنڈا سمجھ کر ان کے اہداف کو اپنا نصب العین بنا کر ان کے حصول میں اپنی قوت کو ضائع کرتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ پچاس سالوں میں ہماری کوئی پیش قدمی تو کیا ہوتی ہم اس حیثیت میں بھی باقی نہیں رہ گئے جہاں ہم آج سے پچاس سال پہلے موجود تھے۔ ہماری ملی تاریخ کے یہی وہ اوراق ہیں جنہیں ہم اوراق گم گشتہ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

قوموں کی زندگی میں اس کے نظریاتی سرمائے کے بعد سب سے قیمتی چیز وقت کو برتنے کا سلیقہ ہوتا ہے۔ زندہ قومیں لمحوں کے الٹ پھیر پر نظر رکھتی ہیں انہیں وقت کو انتہائی چابکدستی سے برتنے اور لمحوں سے صدیوں کا مستقبل ترتیب دینے کا فن آتا ہے۔ ملک اور دولت چھن جائے تو اسے دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی ملک میں ہمارے بزرگوں نے اپنی کھوئی ہوئی جاہ و حشمت کو بارہا بحال کیا ہے لیکن اگر کسی امت سے اس کے پچاس سال چھین لیے جائیں تو یہ اتنا بڑا نقصان ہے کہ اس کی تلافی مشکل ہی نہیں

بہت مشکل ہے، بے پناہ مشکل ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے اندر ایک بار پھر ناممکن کو ممکن کر دکھانے کا عزم پیدا ہو جائے۔

آج جو لوگ اس ملک میں موجود ہیں ان کے لیے ایک انتہائی حوصلہ افزا بات تو یہ ہے کہ وہ ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جب ہندوستانی مسلمانوں کے بے سمت قافلے کو الٰہی رخ پر گامزن کرنے کے لئے سرتوڑ جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے۔ وہ تاریخ کے ایک ایسے خوش قسمت لمحے میں موجود ہیں جب پچاس سالہ سیاسی حماقت کے اعتراف کے بعد خالص الٰہی منشور کے تحت ملی سفر کا بگل بجایا جا چکا ہے۔ جب کمزور مگر باحوصلہ مسلمانوں کا ایک گروہ ہماری برمانہ بے سمتی کو لگام دینے کے لئے آج، اس صبح، اس ملک میں، اس جگہ، دردمند مسلمانوں کی ایک مجلس میں، اس ملک کے پچیس کروڑ مسلمانوں کے لئے، ایک مسلم منشور کے اجراء کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ دہلی کے اس چھوٹے سے اجلاس میں مسلم منشور کا اجراء ہماری ملی تاریخ کا انتہائی اہم واقعہ ہے۔ اس منشور کی اشاعت کے بعد نظریاتی دھندلکوں کی شام اب ختم ہوتی ہے۔ ایک واضح اسلامی ایجنڈے کے اجراء کے بعد اب غیروں کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ ہمیں اسلامی ایجنڈے سے ہٹا کر غیر اسلامی ایجنڈے کے لیے متحرک رکھ سکیں۔ گویا آج کم از کم نظری سطح پر اس ملک کے مسلمانوں نے فرسودہ نظام کے کفن دفن کا انتظام کر دیا ہے۔ ہماری ملی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے جب اپنے مسائل کے حل کے لئے ہم نے صرف اور صرف کتاب و سنت کو اپنا محور و مرکز بنایا ہے۔ ۶/ دسمبر ۱۹۹۲ء کو سیکولرزم کے سڑے مردے نے جب آخری انگڑائی لی تو من حیث الامت شاید پہلی بار ہماری سمجھ میں یہ بات آئی کہ مردہ سیکولرزم میں یہ کس بل نہیں کہ اس کی مزید دہائی دی جائے۔ گویا ۶/ دسمبر پوری امت پر یوم ادراک بن کر طلوع ہوا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں جو حقیقت واضح طور پر نظر آچکی ہے اس پر سیکولر بازیگروں کی کوئی چال پردہ نہ ڈال دے۔

آج جب ملک کی دوسری قومیں آزادی کا پچاس سالہ جشن منا رہی ہیں، مسلمانوں کے لیے یہ بات انتہائی پریشانی کا باعث ہے کہ آخر وہ اس پورے تماشے میں کس طرح حصہ لیں۔ ہمیں یہ باور کرایا گیا ہے کہ ہم آزاد ملک کے شہری ہیں۔ اس ملک کے وسائل میں ہمارا بھی حصہ ہے، گویا ہم بھی کھانے کی اس میز پر بیٹھے ہیں۔ البتہ انہیں یہ کون بتائے کہ جہاں تمہاری پلیٹوں میں انواع و اقسام کے کھانے آئے ہیں ہمارے حصے میں صرف کھانے کی خوشبو آئی ہے۔ پھر بھی ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم آزاد ہیں حالانکہ

ایک سیاسی حکمرانی سے نکل کر کسی دوسری سیاسی حکمرانی میں جانے کو آزادی نہیں کہہ سکتے۔ رہی مسلمانوں کے لئے آزادی کی بات تو شریعت کی رو سے ہم اس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتے جب تک غیر الٰہی نظام اور غیر الٰہی قوانین سے اپنا پیچھا نہ چھڑائیں اور ملک میں ایک ایسا ماحول پیدا نہ ہوجائے جب اللہ کے بندے صرف اور صرف اس کے آگے سجدہ ریز ہوں۔

گزشتہ پچاس برسوں سے ہم ایک زبردست پروپیگنڈے کی زد میں ہیں۔ کبھی ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں اور ہم واقعتاً ایسا سمجھنے بھی لگتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ہم اقلیت میں ہیں اور ہم اس جھوٹ پر یقین کرلیتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں عددی فراڈ کی اس سے بڑی کوئی دوسری مثال نہیں ملے گی کہ پچیس کروڑ کی امت کو اقلیت باور کرادیا گیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ پروپیگنڈے میں بڑی قوت ہے۔ اگر آدمی کے دل و دماغ پر دن رات پروپیگنڈا ہونے لگے تو رفتہ رفتہ اسے پروپیگنڈے پر یقین بھی آنے لگتا ہے۔ مسلمانوں کو اقلیت باور کرانے والے اور اس ملک میں ہندو اکثریت کا ہوا کھڑا کرنے والوں نے تمام ہتھکنڈے استعمال کئے ہیں حتیٰ کہ دستور میں لفظ ہندو کی تعریف بھی اس انداز سے کی گئی ہے کہ جو فلاں فلاں اور فلاں قوم کا نہ ہو وہ ہندو ہے۔ حالانکہ کسی اتنی اہم دستاویز میں ڈھیلی ڈھالی تعریف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس دستوری تعریف سے فائدہ اٹھاکر سات فیصد کی برہمن اقلیت نے اس ملک پر گزشتہ پچاس برسوں سے حکومت کی ہے البتہ اب صورت حال بدل رہی ہے۔ لیکن اگر مسلمان یہ سمجھنے لگیں کہ برہمنوں کی حکمرانی سے نکل کر دلتوں اور نیچی ذات والوں کے ووٹ بینک بن جانے میں عافیت ہے تو اس رویے سے کسی نئی صبح کے طلوع ہونے کا امکان نہیں۔ اب تک ہم نے اپنا استحصال برہمنوں سے کروایا ہے، اب چھوٹی ذات والوں سے کرالیں۔ میرے نزدیک ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ہی سیاسی غلامی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ تو ایک عقلی سی بات تھی ہمیں تو مسلمان کی حیثیت سے دیکھنا ہوگا کہ ہمارا ایسا کرنا اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ہے یا نہیں۔

اگر ہم ایک اسلامی ایجنڈے کے تحت اپنی زندگی کو ازسرنو منظم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہم اب تک کرتے کیا رہے ہیں۔ گزشتہ پچاس برسوں میں ہم نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ اسلامی ایجنڈے کا حصہ ہے یا نہیں۔ آج اس ملک میں ہماری مذہبی اور ملی قیادت اسلامی ایجنڈے سے یکسر غافل، غیروں کے ایجنڈے کے لئے کام کررہی ہے۔ افسوس کہ ہمارے بڑے بڑے قائدین کو اپنی اس

گمرہی کا احساس بھی نہیں۔

آپ کسی عالم سے گفتگو کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ اس بات کا تو قائل ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی اور طریقہ حیات ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ جمعہ کا خطبہ ہو یا عیدین کا خطبہ ہو وہ بڑے زور و شور سے اس بات کی دعا کرتا ہے کہ "اللہم اعزالاسلام والمسلمین" یعنی اے اللہ اسلام اور مسلمانوں کو عزت عطا فرما۔ لیکن جب وقت عمل کا آتا ہے تو فتوے جاری کئے جاتے ہیں کہ مسٹر دیوے گوڑا یا لالو یادو یا مسٹر کیسری صاحب کی حمایت کی جائے۔ نعوذ باللہ یہ کیا تماشہ ہے کہ آپ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ تو اسلام کو غالب کردے، اسلام کو قوت دے اور عمل آپ وہ کر رہے ہیں کہ جس سے کفر کو قوت ملے۔ یہ ایک ایسا دوہراپن ہے، ایسا تضاد ہے جس نے پوری امت کو پچھلے پچاس سالوں سے اپنی پلیٹ میں لے رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پوری امت کے پاس اس وقت کوئی سمت نہیں ہے۔ یوں تو اس وقت ملک میں بے شمار اہل فکر موجود ہیں، سوچنے سمجھنے والے لوگ بھی ہیں لیکن اگر آپ کسی سے گفتگو کیجئے تو آپ کو چند لمحوں کے بعد یہ احساس ہونے لگے گا کہ یہ شخص ایک فکری تضاد سے دوچار ہے۔ یہ ایمانی طور پر تو کسی اور چیز کو تسلیم کرتا ہے مگر عقلی طور پر سمجھتا ہے کہ یہ چیز قابل قبول یا قابل عمل نہیں ہے۔ لہٰذا اپنے لئے عمل کا ایک دوسرا راستہ نکال لیتا ہے۔

پھر آپ اس بات کا بھی جائزہ لیں کہ اس ملک میں بے شمار علمی ادارے، مذہبی تحریکیں کام کر رہی ہیں۔ کیا ان کے پاس کوئی ایسا خاکہ ہے یا کوئی ایسا راستہ نظر آرہا ہے کہ وہ اس ملک کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ اگر کوئی ایسا راستہ نظر آتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر اس کے پیچھے یقیناً ہم لوگوں کو لگ جانا چاہئے اور اگر نہیں ہے تو یہ سب کا سب ہمارا سرمایہ ہے۔ اگر ایک شخص چھوٹی سی میز لے کر دین کا کام کر رہا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔ ایک شخص اگر اسکول کھول رہا ہے یا کالج چلا رہا ہے یا کوئی بھی کام کر رہا ہے جس سے یہ سمجھ رہا ہے کہ آنے والے دنوں میں تبدیلی برپا ہوگی تو یہ ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔ ہم ذرا یہ دیکھیں اور متفکر ہوں کہ ان چیزوں سے ہمیں کوئی Direction ملتا ہے یا نہیں، اس کا احتساب کرنے اور جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہم صرف یہ کہہ کر الگ نہیں ہو سکتے کہ یہ فلاں جماعت کر رہی ہے لہٰذا ہمارا اس سے کیا تعلق۔ ہمیں اس تصور کے ساتھ آگے بڑھنے کی ضرورت ہے کہ یہ سب کے سب لوگ رسول اللہ کی امت کا حصہ ہیں، یہ اس انقلابی تحریک کے جز ہیں۔ اگر ان کی چلت

پھرت سے مستقبل کی صبح طلوع نہیں ہوتی تو ہمیں اس کے لئے فکر مند ہونا چاہیے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ کسی بھی ایسے ایجنڈے کی تیاری کے سلسلے میں یا کسی بھی ایسے راستے کی نشاندہی کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ بات تو واضح ہونی چاہیے کہ ہم کلی طور پر اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات پر انحصار کریں۔ کسی بھی مسئلے میں مسلمانوں کے لئے کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے یہ ہمارے ذہنوں کی اپج نہیں ہوگی بلکہ دیکھا جائے گا کہ اللہ کی کتاب کیا کہتی ہے؟ رسولؐ کی سنت کیا کہتی ہے؟ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جس امت کے پاس اتنا بڑا نظریاتی سرمایہ ہے اور میں یہ بات اگر ایک مسلمان کی حیثیت سے نہ بھی کہوں تو قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ قرآن بذات خود ایک لائیو وائر (Live Wire) ہے۔ یعنی اگر آپ اس پر ہاتھ رکھیں تو جھٹکا لگتا ہے۔ بڑی عجیب و غریب کتاب ہے، جس امت کے پاس اتنا بڑا انقلابی سرمایہ موجود ہو کیسے ممکن ہے کہ کسی مسئلے پر اس کے پاس چار رائے ہوتی ہو، جس پر لوگ مجتمع نہیں ہو پاتے ہوں۔ مذہبی اعلیٰ قسم کی قیادت کا عالم یہ ہے کہ وہ کسی مسئلے پر گفتگو کے لئے جمع ہوتے ہیں لیکن کسی اجتماعی لائحہ عمل کی ترتیب میں ناکام رہتے ہیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جب کتاب و سنت میں بعض بنیادی اصولوں کے سلسلے میں بہت ہی واضح ہدایات موجود ہیں تو آخر کیا چیز ہے جو ہمارے لئے مانع ہو رہی ہے کہ ہم ایک اور ایک موقف اختیار کر سکیں۔

مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ الیکشن کا ایک موقع سامنے آتا ہے۔ تین آپشن مسلمانوں کے پاس ہیں۔ لیفٹ فرنٹ یعنی متحدہ محاذ کو ووٹ دیا جائے، کانگریس کو ووٹ دیا جائے یا بی جے پی کو ووٹ دیا جائے۔ مسلمانوں کا سب سے مؤقر ادارہ مسلم پرسنل لا بورڈ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے بیٹھتا ہے۔ گھنٹوں کی طویل گفتگو کے بعد کوئی ایک بات متفقہ طور پر طے نہیں پاتی ہے۔ البتہ یہ بات طے پاتی ہے کہ اس مسئلے پر بورڈ کا کوئی موقف نہیں ہوگا بلکہ جو لوگ اس سے وابستہ ہیں وہ اپنے اپنے طور پر جو ان کی سمجھ میں بات آئے گی کریں گے، تو واقعہ یہ ہے کہ ان سب حضرات کی دمیں کہیں نہ کہیں پھنسی ہوئی ہیں۔ کسی نے جنتادل سے اپنی دمیں باندھ رکھی ہیں، کسی نے کانگریس کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رکھا ہے تو کوئی روایتی طور پر اپنے آپ کو کانگریس کا آدمی سمجھتا ہے۔ یہ ہے صورت حال، تو قصہ یہ ہے کہ پوری ملی قیادت کفار و مشرکین کے ہاتھوں اغوا کرلی گئی ہے یعنی جنہیں ہم اپنا ملی قائد سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ کتاب و سنت کی روشنی میں ہمیں کوئی راہ دکھائیں گے۔ ان کا عالم یہ ہے کہ انھوں نے اپنا سیاسی قائد کسی کافر اور

مشرک کو تسلیم کیا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم کسی اجتماعی فیصلے پر نہیں پہنچ پاتے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بعض چیزوں میں اصولی طور پر بالکل واضح ہو جائیں اور اس سلسلے میں اللہ کی کتاب اور رسول اللہؐ کی سنت ہمیں بہت ہی واضح ہدایات دیتی ہے۔ اسلام ایسا مذہب نہیں ہے کہ یہاں پادریت کی کوئی گنجائش ہو، نہ یہاں مولویوں کا کوئی ایسا طبقہ بنایا گیا ہے جسے پنڈتوں کی طرح اختیار دے گیا ہو کہ آپ ہی مذہب کی تعبیر و تشریح کا حق رکھتے ہیں۔ بلکہ اللہ کی کتاب رسولؐ کے ذریعہ بھیجی گئی ہے اور پوری کی پوری امت بغیر کسی استثناء کے اس ذمہ داری میں حصہ دار ہے کہ وہ اس نظام کو قائم کرنے میں اپنی ساری توانائی لگادے۔ اس لئے ہم روز محشر یہ کہہ کر دامن نہیں بچاسکتے کہ ہمارے علمائے کرام یا ہماری سیاسی قیادت کفار و مشرکین کی اتباع کے لئے ہمیں مجبور کرتی تھی۔ ہم سب کو اپنا اپنا حساب دینا ہے۔

پچاس سال گزر گئے، اس میں آپ نے کیا کیا؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ہم نے بیعت کی تھی تو کیسے ہم اس بات کے قائل ہو گئے کہ ہم دوسری بیعت ملائم سنگھ یادو سے کرلیں۔ یہ نہیں ہوسکتا یعنی آپ کو اس سلسلے میں واضح ہونا ہوگا کہ ہمارا قائد کون ہے؟ شرعی طور پر کیا رسول اللہؐ کی بیعت کے بعد مسلمانوں کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے شخص سے بیعت کرلیں جو رسول اللہؐ کے ایجنڈے کے علاوہ کوئی اور ایجنڈا رکھتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ممکن نہیں ہے، جس وقت ہم کفار و مشرکین کو اپنا سیاسی قائد تسلیم کرلیتے ہیں اس وقت رسول اللہؐ سے ہماری بیعت ٹوٹ جاتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمیں اس نزاکت کا احساس نہیں ہے۔

رسول اللہؐ کا اسوہ ہمارے لیے کلی طور پر لائق اتباع ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں آپ کی ہدایت موجود نہ ہو پھر ہم یہ بھی کہتے ہیں اور اس سلسلے میں مسلمانوں میں بہت واضح رویہ پایا جاتا ہے کہ دین میں پورے کے پورے آپ داخل ہو جائیں۔ جس کا مطالبہ اللہ کرتا ہے کہ ادخلوا فی السلم کافۃ۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسجد میں تو رسول اللہؐ کی امامت ہوگی اور ان کے بتائے ہوئے طریقے پر نماز پڑھی جائے گی اور مسجد کے باہر کفار و مشرکین کی اتباع میں اور ان کے بتائے ہوئے طریقے پر زندگی گزاری جائے گی، یہ نہیں ہوسکتا۔ جس وقت ہم اس دوہرے پن میں مبتلا ہوتے ہیں اسی وقت رسول اللہؐ سے ہماری بیعت ٹوٹ جاتی ہے۔

اس وقت اگر جائزہ لیا جائے تو پوری کی پوری امت فکری طور پر ایک بڑے ارتداد سے دوچار ہے۔ آپ نے یہ سنا ہوگا کہ پرسنل لاء بورڈ کے تحت مسلمانوں نے بڑی بڑی تحریکیں چلائیں، مسلمان شریعت کے تحفظ کے نام پر سڑکوں پر آگیا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اللہ کی شریعت اس سے زیادہ اہم ہے کہ اس کی زندگی اس ملک میں محفوظ ہو، لہٰذا ہم نے جان پر کھیل کر شریعت کے تحفظ کی تحریک چلائی۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ اگر اللہ کی شریعت کے مطابق اپنے عائلی قوانین کا فیصلہ نہ کیا گیا اور نکاح و طلاق کے مسائل حل نہ کئے گئے، اگر وراثت کا مسئلہ حل نہ کیا گیا اور کسی اور نظام کے تحت ان مسائل کو حل کرنے بیٹھ گئے تو ہم مرتد ہو جائیں گے۔ لہذا مسلمان رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا پرسنل لاء اس ملک میں محفوظ رہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اللہ کی شریعت صرف عائلی زندگی میں ازدواجی زندگی میں ہدایت دیتی ہے یا اللہ کی شریعت ایک وسیع شریعت ہے اور پوری زندگی گزارنے کا طریقہ بتاتی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ رسول اللہ کے سیاسی فلسفے کو چھوڑ کر ان کے بتائے ہوئے معاشی و سیاسی طریقہ ہائے حیات کو چھوڑ کر آپ کفار و مشرکین کی اتباع کرلیں۔ یہ ایک کھلا ارتداد ہے کہ ہم نے رسول اللہؐ کے بتائے ہوئے طریقے کو چھوڑ کر کسی دوسرے نظام حیات کو قبول کر رکھا ہے اور اپنے آپ کو اس ملک کا معزز سیکولر شہری بتانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دیکھئے اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کا اگر کوئی طریقہ ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں جتنے بھی ازم پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب باطل ہیں۔ ہمارے لیے ناقابل قبول ہیں۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ اور آج کا یہ جلسہ چونکہ ایک مذہبی جلسہ ہے جس میں ہم اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ پچھلے پچاس سالوں میں جو ہماری مذہبی زندگی تباہ ہوگئی، مذہبی اقدار الٹ پلٹ ہوگئے ہیں۔ بعض تصورات خلط ملط ہوگئے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے اپنی گفتگو میں اور جلسے میں کہ ہم اپنی مذہبی زندگی کو کیسے (Re-organise) کریں، اس مسئلہ پر غور کریں۔ اس کے لیے ہم یہاں بیٹھے ہیں تو یہ پوچھنا چاہیں گے آپ تمام حضرات سے، بھائیوں اور بہنوں سے کہ کیا اس بات کی کوئی گنجائش ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو سیکولر بھی بتائے اور مسلمان ہو؟ کیا سیکولرزم ایک سیاسی فکر کے طور پر مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے یا نہیں؟ شریعت کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ نے ہمیں جو سیاسی فلسفہ دیا ہے، سیاسی ایجنڈا دیا ہے اس سے ہم سرمو انحراف نہیں کرسکتے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف ہم سیکولرزم کو پولیٹیکل آئیڈیالوجی کے طور پر قبول کرلیں اور دوسری طرف

ہم یہ بھی کہیں کہ رسول اللہؐ کے بتائے ہوئے راستے پر بھی ایمان رکھتے ہیں،ایسا ممکن نہیں۔

ہماری مذہبی قیادت،ہو یا سیاسی قیادت وہ ہمیں گزشتہ پچاس سالوں سے باور کراتی رہی ہے کہ اس ملک میں اگر کوئی نظام حیات ہمارے لئے مناسب ہو سکتا ہے،قابل عمل ہو سکتا ہے تو وہ صرف سیکولرزم ہے۔لہٰذا مسلمان سیکولر اسٹرکچر کو قائم رکھنے میں،استحکام بخشنے میں اپنی قوت لگائیں۔کہیں ایسا تو نہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس ملک میں ایک سیکولر نظام ہی مسلمانوں کے لئے لائق عمل ہو سکتا ہے تو دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا کی یہ کتاب اس ملک میں ہدایت کے لئے اب Relevant نہیں رہی ہے۔یہ کسی اور پرانے زمانے کی بات ہے کہ جس کی بنیاد پر آپ ایک معاشرہ برپا کرنا چاہتے ہیں۔یہاں اب صورت حال مختلف ہے۔یہاں تو سیکولر سوسائٹی ہی قائم ہو سکتی ہے۔ہماری بڑی بڑی مذہبی قیادت باور کراتی رہی ہے کہ سیکولرزم ہی ہمارے لیے نجات کا باعث ہے۔یہ ایک بہت ہی بڑا فکری ارتداد ہے۔

آج اس امت کو اگر واقعی کسی سمت کی تلاش ہے تو پہلے یہ واضح ہونا چاہیئے کہ ہم اس ملک میں کرنا کیا چاہتے ہیں؟اگر مسلمان کی حیثیت سے ہم یہ چاہتے ہیں کہ مائناریٹی اسٹیٹس کو برقرار رکھیں اور اس سلسلے میں کچھ اور تحفظات حاصل کرلیں اور اس سلسلے میں کچھ یقین دہانی ہوجائے اور ہم مطمئن رہیں اپنے اقلیتی حقوق پر تو میں یہ کہوں گا کہ یہ قرآنی رویے سے انحراف ہے، اس لئے کہ قرآن آپ کو مائناریٹی اسٹیٹس میں دیکھنا نہیں چاہتا بلکہ قرآن کا حکم ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد آپ اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ اس ملک میں قرآن کی بنیاد پر ایک منصفانہ نظام قائم کریں۔ یہ ہمارا ایجنڈا ہے۔ تو یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا واقعی ہم اس ایجنڈے پر پوری طرح گامزن ہیں یا نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری پوری سعی جو اس پچاس سال میں ہوئی ہے وہ اس ایجنڈے سے منحرف ہے۔ہم نے شریعت کے تحفظ کے لئے اس ملک میں مہمیں چلائیں لیکن کیا اللہ کی شریعت اس لئے اتاری گئی ہے کہ اس کا تحفظ ہو۔اس کو تحفظ دلایا جائے۔یہ عجیب و غریب تصور ہے کہ تحفظ شریعت کی مہم چلائی جائے۔ اللہ کے بندو! شریعت تحفظ کے لئے نہیں اتاری گئی ہے وہ تو نفاذ کے لئے اتاری گئی ہے تم اس کے نفاذ کی تحریک کیوں نہیں چلاتے؟ یہ ہے وہ انحراف (Digression) جہاں سے ہمارا ملی کارواں بھٹک گیا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس بڑی بڑی تاویلیں موجود ہیں۔ہم یہ کہتے ہیں کہ حالات بہت خراب ہیں۔اس ملک میں اتنی بڑی بات کہنے کے لئے شاید ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ اللہ کا

حکم ہے، اس کے رسولؐ کا حکم ہے کہ آپ اتنی ہی بڑی اور خطرناک باتیں کہیں۔ ورنہ ہم مسلمان ایمانی طور پر مسلمان نہیں رہتے۔ اگر ایک لمحے کے لئے بھی ہم یہ سوچتے ہیں کہ قرآن مجید اس ملک میں ہدایت کے لئے کافی نہیں ہے اس ملک میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا، نئی ترکیب ڈھونڈنی پڑے گی تو گویا ہم اپنے آپ کو اللہ سے بڑا دانا اور اس کے رسولؐ سے زیادہ عقلمند سمجھنے لگے ہیں۔ لہٰذا پچھلے دنوں جب الیکشن میں یہ بات آئی کہ ان تین کفر Options میں سے کس کو اختیار کیا جائے تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے یہ بات کہی کہ کم تر درجے کی برائی اختیار کرلی جائے۔ میں نے یہ پوچھا کہ کیا اگر آپ کے سامنے تین Option ہوں یعنی زناکاری، شراب خوری اور کسی کا قتل تو آپ کس چھوٹی برائی کو قبول کرلیں گے۔ اللہ کے بندو! ہمیں یہ چاہئے کہ ہم کفر کے ان تینوں آپشن کو یکسر مسترد کردیں اور چوتھے آپشن کے سلسلے میں فکر مند ہوں۔ آپ خود غور کریں کہ اس طرح سے جہاں ہمارا پچاس سالہ سیاسی سفر ہے اس میں ہم کہاں پہنچتے ہیں؟ کہیں نہیں پہنچتے ہیں۔ اسی سرکل میں ہم گھوم رہے ہیں کہ آج اس کافر کو اقتدار بخشیں، کل اس کو بخشیں۔ حالانکہ شریعت کی رو سے یہ بات مسلمانوں کے لئے قطعی حرام ہے کہ وہ کفار و مشرکین کو اپنا حکمراں تسلیم کرلیں۔ یا اپنے امور کا ذمہ دار تسلیم کرلیں۔ قرآن کی آیت آپ کے سامنے یہاں آویزاں ہے۔ **ولن یجعل اللّٰہ للکافرین علی المومنین سبیلا۔** یعنی اللہ ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کفار و مشرکین مسلمانوں کے حکمراں بن جائیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ سیاسی زندگی میں ہم ان لوگوں کو اپنا سیاسی آقا برضا و رغبت تسلیم کرلیں۔

اگر ہم واقعی اس ملک میں ایک اسلامی زندگی جینا چاہتے ہیں اور اپنی قوتوں کو دوبارہ منظم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں دیکھنا ہوگا کہ رسول اللہؐ کی ذات مبارکہ سے اس سلسلے میں کیا واضح ہدایات ملتی ہیں۔ یعنی Re-organisation اور حکمت عملی بنانے کا کام بھی ہماری اور آپ کی عقل سے نہیں ہوگا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی حکمت عملی کی روشنی میں ترتیب پائے گا۔ جبھی اس مشن کو کامیابی کی منزل مل سکتی ہے۔

اگر ہم واقعی اس سلسلے میں یکسو ہونا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں اور ہم جس فکری ارتداد میں آگئے ہیں اس سے نکلنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے بڑی فکر مندی کی بات ہے کہ ہم دوبارہ کیسے اپنے آپ کو مسلمان کریں۔ دیکھئے بعض چیزیں بہت واضح ہیں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کیسے

نظر نہیں آتیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ جمہوری ملک ہے۔ یہاں جمہوریت ہے اور ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جمہوریت اسلام ہی کا جز ہے گویا ہمارے لیے کوئی مقدس عقیدہ ہے جس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ آپ نے دیکھا ہوگا پچھلے دنوں یوپی کے الیکشن میں مسلم علماء، دانشوروں، سیاسی حضرات اور میں سمجھتا ہوں کہ واقعی دردمند لوگ اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ یونائٹیڈ فرنٹ اور بہوجن سماج پارٹی ایک جگہ مل کر کوئی اتحاد کرلیں۔ جامع مسجد کے امام نے اتحاد کے سلسلے میں ایڑی چوٹی کا زور لگادیا۔ مسلمانوں کے قافلے نکلے کہ اس ملک میں سیکولر قوتوں کو مستحکم کیا جائے اور اس کے لیے باضابطہ تبلیغ کی گئی۔ کس نے آپ سے یہ کہا کہ جمہوریت آپ کے لیے ایک ناگزیر عقیدے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جمہوریت کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ اکثریت کی حکومت، اور اکثریت اس ملک میں کس کی ہے یہ آپ خوب جانتے ہیں۔ پھر آپ جمہوریت کو قائم رکھنے کے لئے اور اس کے استحکام کے لئے کیوں پریشان ہیں؟ اللہ اور اس کے رسول نے آپ پر یہ ذمہ واری نہیں ڈالی ہے کہ آپ اس ملک میں سیکولر ڈیموکریسی کو مضبوط بنائے رکھیں۔ تو پھر آپ کیوں اس سلسلے میں خواہ مخواہ پریشان ہیں، دوڑے پڑتے ہیں۔ آپ پولنگ بوتھ تک جاتے ہیں، آپ کے نوجوان گولیوں کا شکار ہوتے ہیں، آپ چار چار اور چھ چھ گھنٹے دھوپ میں کھڑے ہوکر ایک ایسا ووٹ ڈالتے ہیں جو آپ کے اوپر کفار و مشرکین کی حکومت کو مزید مستحکم کرتا ہے۔ اللہ کے بندو! ہو کیا رہا ہے؟ کس شریعت کے تحت یہ ساری چیزیں رواج پاگئی ہیں اور اسے برداشت کیا جارہا ہے؟ تو یہ پوچھنے کی ضرورت ہے اپنے آپ سے، پوری امت کو اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے۔

اس ملک میں بہت سے تماشے ہماری آنکھوں پر پردہ ڈالنے کے لئے کئے جاتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اس ملک میں دو مسلمان صدر جمہوریہ وجود میں آئے۔ ہر منسٹری کی تشکیل میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس میں مسلمان ضرور لیا جائے، ہر سرکار اس بات کی کوشش ضرور کرتی ہے کہ مسلمانوں کو نمائندگی ضرور ملے تاکہ اس امت کو پچھلے پچاس سالوں میں جو Setback پہنچا ہے اور تاریخی طور پر جو سیاسی محکومی کی زندگی گزار رہی ہے اس کے اندر اتنا بڑا فرسٹریشن پیدا نہ ہو کہ وہ سوچنے سمجھنے پر اور سڑکوں پر نکل آنے پر مجبور ہوجائے، لہٰذا اسے مطمئن کرنے کے لئے، اسے باور کرانے کے لئے کہ اس پورے تماشے میں آپ بھی شریک ہیں۔ کبھی کسی جعفر شریف کو وزارت سے نوازا جاتا ہے تو کبھی کوئی ابراہیم صاحب سامنے لائے جاتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ جعفر شریف صاحب کو ریلوے منسٹر

ہونے سے اور اب پاسوان صاحب کے ہونے سے کوئی فرق واقع ہوگیا ہے؟ کیا ان کے دور میں تمام اسٹیشنوں پر اذانیں ہونے لگی تھیں جو اب بند ہوگئی ہیں؟ پھر آپ یہ کیوں سمجھنے لگتے ہیں کہ کسی جعفر شریف یا کسی ابراہیم کے آجانے سے آپ کی نمائندگی ہوجائے گی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بی جے پی کی تیرہ دنوں کی حکومت میں جب سکندر بخت صاحب کو اچھا پورٹ فولیو نہیں ملا، وہ خاصے ناراض تھے۔ انہوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا، ٹی وی پر یہ تماشا دکھایا جاتا رہا۔ اس وقت کسی مسلمان کے دل میں ان کے لئے ہمدردی پیدا نہیں ہوئی کہ ان کو کوئی اچھا پورٹ فولیو مل جائے۔ اس لئے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بی جے پی کے سکندر بخت ہمارے نمائندے نہیں ہیں۔ تو بی جے پی کے سکندر بخت کے سلسلے میں اگر ہم اتنے واضح ہیں کہ وہ ہمارے نمائندہ نہیں ہیں تو دوسری پارٹیوں میں جو سکندر بخت موجود ہیں ان کو ہم اپنا نمائندہ کیسے تسلیم کیے لیتے ہیں؟ یہ بات سوچنے کی ہے۔

پھر یہ بات بھی جان لیجئے کہ ہمارا نمائندہ وہی شخص ہوسکتا ہے جو اس ملک میں اسلامی ایجنڈے کے تحت ایک تبدیلی لانا چاہتا ہے۔ یعنی جو اس کتاب کو تسلیم کرتے ہوئے کہ یہ ایک قابل عمل دستور حیات ہے اور اس کے نفاذ کے لئے تحریک چلاتا ہے تو وہ ہمارا نمائندہ ہوسکتا ہے۔ کوئی اگر جنتادل کا ایجنڈا نافذ کرنا چاہتا ہے تو وہ ہمارا نمائندہ نہیں ہوسکتا، کوئی اگر کمیونسٹ پارٹی کی نمائندگی کررہا ہے وہ بھی ہمارا نمائندہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ ہماری نمائندگی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی اور ایجنڈے کے بجائے اسلامی ایجنڈے کے لئے کام کرنا چاہتا ہو اور چونکہ موجودہ صورت حال میں تمام کی تمام سیاسی پارٹیاں کسی اسلامی ایجنڈے کی حامل نہیں ہیں۔ اس لیے شریعت کی رو سے مسلمانوں کے لئے قطعی حرام ہے کہ کسی ایسی پارٹی میں شرکت کریں یا اس کے لئے جدوجہد کریں یا اس کو پاور میں لانے کے لئے کام کریں، اس لیے کہ وہ ایک ایسے ایجنڈے کے لئے کام کررہی ہیں جو ہمارے اپنے ایجنڈے سے ٹکراتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کا مطالبہ ہے کہ ہم اس ملک میں ایک منصفانہ نظام کے قیام کے لیے کام کریں۔ اسے آپ خلافت کہیں، نظام مصطفی کہیں یا کسی اور نام سے پکاریں۔ لیکن بنیادی مطالبہ یہ ہے مسلمانوں سے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس ملک کے اندر بلکہ پوری دنیا میں ایک عالمی خلافت کے قیام کے لیے جدوجہد کریں۔ یہ قرآن کا مطالبہ ہے۔ قرآن ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس ملک میں اور اس سے باہر سوسائٹی کا رخ قرآن کی طرف پھیر دیا جائے، یعنی ہماری سوسائٹی قرآنی سوسائٹی ہو، قرآنی سول کوڈ کی

سوسائٹی ہو۔ دستور کا مطالبہ ہے کہ ہم ایک ایسی سوسائٹی قائم کریں جو یونیفارم سول کوڈ کی سوسائٹی ہو۔ دستور ایک طرف کھینچنا چاہتا ہے تو قرآن دوسری طرف لے جانا چاہتا ہے، بالکل مخالفت سمت میں۔اب یہ طے کرنا پڑے گا کہ شرعی طور پر ہم کس طرف جانے کے لئے تیار ہیں۔

ہماری مذہبی زندگی ہم سے مطالبہ کرتی ہے، بہت ہی واضح انداز میں مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اپنے کارواں کا رخ قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر موڑ دیں۔ مسلمانوں کو اس ملک کا نظریاتی شہری بنانے کے لئے اس بات کی ضرورت ہوگی کہ دستور میں بعض بنیادی ترمیمات لائی جائیں جو کہ قرآنی تصورات کو (accomodate) کر سکیں۔ رہی قرآن میں کسی تبدیلی کی بات تو یہ ہرگز ممکن نہیں۔ یہ ہمارا ایمان ہے، ہمارا عقیدہ ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ ناقابل تنسیخ ہے اس لیے تبدیلی تو دستور ہی کے اندر ہو سکتی ہے۔ افسوس کہ ان بنیادی مسائل پر پچھلے پچاس سالوں میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

امت مسلمہ جس فکری لےجنڈے کے لیے وجود میں آئی ہے اس سے انحراف نہیں کر سکتی۔ ہمارے عقیدے کا حصہ ہے کہ خلافت کی کرسی تین دن سے زیادہ خالی نہیں چھوڑی جا سکتی۔ اس پر فقہاء کا اجماع ہے کہ خلافت اور امام عادل کے بغیر مسلمانوں کی کوئی ملی، مذہبی اور اجتماعی زندگی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ ہم ۷۴ سال سے بغیر کسی خلیفہ بغیر کسی امیرالمؤمنین کے زندگی گزار رہے ہیں اور یہ سب کچھ ایسا نارمل ہو گیا ہے کہ ہم اس بنیادی لےجنڈے پر غور نہیں کرنا چاہتے۔ تو جب تک کوئی ایسا نظام قائم نہیں ہو جاتا جسے آپ خلافت کا نظام کہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عالمی خلافت کے قیام کے لیے ہر لحہ جدوجہد کرتے رہیں جبھی ہمارا ایمان باقی رہ پاتا ہے۔ لیکن عملی طور پر ہوا یہ ہے، یہ بہت بڑا سانحہ ہے اس امت کے ساتھ کہ پچھلے پچاس سالوں میں اس کا خواب گم ہو گیا ہے۔ ہم لوگ یہ بھول گئے کہ ہم اس ملک میں کیا کرنے کے لئے آئے تھے، ہمیں کیا کرنا چاہئے تھا، ہم کر کیا رہے ہیں، اس ملک میں ہماری حیثیت کیا ہے، شرعی طور پر اس ملک کی کیا حیثیت ہے؟ آپ بڑے سے بڑے دارالافتاء سے رابطہ کریں اور ان سے یہ پوچھیں کہ اس بارے میں شریعت کیا کہتی ہے کہ جب کوئی ملک جو کبھی دارالاسلام رہا ہو وہ تاریخ کے کسی مرحلے میں حادثے کا شکار ہو گیا ہو، تو دارالاسلام کی حیثیت ختم ہو جانے کے بعد مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے؟ کسی ایسی صورت حال میں شریعت کا حکم ہے کہ مسلمان اسے دوبارہ دارالاسلام بنانے کے لئے جدوجہد جاری رکھیں۔

ہندوستان کی جو موجودہ صورت حال ہے اس میں اس قبیل قال کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہم ابھی مکی دور میں ہیں یا مدنی دور میں۔ یہ وہ ملک ہے جہاں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ ہے، آپ اس تاریخ سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ایک حادثے کے نتیجے میں ہم جس صورت حال میں پھنس گئے ہیں اس میں ہمارے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ اور پھر اس سے نکلنے کے لیے شریعت کیا راستہ تجویز کرتی ہے؟ تو سب سے پہلے یہ کام ہے کہ مسلمان بغیر کسی پس و پیش کے بلا تاخیر دارالاسلام کو جو دارالاسلام کی حیثیت سے ختم ہوگیا ہے اسے دوبارہ دارالاسلام بنانے کے سلسلے میں جدوجہد کریں۔

یہ تو ملکی صورت حال ہے۔ عالمی طور پر پوری امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جلد از جلد خلافت کے ادارے کو دوبارہ اپنی بنیادوں پر قائم کرے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس امت کے سروں سے اتنے طویل عرصے کے لئے خلافت غائب رہی ہو۔ اس وقت پوری امت جو دنیا بھر میں اپنے آپ کو ڈیڑھ بلین بتاتی ہے، سب پر یہ ذمہ داری ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بوڑھا کہ وہ خلافت کے ادارے کو قائم کرنے کے لئے شب و روز جدوجہد کرے۔ جب تک کہ خلافت کا ادارہ قائم نہیں ہو جاتا ہمارے لیے چین کا کوئی لمحہ نہیں۔

یہ خلافت کے خاتمے کا سبب ہے کہ آج پوری دنیا میں مسلمان ذلیل ہیں۔ کوئی بوسنیا میں ہمارا قتل کرتا ہے تو کوئی چیچنیا میں ہم پر فائر کے دروازے کھولتا ہے۔ دنیا میں مختلف جگہوں پر ہمارا قتل عام جاری ہے۔ ایک ایسی صورت حال میں کیا چین کا کوئی لمحہ ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نہیں ہو سکتا۔ صرف یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ حالات بہت خراب ہیں، ان حالات کو درست کرنے کے لئے اگر ہم آمادہ نہیں ہوتے تو حالات اور بھی خراب ہو جائیں گے۔

عالمی خلافت کے قیام کے سلسلے میں کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ کسی خاص فرقے، کسی خاص طبقے کی کم یا زیادہ ذمہ داری ہے۔ ہم نے امت کے ہر طبقے کو دعوت دی اور ہم نے یہ کہا کہ بھئی یہ بنیادی کام ہے اس سے کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ تو پھر اس سلسلے میں ہر شخص کا تعاون ہمیں حاصل کرنا ہوگا۔ ہمارا دروازہ ہر مسلمان مرد و عورت کے لیے کھلا ہے۔ ملی پارلیامنٹ نے بہنوں کے سلسلے میں خاص طور پر پروگرام وضع کیا ہے۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہزار ملین کے سمندر میں ہم صرف ڈھائی سو ملین لوگ ہیں۔ اس میں بھی اگر آپ تقریباً ایک سو دس ملین خواتین کو عضو معطل بنا کر رکھ

دیں گے تو ہماری قوت اور بھی آدھی ہوجاتی ہے پھر یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطالبہ یہ ہے کہ عورتیں اس مشن میں پوری طرح شرکت کریں۔ واضح طور سے قرآن کہتا ہے۔ **والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض** ان کو ایک دوسرے کا رفیق اور معاون بتایا گیا ہے کہ خیر کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور برائیوں کو ختم کرنے میں یہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اس بات کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ جب تک ہماری نصف آبادی متحرک نہیں ہوتی میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا قافلہ کامیابی کی منزل سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔ ایک کامیاب جدوجہد کے لیے ضروری ہے کہ ہم خواتین کے سلسلے میں بعض مروجہ تصورات سے اپنا دامن چھڑائیں۔ مثال کے طور پر ہماری بہنوں میں یہ تصور عام ہوگیا ہے کہ یہاں جو جلسہ ہورہا ہے تو اس سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ جو بہنیں جدید دانش گاہوں سے فارغ ہیں وہ یہ سمجھتی ہیں کہ ہمارے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر ہم کچھ کرسکتے ہیں تو ماڈلنگ میں جاسکتے ہیں، فیشن شو میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ہم ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی بہنوں کو واپس لانا چاہتے ہیں۔ ہم پہلے سے ان سے مطالبات نہیں کرسکتے کہ آپ اس طرح آئیں اور آپ اس طرح کا لباس اختیار کریں۔ آپ اس طرح کا تقوی اختیار کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں بھی اتنی ہی تباہی آئی ہے جتنا کہ مردوں کے حلقے میں آئی ہے، اس لیے پہلے سے کوئی مطالبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ انہیں اس حلقے میں داخل ہونے سے پہلے ہی روک دیں۔ ہم نے یہ دروازہ کھلا رکھا ہے کہ ہم آپ کو بھی اللہ اور اس کے رسول کی وراثت کا امین سمجھتے ہیں، اتنا ہی جتنا ہم ہیں اور آپ سے بھی اتنا ہی مطالبہ ہے جتنا مردوں سے ہے۔

بخاری نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بار عید کے موقع پر رسول اللہؐ نے جب مردوں سے خطاب ختم کرلیا تب آپ عورتوں کی طرف بڑھے اور آپ نے خاص طور پر عورتوں سے اپیل کی کہ وہ چادریں اللہ کی راہ میں پیسے ڈالیں اور بہت سی صحابیات نے اپنے زیورات اور پیسے خاص طور پر دیئے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہم ایک غیر اسلامی تہذیب کے نرغے میں اس طرح آگئے ہیں کہ یہ تصور ہی ختم ہوگیا ہے کہ ہماری بہنیں اپنے پاس سے کوئی پیسہ اس مشن میں لگائیں۔ وہ پوری کی پوری محتاج ہیں، شوہروں کی بھائیوں کی۔ جب شوہر گمراہ ہے، جب شوہر اسلامی لجنڈے سے غافل ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ پیسے نہیں خرچ کرتا بلکہ وہ ایسے کام سے روکتا ہے، مسجد جانے پر پابندی عائد کرتا ہے۔ جب کہ بہت واضح حدیث ہے (کہ) اللہ کی بندیوں کو مسجد جانے سے نہ روکو۔ آپ کو معلوم ہوگا حضرت عمرؓ کا اس سلسلے میں

ایک سخت اسٹینڈ تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ احادیث جو رسول اللہؐ کی ہیں جس میں ہے کہ عورتیں اپنے گھروں کے گوشے میں نماز ادا کرلیا کریں، اس سے استنباط کیا۔ انہوں نے اپنے عہد میں یہ حکم جاری کیا کہ عورتیں گھروں میں اپنی نماز ادا کرلیا کریں لیکن خود ان کی بیوی اس بات پر آمادہ نہ ہوئیں، وہ مسجد جایا کرتی تھیں۔ لوگوں نے کہا کہ عمر یہ تم کیا کرتے ہو کہ خود تمہاری بیوی پر تمہاری نہیں چلتی، تم اپنی بیوی کو نہیں روک سکتے۔ دوسری عورتوں سے کہتے ہو کہ نماز گھر پر پڑھ لیا کرو۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ کا حکم ہے کہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکو، میں کیا کرسکتا ہوں۔ عبد اللہ بن زبیر کے بارے میں یہ بات آتی ہے کہ انھوں نے رسول اللہؐ کی حدیث کے سلسلے میں اپنے والد سے کہا کہ ٹھیک ہے میں یہ بات تو تسلیم کرتا ہوں کہ عورتوں کو مسجد میں جانا چاہئے لیکن میں رات میں نہیں جانے دوں گا، کیونکہ بڑا خطرہ رہتا ہے، میں رات میں اجازت نہیں دے سکتا۔ ان کے والد خفا ہوگئے کہ تمہاری یہ جرات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں کہ مت روکو اور تم کہتے ہو کہ نہیں جانے دوں گا۔ اس بات پر وہ برافروختہ ہوگئے۔ کسی کی یہ ہمت کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ مسجد میں عورتوں کے جانے کے سلسلے میں روک سکے۔ خواہ حالات کتنے ہی خراب ہوں یا باہر خطرات کیسے بھی ہوں۔ یہ وہ بنیادی قسم کے تصورات ہیں جو الٹ پلٹ ہوگئے ہیں۔ ان کو بھی نئے سرے سے قائم کرنا ہوگا اصل بنیادوں پر۔

جب تک بہنوں کی شرکت اس مشن میں نہیں ہوتی یہ قافلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہم نے عام طور پر یہ دیکھا ہے کہ جب ہم نے بوسنیا جانے کے سلسلے میں ایک مہم چلائی اور بڑی تعداد میں نوجوانوں نے اپنے آپ کو رجسٹر کرایا۔ حیرت ہوئی کہ ہماری امت میں اب بھی ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو اپنی اسلامی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے بوسنیا تک جانے کے لیے تیار ہیں۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ ماؤں کی طرف سے، بہنوں کی طرف سے، بیویوں کی طرف سے ایک کشمکش شروع ہوگئی کہ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ یہ بوسنیا میں کیا ہونے والا ہے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ ہم اس پورے پراسس سے اپنی ماؤں اور بہنوں کو نہ تو واقف رکھتے ہیں اور نہ اس سلسلے میں انہیں Educate کرتے ہیں۔ ہماری بڑی تعداد ماؤں اور بہنوں کی بہت ہی غفلت و جہالت میں بمتلا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا انقلابی قافلہ کوئی Start نہیں لے پاتا ہے ان اجتماعات سے۔ اب ایک نمونہ رسول اللہ کی سوسائٹی سے لیجئے۔ جب قرآن کی وہ آیت نازل ہوئی "من ذاالذی یقرض اللہ قرضا حسنا" تو ابوالدرداء نے کہا کہ اے

اللہ کے رسول کیا اللہ واقعی قرض کا طالب ہے ؟ آپ نے کہا کہ ہاں، ابوالدرداء نے کہالائیے اپنا ہاتھ اور کہا کہ ابوالدرداء کا وہ باغ جس میں چھ سو درخت ہیں اپنے رب کو قرض میں دیتا ہے۔ ابوالدرداء اپنے باغ کی طرف آتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اب یہ باغ ان کی ملکیت نہیں ہے۔ باغ کے باہر سے وہ پکارتے ہیں ام درداء باہر آؤ ہم نے یہ باغ اللہ اور اس کے رسول کو قرض میں دے دیا ہے۔ ام درداء کہتی ہیں کہ ابوالدرداء تم نے بڑا اچھا سودا کیا ہے اور وہ خوشی خوشی اپنے بچوں کو لے کر نکل آتی ہیں۔ تو وجہ یہ ہے کہ وہ خاتون آپ کی مجلسوں سے مستقل فیضیاب ہورہی ہیں۔ وہ اس پورے انقلابی مشن کا حصہ بن گئی ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ ابوالدرداء نے کتنا عمدہ سودا کیا ہے اور جنت میں اپنے لئے کیا مقام متعین کرلیا ہے اس سودے سے۔ جب تک آپ بہنوں کو اس قافلے میں شریک نہیں کریں گے اور ان حدود کے اندر شریک نہیں کریں گے جس کی اسلام نے اجازت دی ہے تو ہوگا یہ کہ ہمارا قافلہ آگے بڑھنے سے پہلے ہی زوال کا شکار ہوجائے گا۔

آخری بات ہے اس سلسلے کی کہ اگر ہم واقعی مطمئن ہیں اس قرآنی لہ یجنڈے پر کہ یہی کرنے کا کام ہے تو آج کی دنیا میں ہر کام ایک بڑی منصوبہ بندی کے بعد انجام دیا جاتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ آنے والے پانچ سالوں میں دس سالوں میں اس کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس مسلم منشور پر جس کا اجراء ابھی یہاں عمل میں آیا ہے، نظری، فکری اور ایمانی طور پر متفق ہیں تو آنے والے اجلاس میں جو (Closed door) سیشن ہے۔ آج اور کل اس میں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ ہم اس مسلم منشور کو (Impliment) کرنے کے لئے اس ملک میں جاری دیکھنے کے لئے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں بالکل واضح ہوجائیں گے فکری طور پر کہ ہم اس ملک میں مسلمانوں کی سیاسی قیادت، فکری قیادت، علمی قیادت اور کسی قسم کی قیادت رسول اللہ کے علاوہ کسی اور کی قبول نہیں کرسکتے۔ ہم اس سلسلے میں ایک اسٹینڈ لیں گے جیسا کہ مسلم منشور میں اس بات کا اظہار ہوا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی سیاسی اور مذہبی زندگی کو دوبارہ منظم کرنا ہوگا اور اگر اس کے لئے موجودہ سیاسی نظام میں گنجائش نہیں ہے تو انہیں نیا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ ان کو اپنی زندگی کو (Re-organise) کرنے کے سلسلے میں اگر ایک سیاسی پارٹی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس سلسلے میں بنیادی اقدامات کرنے ہوں گے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ہم اس بارے میں واضح ہوجائیں گے کہ ہم آنے والے دنوں میں صرف

اور صرف شریعت کے مطابق اپنی زندگی کو منظم کریں گے۔ اگر اس میں کوئی چیز حلال ہے تو حلال ہے اگر حرام ہے تو دنیا کا بڑے سے بڑا عالم بھی اگر یہ باور کرائے کہ یہ چیز جائز ہوگئی ہے تو اسے نہیں ماناجائے گا۔ خدا کی کتاب کی موجودگی کے بعد اس بات کا کسی کو حق نہیں دیا جائے گا کہ کسی حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دے، کوئی شخص tonedown نہیں کر سکتا، اس حکم کو کہ اس ملک میں کفار و مشرکین کی سیاسی غلامی شریعت کی رو سے قابل قبول نہیں ہے۔ اس کو (dilute) نہیں کر سکتا۔ جو چیز جرم ہے، جو چیز گناہ ہے اس کا ہونا آج ہو یا کل ہم سے سرزد نہیں ہونا چاہیئے۔ تو اگر اس آمادگی کے ساتھ ہم قافلے کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ کا وعدہ ہے خصوصی مدد کا، فرشتے نازل کرنے کا۔

سورہ کہف میں قصہ نہیں سنایا گیا ہے بلکہ ایک واقعہ بتایا گیا ہے کہ امت کے چند نوجوان جو صرف ایک اللہ کی دعوت دیتے تھے اور اس کی ربوبیت کے علمبردار تھے پوری سوسائٹی ان کی مخالفت کرنے لگی، بلکہ جان کو خطرہ ہوگیا۔ جب اللہ نے ان کو اپنی حفاظت میں لے لیا، صدیاں گزر گئیں، وہ چند نوجوان اس غار میں محفوظ رہے اور ان کی حفاظت کا خاص اہتمام کیا گیا۔ یقین جانیئے اگر اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے ہم میں سے کچھ لوگ آگے بڑھتے ہیں تو یہ مت سمجھئے کہ اللہ آپ کو ضائع فرمائے گا۔

اس ملک میں ہر لمحے امت مسلمہ ایک غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہے، پتہ نہیں کب کس کی زندگی کا چراغ گل ہو جائے۔ یہ مت سمجھئے کہ یہ سب جو کچھ ہو رہا ہے یہ صرف ان لوگوں پر ہو رہا ہے جو اس نظام کو بدلنا چاہتے ہیں یا کسی جماعت سے وابستہ ہیں یا کسی جدوجہد سے لگے ہوئے ہیں یا کسی پارٹی کے لئے کام کر رہے ہیں، صرف انہیں کے ساتھ ہو رہا ہے بلکہ اس جدوجہد سے خوف کھانے والے لوگ بھی جان و مال کے نقصان میں اسی طرح شریک ہیں۔ بمبئی ہے، میرٹھ ہے، سورت ہے، ملیانہ، ہاشم پورہ، بھاگلپور اور مراد آباد وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے۔ آج یہ گھر ہے تو کل خود ہمارا اپنا گھر ہوگا۔ اگر نظام جبر کے خلاف اٹھنے والے ہاتھ آج قلم کر دئے گئے تو کل دوسرے ہاتھ کا اٹھنا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ اس امت میں اولوالعزم لوگوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اس امت کے حوصلہ مند نوجوانوں کو تہہ تیغ کر دیا جائے، ان کی ہڈیاں توڑ دی جائیں، ٹاڈا اور مختلف قسم کی دفعات سے ان کی عزائم پر مہر لگا دی جائے۔ اس سے پہلے کہ یہ عمل ہو ہم سب کو من حیث الامت ذمہ داری محسوس کرنی ہوگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب آپ کے اوپر ہاتھ پڑے تو وہ آخری ہاتھ ہو اور مدد کیلئے کوئی دوسرا ہاتھ نہ اٹھ سکے۔

(خطبہ صدارت : ملی پارلیامنٹ کا مذہبی اجلاس، بمبئی ۱۹۹۷ء)

مکاتیب

- ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ مجلس شوریٰ (یعنی اسلامیان ہند کی ملی پارلیامنٹ)
- ملی پارلیامنٹ کے پہلے ہمہ گیر اجلاس کے بعد ایک اہم مکتوب
- ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی قافلہ اب متحرک ہونے کو ہے
- مسلم سیاسی پارٹی کی حمایت اور نصرت کے لئے قائد ملی کا مکتوب

ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ

مجلس شوریٰ

(یعنی اسلامیان ہند کی ملی پارلیامنٹ)

برادران اسلام!

ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ صورت حال سے یقیناً آپ بے چین ہوں گے اور اس دردناک صورت حال کو یکسر بدل ڈالنے کے لیے اپنی سی جدوجہد میں مصروف بھی۔ ملک کی موجودہ صورت حال میں ایک ایسی حیرت انگیز انقلابی تبدیلی کیسے لائی جاسکتی ہے جس سے نہ صرف یہ کہ اللہ کی اس سرزمین پر غلبہ اسلام کی راہ ہموار ہو، ملک اور اہل ملک پر اللہ کی بے پناہ رحمتوں کی بارش ہو، بلکہ آنے والے دنوں میں اس میدان کار سے انقلاب اسلامی کے لیے ہراول دستہ بھی فراہم ہوسکے۔ یہ سوال مدت سے ہماری اولین توجہ اور غوروفکر کا مرکز رہا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ سبھی اہالیان ملک کی فلاح و بہبود کے لیے لازم ہے کہ اس ملک سے اخلاقی بحران کا خاتمہ کیا جائے، سماجی اور معاشی عدل کا ایک ایسا نظام ترتیب دیا جائے جہاں انسانوں کے ذریعہ انسانوں کا استحصال ختم ہو، عدل اور انصاف کا بول بالا ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب الٰہی ہدایت کے آخری سرچشمہ قرآن مجید کو اس ملک کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا جاسکے۔

بظاہر ملکی صورت حال میں ایسی ہمہ گیر تبدیلی نہ صرف یہ کہ مشکل بلکہ ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب امت اسلامیہ ہند کوئی نصف صدی سے ہندو اکثریت کے زیر تسلط جینے پر مجبور کردی گئی ہو، جہاں اپنی بقا اور تحفظ کی ۴۵ سالہ جدوجہد سے اس کے دل شکستہ اور قویٰ مضمحل ہوچکے ہوں، جہاں جمہوریت اور سیکولرزم کی بالادستی کے نام پر امت واحدہ کی حیثیت سے اس کے

ابھرنے کا امکان یکسر ختم کر دیا گیا ہو اور جہاں ایک ایسا سیاسی نقشہ ترتیب دیا گیا ہو جس میں مسلمانوں کو ایک نظریاتی گروہ کی حیثیت سے مجتمع ہونے کا امکان تو کجا خالص قومی بنیادوں پر ملکی پارلیامنٹ میں اپنی آواز کو مؤثر بنانے کے دروازے بھی بند ہو چکے ہوں اور یہ سب کھڑاگ رچا گیا ہے جمہوریت کے نام پر۔ جمہوریت جس کا سیدھا سا مطلب ہے اکثریت کی حکمرانی، بالادستی، بلکہ کہہ لیجیے ڈکٹیٹر شپ۔ تقسیم ہند کے بعد سے اکثریت کی اس بالادستی کو جمہوری لباس میں اس فنکاری کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا کہ ایک عرصہ تک مسلم دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں کو اصل حقیقت کا احساس تک نہ ہو سکا۔ خود مسلمانوں میں سیاسی رہنماؤں کی ایک ایسی نسل دریافت کر لی گئی جو ۲۰ کروڑ اہل ایمان کو اس سراب جمہوریت پر حقیقت کا یقین دلاتے رہیں۔ یہ لوگ اکثریت کے ابرو و اشارے پر چلنے کا زبردست ملکہ رکھتے تھے، ہندو اکثریت کے رنگ میں رچ بسنے جانے اور ہاتھ جوڑ کر سیاست کرنے کا فن انھیں خوب آتا تھا۔ پھر ان کے نام چونکہ مسلمانوں جیسے تھے اس لیے مسلمانوں کو یہ مغالطہ بھی رہا کہ پارلیامنٹ کی رکنیت ہو یا وزارت، یا خود صدر جمہوریہ کا اعلیٰ ترین منصب کیوں نہ ہو مسلمانوں کو ہر جگہ نمائندگی مل رہی ہے اور یہ کہ ملک کے نظام معاملات کو چلانے میں ان کا بھی عمل دخل ہے۔ دوسری طرف ان بے چارے سیاسی مسلمانوں کی حالت وہ کچھ نہ تھی جو بظاہر نظر آتی تھی۔ وزارت و صدارت کے عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود ان کی بے بسی اور کسمپرسی قابل رحم تھی۔ اپنی سیاسی بقا کی خاطر وہ ہر قسم کی ملی اور ایمانی قربانی دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے، ان کی نگاہوں کے سامنے ہندو اکثریت کا عفریت مسلسل اپنا منحوس سایہ پھیلائے جاتا تھا، اس کے خونی پنجوں کی گرفت مسلمانوں کی گردنوں پر مسلسل سخت ہوتی جاتی تھی لیکن ان بے چاروں میں دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ دو لفظ کہنے کا یارانہ تھا۔ بھلا ایک ایسی صورت حال میں جمہوریت کے نام پر پیش کیا جانے والا یہ ڈرامہ کب تک ۲۰ کروڑ مسلمانوں کے لیے باعث کشش رہتا؟ الحمدللہ کہ اس سراب کو حقیقت سمجھنے والی آنکھیں یا تو اب بند ہو چکی ہیں یا ان کے رویے میں حیرت انگیز تبدیلی آچکی ہے۔ ہماری نئی نسل نہ صرف یہ کہ اس ۵۴ سالہ سیاسی تاریخ سے سخت نالاں ہے بلکہ وہ اس سیاسی رویے کی بھی باغی ہے جس میں صحیح الفکر مسلمانوں کے لیے شرکت کے سارے دروازے یکسر بند کر دئے گئے ہیں۔

برادران اسلام!

یہ اکثریت کے ۵۴ سالہ سیاسی استحصال کا فیضان ہی ہے کہ آج امت اسلامیہ ہند شدید اضطراب

سے دوچار ہے، اس کی کیفیت زخموں سے چور اس ادھ موئے شخص کی ہوگئی ہے جو مدت سے مسلسل زخم سہتے رہنے کے بعد اچانک بلبلا اٹھا ہو اور جو ظالم کے ظلم سے تنگ آکر اپنی بے سروسامانی کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے اپنے ناخونوں اور دانتوں سے حالات کا رخ موڑ دینے کا عزم کر چکا ہو اور جو اب سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار بیٹھا ہو۔ جن لوگوں کو امت مسلمہ کی ذہنی اور قلبی کیفیت کا ذرا بھی اندازہ ہے وہ اس حقیقت سے یقیناً واقف ہوں گے کہ ہماری نئی نسل حالات کا رخ موڑنے کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ اسے نہ تو اب کوئی بزدل ناصح کسی انقلابی قدم سے روک سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی نئے سیاسی جال میں پھنسائی جاسکتی ہے۔ البتہ تشویش کی بات یہ ہے کہ تبدیلی کی اس شدید خواہش کے جلو میں اس کے پاس نہ تو کوئی واضح پروگرام ہے اور نہ ہی کوئی ایسی صاحب بصیرت قیادت جو ایک انقلابی تبدیلی کا بھرپور وجدان رکھتی ہو اور اسے عملی دنیا میں برتنے کے سلیقے سے بھی واقف ہو۔

ملکی صورت حال میں ایک انقلابی تبدیلی کیسے لائی جاسکتی ہے اور یہ کہ ایک منتشر پریشان حال امت کو ایک انقلابی گروہ کی حیثیت سے کس طرح متحرک کیا جاسکتا ہے؟ اس سوال پر علمی انداز سے غور و فکر کے لیے ۱۹۸۵ء میں ادارہ برائے جملہ امور امت اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ الحمدللہ کہ برسہا برس کے مسلسل غور و فکر کے بعد ادارہ نے انقلابی عمل کی ایک زبردست حکمت عملی ترتیب دی ہے اور مختلف محاذ پر باقاعدہ کام کا آغاز کر دیا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں "غلبہ اسلام۔ ہندوستان میں احیائے اسلام کا منشور" کی اشاعت کے بعد سے اب تک اس کام کی مزید تفہیم و تشریح پر بہت سا مواد شائع ہو چکا ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی مسلم مسائل کی تفہیم اور اس سلسلے میں عملی اقدام کے تعین کے لیے ۱۶/مارچ ۱۹۹۱ء کو نئی دہلی میں ہندوستانی مسلمانوں کا ایک ملک گیر کنونشن منعقد کیا گیا تھا جس میں امت کے مختلف دھڑوں کے اشتراک و تعاون سے امت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کے امکانات کا جائزہ لیا گیا۔ الحمدللہ کہ ہمیں امت کے مختلف گوشوں، تنظیموں، اداروں، مسلم دانشوروں اور علماء کرام کی صفوں سے بے پناہ تعاون ملا اور اس مشترکہ جدوجہد کا جس جوش و ولولے سے استقبال کیا گیا اسے دیکھتے ہوئے ہمارے سر سجدہ شکر سے جھک گئے، ہماری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

جو لوگ اس تاریخی کنونشن میں شریک تھے انھیں یاد ہوگا کہ کنونشن کا اختتام ایک طویل قرارداد کی منظوری پر ہوا تھا جس کے نفاذ کی تمام تر ذمہ داری ادارہ برائے جملہ امور امت اسلامیہ پر ڈال دی گئی

تھی۔ ہم اس گراں بار ذمہ داری کے متحمل ہرگز نہ تھے لیکن ایک طرف تو آپ کا اصرار تھا اور دوسری طرف تعاون کا وعدہ اور رقت آمیز دعائیں۔ ہم نے بہرحال اللہ کے بھروسے اس کام کو انجام دینے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ کنونشن کا اختتام دعاؤں پر ہوا تھا جس میں ہم نے اپنی جدوجہد میں اللہ کی ہدایت اور نصرت طلب کی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی عہد کیا تھا کہ اتحاد امت کے لیے کی جانے والی ہر کوشش کو اپنا بھرپور تعاون دیں گے۔

آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ اتحاد امت اور ہندوستان میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے ضمن میں کنونشن میں ایک اہم قرارداد منظور کی گئی تھی جس میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک نمائندہ مجلس شوریٰ کی تشکیل کی بات کہی گئی تھی۔ اس سلسلے میں اب تک جو پیش قدمی ہوسکی ہے ہم اس سے آپ کو مطلع کردینا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔

شوریٰ کی تشکیل

۱۔ متعلقہ قرارداد کی روشنی میں ایک نمائندہ مجلس شوریٰ کے واضح خدوخال کے تعین کے لیے جون ۱۹۹۱ء میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

۲۔ کمیٹی نے جلد ہی اتحاد امت کے امکانات اور اس راہ کی دشواریوں کا جائزہ لینے کے بعد شوریٰ کا ایک مجوزہ خاکہ فراہم کردیا جس کی تفصیل یوں ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی مجلس شوریٰ کا مجوزہ فارمولا

مسلم شہروں کے نمائندے

(۱) ہندوستان میں ۲۵۲ ایسے شہر آباد ہیں جنھیں مسلمانوں کی قابل ذکر آبادی والا شہر کہا جاسکتا ہے یا جسے مسلم ہندوستان میں دینی اور ثقافتی اعتبار سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان شہروں سے کل ۳۱۶ نمائندے مجلس شوریٰ کے رکن نامزد کیے جائیں گے۔

نامزدگی کے لیے مطلوبہ معیار

(۱) فرائض کی ادائیگی، کبائر سے اجتناب اور معاملات میں صاف ہو۔

(ب) مقامی سطح پر اچھی شہرت کا حامل ہو۔

(ج) خواہ کسی بھی دینی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، اپنی وسیع النظری کے لیے دوسرے حلقوں میں بھی معتبر گردانا جاتا ہو۔

(د) مقامی سطح پر فیصلوں کے نفاذ کی صلاحیت رکھتا ہو۔

مسلم تنظیموں کے نمائندے

ملک گیر مسلم تنظیموں کے لیے دو، اور صوبائی سطح کی متحرک تنظیموں کے لیے ایک ایک نشست مخصوص کی جائے گی۔ نمائندوں کی نامزدگی کا حق متعلقہ تنظیم کو ہوگا۔

صوبائی مسلم قیادت

صوبائی قیادت کی نامزدگی میں بھی شہروں کے نمائندوں کے معیار کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ قابل ذکر مسلم آبادی کے صوبوں سے ایک سے زیادہ اور بقیہ صوبوں یا یونین ٹریٹریز سے کم از کم ایک نمائندہ لیا جائے گا۔

علمی اداروں کی نمائندگی

ملک بھر میں امت اسلامیہ کے مسائل پر غور و فکر کرنے والے بے شمار چھوٹے بڑے ادارے موجود ہیں۔ پہلے مرحلے میں ۲۵ ایسے اداروں کو شوریٰ میں Observer Status حاصل ہوگا۔

ممتاز مسلم صحافیوں اور اخبارات کی نمائندگی

معروف مسلم صحافیوں، تجزیہ نگاروں اور قابل ذکر اخبارات کے مدیران کو بھی مشاہدین کا درجہ Observer Status حاصل ہوگا۔

منتخب شدہ اراکین

اپنی ساری کوششوں کے باوجود عین ممکن ہے کہ بعض نسبتاً غیر معروف لیکن انتہائی اہم شخصیات ہماری نامزدگی یا انتخاب کے عمل سے باہر رہ جائیں۔ تشکیل شدہ مجلس شوریٰ کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ باہمی مشوروں سے ایسے لوگوں کو منتخب کرلے۔

مجلس شوریٰ کے اراکین اور مشاہدین کی مجموعی تعداد کچھ اس طرح ہوگی۔

۱۔ مسلم شہروں کے نمائندے

۲۔ مسلم تنظیموں کے نمائندے		۲۱
۳۔ صوبائی مسلم قیادت		۵۰
(ا) قابل ذکر مسلم اکثریت والے صوبے	۳۰	
(ب) دیگر صوبے اور یونین ٹریٹریز	۲۰	
۴۔ علمی اداروں کی نمائندگی (مشاہدین)		۲۵
۵۔ مسلم پریس (مشاہدین)		۲۵
۶۔ شوریٰ کے ذریعہ منتخب شدہ اراکین		۲۰
۷۔ تاسیسی اراکین؟ ممتاز علمائے کرام		۲۰
مجموعی تعداد		۴۷۷

اس حقیقت کے پیش نظر کہ امت اسلامیہ ہند کی تقریباً ۹۰ فیصد آبادی کسی گروہی یا جماعتی حصار سے باہر ہے اور یہ کہ موجودہ مسلم تنظیمیں صرف ایک قلیل مسلم آبادی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی مجلس شوریٰ کے دروازے ان لوگوں پر بھی کھول دئے گئے ہیں جو کسی مخصوص گروہی شناخت کے بجائے امت کی اجتماعی شناخت برقرار رکھتے ہوئے ملک کے مختلف حصوں میں قابل ذکر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ شوریٰ کے مجوزہ فارمولے میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ مجوزہ مجلس شوریٰ متخالف اور متحارب مسلم جماعتوں کا اجتماع بننے کے بجائے ایک واقعی متحدہ پلیٹ فارم کی حیثیت سے ابھرے۔

مختلف شقوں کے تحت مخلص مسلم قیادت کی نمائندگی/نامزدگی کی غرض سے بڑی تعداد میں "دردمندان امت کے نام ڈاکٹر راشد شاز کا ایک اہم مکتوب" روانہ کیا گیا اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچا جاسکے۔

اہم مکتوب کے جواب میں بڑے حوصلہ افزا خطوط موصول ہوئے اور امت کی مختلف سطح کی قیادت نے اپنی شمولیت اور تعاون کا یقین دلایا۔ اس نوعیت کے خطوط اب بھی موصول ہو رہے ہیں۔

مجوزہ مجلس شوریٰ کو زیادہ فعال اور موثر بنانے کے پیش نظر ہم نے دردمندان امت سے

مشورے بھی طلب کیے تھے اور مفید ناموں کی ایک مختصر فہرست بھی طلب کی تھی۔ الحمدللہ کہ اس ضمن میں بھی آپ نے توجہ فرمائی۔ لیکن بعض ناموں کے ساتھ مکمل پتے درج نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان حضرات سے رابطہ قائم نہ کرسکے۔ آپ کے مشورے ستمبر ۱۹۹۲ء میں منعقد ہونے والی مشاورتی کونسل میں رکھے جائیں گے اور ان سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔ انشاء اللہ

ہم آپ سے کیا چاہتے ہیں؟

ہندوستانی مسلمانوں کی ایک متحدہ قیادت کی تشکیل کا کام انتہائی نازک، حساس اور مشکل ہے۔ آزاد ہندوستان میں یہ پہلا موقع ہے جب تمام گروہی، جماعتی اور مسلکی وابستگیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ایک اجتماعی قیادت کی تشکیل کی کوشش اتنے ہمہ گیر انداز سے کی جارہی ہے۔ اس تجربے کی کامیابی ہندوستانی مسلمانوں کی صورت حال میں ایک بڑی تبدیلی کا نقطہ آغاز بن سکتی ہے۔ آپ کی ذراسی توجہ اور فوری تعاون اس مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ ذرا غور کیجیے آپ فی الوقت کیا کرسکتے ہیں۔

(۱) شوریٰ کے مجوزہ فارمولے کا جائزہ لیجیے اور یہ بتائیے کہ مجوزہ مجلس میں آپ کی نمائندگی کس شق کے تحت ہوسکتی ہے؟ اگر اس سے قبل آپ تک ہمارا کوئی مکتوب نہ پہنچا ہو تو اسے ہمارے سہو اور وسائل کی کمیابی پر محمول کیجیے۔ اس تحریر کو اپنے نام خصوصی خط تصور کرتے ہوئے تعاون کا خط ارسال فرمائیے اور ساتھ ہی اپنے مختصر کوائف اور ملی خدمات کا تعارف بھی ارسال کیجیے تاکہ ہم شوریٰ کے بھرپور اجلاس کے موقع پر شائع ہونے والی ڈائرکٹری میں اسے شامل کرسکیں۔

(۲) اگر آپ کسی نسبتاً غیر معروف لیکن متقی اور مخلص مسلم قیادت کی شمولیت کے خواہاں ہیں تو ان تک ہمارے اس مطبوعہ مکتوب کی فوٹو کاپی ارسال کردیں اور ساتھ ہی ہمیں بھی ان کے مکمل کوائف اور پتے سے آگاہ فرمائیں تاکہ ہم اس مہم میں ان کی خدمات سے استفادہ کرسکیں۔

(۳) آپ جن شہروں میں مخلص، متقی اور متحرک مسلم قیادت سے واقف ہوں ان کے بارے میں ہمیں بھی تحریر فرمائیں تاکہ ہم ایسے لوگوں کی خدمات مستعار لے سکیں۔

(۴) شوریٰ کے خاکے کو حتمی شکل دینے اور نمائندگان کی فہرست کی ترتیب کے لیے مشاورتی کونسل

کا اجلاس نومبر ۱۹۹۲ء میں ہونا طے پایا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اوائل نومبر تک آپ کے مشورے، شمولیت کا خط اور اگر آپ کسی شخص کی شمولیت کے خواہاں ہیں تو مذکورہ شخص کے بارے میں متعلقہ تفاصیل ارسال فرمادیں۔

(۵) شوریٰ کے سلسلے میں آپ کے پاس وقتاً فوقتاً پوسٹرس، ہینڈبل، اسٹیکرس ارسال کیے جائیں گے آپ اس کی تشہیر میں بھرپور حصہ لیجئے۔ اس نوعیت کے پوسٹرس مسلم آبادی کے علاقوں میں نمایاں مقامات پر چسپاں کرادیجئے۔

(۶) ۷۷ افراد پر مشتمل شوریٰ کا بھرپور اجلاس انشاءاللہ کسی مناسب مقام پر منعقد کیا جائے گا۔ اس سے پہلے ہم بہت سا بنیادی کام کرلینا چاہتے ہیں۔ آپ کا تعاون ہماری رفتار کو تیز کر سکتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی مجلس شوریٰ کے باقاعدہ اجلاس کی تفصیلات جلد ہی منظر عام پر آجائیں گی۔

ہندوستانی مسلمانوں کی آرزوؤں کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو اور ہمیں شہادت سے سرفراز فرمائے۔ آمین

آپ کا بھائی

راشد شاذ

ملی پارلیامنٹ کے پہلے ہمہ گیر کل ہند اجلاس کے بعد دردمندانِ امت کے نام قائد ملی کا ایک اہم

مکتوب

محترم / محترمہ! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

ایک ایسی صورت حال میں جب پوری ملت اسلامیہ ہند پر مایوسی، غمناکی اور شکستہ دلی کا سخت ماحول طاری ہو، جب ہر طرف سے کچھ کرنے کی خواہش کا اظہار تو ضرور ہو رہا ہو لیکن پوری امت کسی واضح لائحہ عمل سے یکسر محروم ہو اور جب امت کے بڑے بوڑھے کسی انقلابی لائحہ عمل سے خوف کھاکر ذلت کی سابقہ زندگی کو ہی معتبر گرداننے لگے ہوں ایسی نازک گھڑی میں ملی پارلیامنٹ کے پہلے ہمہ گیر کل ہند اجلاس کا انعقاد اللہ تعالی کا ایک خاص فضل ہے۔ یہ محض اس کا فضل ہے کہ شدید گرمی، طرح طرح کی مخالفتوں، الزامات اور اندیشوں کے باوجود دلی کی سرزمین پر ملی پارلیامنٹ کے اجلاس کا انعقاد ممکن ہو سکا۔ یقیناً رب کریم کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

اجلاس کے انعقاد سے قبل ہی مختلف سیاسی پارٹیوں اور سیکولر سیاسی رہنماؤں کی جانب سے ہمیں مختلف قسم کی دھمکیاں موصول ہونے لگی تھیں، پھر اسی دوران مختلف انداز سے ہماری قیمتوں کے تعین کی کوشش کی گئی لیکن اللہ کی نصرت کے سہارے ہمارے رفقاء و احباب نے ہر محاذ پر عزم و استقامت کا مظاہرہ کیا اور مخالفین کی کوششوں سے بددل ہونے کے بجائے مثبت انداز سے اپنے کام میں لگے رہے۔ اجلاس کی تاریخوں کے بار بار التوا اور اس دوران مسلسل بڑھتی ہوئی گرمی کی وجہ سے ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب ہمارے احباب کے حوصلے پست ہونے لگے اور انہیں بڑھتی ہوئی گرمی کے پیش نظر دلی میں بڑی تعداد میں اراکین اور حامیان ملی پارلیامنٹ کا اجتماع مشکل معلوم ہونے لگا، لیکن

جب بھی ہم نے ہمت نہ ہاری اور یہ سوچا کہ اگر اللہ کو ملی پارلیامنٹ سے کوئی بڑا کام لینا ہے تو موسم کے تغیرات بھی یقیناً اس کے ہاتھ میں ہیں پھر بھلا وہ کیوں نہ اپنے کمزور بندوں کا خیال کرے گا۔ ہماری مسرت کی انتہا نہ رہی جب اجلاس سے کئی دن قبل سے ہی دہلی کا موسم حیرت انگیز طور پر بہتر ہونے لگا اور کم از کم اجلاس کے انعقاد تک سخت ترین ایام کا درجہ حرارت دہلی کی ماحولیاتی ڈائری سے غائب رہا۔ جس سے ہم جیسے کمزور ایمان والوں کا ایمان نہ صرف یہ کہ مضبوط ہوا بلکہ ہمارے کارکنان کو انتظامات کی دوڑ دھوپ میں بھی سہولت ہوئی۔

الحمدللہ کہ اجلاس کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا۔ موسم کی شدت کے باوجود بیرون دہلی سے ۳۲۲ اراکین ملی پارلیامنٹ کی شرکت ہوئی جو ۱۴۹ شہروں سے تشریف لائے تھے۔ ان میں علماء بھی تھے اور دانشور بھی، جوان بھی تھے اور ضعیف العمر بھی۔ بعض حضرات اپنی پیرانہ سالی اور خرابی صحت کے باوجود ریزرویشن کے بغیر جس طرح دور دراز کے شہروں سے تشریف لائے تھے ان کے اس جذبہ عمل نے ہمارے دلوں کو چھولیا اور یقیناً ہمارے نوجوان رفقاء کو ان مخلصین اسلام کے عمل سے بڑا حوصلہ ملا۔ اللہ آپ حضرات کی مساعی کو قبول فرمائے اور ان صعوبات کے لئے، جو آپ حضرات نے اس راہ میں اٹھائی ہیں، اجر عظیم عطا فرمائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ دہلی میں ہم آپ کے قیام و طعام کا خاطر خواہ انتظام نہ کر پائے اور نہ ہی ہمارے رفقاء کو آپ حضرات پر اس طرح توجہ دینے کا موقع ملا جیسا کہ آپ کا حق تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو ہماری کوتاہی تھی اور کچھ مخالفتوں کا وہ طوفان جس نے ہمارے کارکنان کو مختلف محاذ پر توجہ کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ہماری ان مجبوریوں کے پیش نظر ہماری کوتاہیوں سے درگذر فرمائیں گے۔

جس محاذ پر ہمیں سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے وہ یقیناً ذرائع ابلاغ کا شعبہ ہے جہاں ہر دن کچھ نہ کچھ ہمارے خلاف ضرور ہی لکھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اردو کے بیشتر اخبارات یا تو کسی جماعت سے متعلق ہیں یا کسی سیاسی شخصیت کے زیر اثر ہیں، انہیں بہرحال یہ گوارا نہیں کہ مسلمانوں میں کوئی نئی قوت اعتبار حاصل کر لے۔ لہٰذا اجلاس سے کچھ قبل ہی دہلی کے اردو اخبارات میں مخالفانہ پروپیگنڈے کا ایک سلسلہ جاری کر دیا گیا۔ کسی نے اس اجلاس کے پیچھے C.I.A. کا ہاتھ تلاش کیا تو کسی نے اسے کانگریس یا جنتادل کے ذریعہ کھڑا کیا گیا نیا تماشہ بتانے کی کوشش کی۔

قائد ملی پارلیامنٹ پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے اور گھٹیا بہتان تراشی پر مشتمل مراسلات کا ایک سلسلہ اخبارات میں جاری ہوگیا۔ ادھر ہندی کے اخبارات مسلسل اس کوشش میں رہے کہ قائد ملی پارلیامنٹ پر ملک دشمن سرگرمیوں کے الزامات لگاکر مطعون کیا جائے، پھر بعض چیزوں کو بڑھا چڑھا کر سنسنی خیز انداز میں شائع کیا گیا۔ انگریزی اخبارات کا رویہ گو کہ محتاط رہا لیکن الزامات اور اتہامات کی بارش میں اس نے بھی کچھ کسر نہ چھوڑی۔ مثال کے طور پر Indian Express نے اپنے ۲۶/ مئی کے اداریے میں ملی پارلیامنٹ کی سرگرمیوں کو ملک میں فرقہ وارانہ جذبات بھڑکانے اور کشمیر کے مسئلے پر منظور کی جانے والی قرارداد سے پاکستان کو تقویت پہنچنے کا اندیشہ ظاہر کیا۔ مزید یہ کہ جو بات ہماری قرارداد کا حصہ نہیں تھی اسے بھی قرارداد بتاکر ہمارے سر منڈھنے کی کوشش کی گئی۔ گویا ملی پارلیامنٹ کا پورا پروگرام ان حضرات کو ملک دشمن نظر آیا اور اجلاس کے انعقاد سے ایک خانہ جنگی کی ابتداء محسوس ہونے لگی۔ کچھ یہی حال انگریزی کے دوسرے اخبارات کا بھی رہا جنہوں نے بار بار ملی پارلیامنٹ کے داعی کی کردار کشی پر مضامین چھاپے۔ غیر ملکی خبر رساں ایجنسیاں بھی اس مہم میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ بی بی سی ریڈیو اور ٹی وی نے جن باتوں کو ہماری طرف منسوب کیا وہ سرے سے ہماری بات ہی نہ تھی۔ .CNN Zee T.V اور یورپ و امریکہ کی دوسری ٹیلی ویژن ایجنسیوں کا رویہ نسبتاً بہتر رہا، البتہ مخالفتوں کے اس طوفان میں اندرون ملک یہ ایجنسیاں ہماری تصویر کی درستگی میں کوئی مؤثر رول ادا نہ کرسکیں۔

بہرحال ہم ان مخالفتوں سے ہرگز دل شکستہ نہیں اور نہ ہی ان لوگوں میں سے ہیں جو حالات کی سنگینی سے گھبراکر اس سخت راستے سے منہ موڑلیتے ہیں۔ ہمیں اللہ کی نصرت پر تکیہ ہے اور یقین کامل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے رفقاء کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ ہمارے لئے یہ نکتہ خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ آخر ملی پارلیامنٹ کی اتنی زور وشور سے مخالفت کیوں کی جارہی ہے؟ آخر اس نئی ابھرتی ہوئی قوت سے منظم و مستحکم نظام کو اپنے در و بام کیوں ہلتے محسوس ہورہے ہیں؟ اس سوال کا جواب آپ کو ہمارے کتابچوں میں ضرور مل جائے گا۔ پہلی بات تو یہ کہ کسی انبیائی انقلابی دعوت کے خالص ہونے کا امتحان ہی یہ ہے کہ اس کے محض اعلان سے ہی باطل کے در و بام لرزنے لگیں۔ اسلام دشمن قوتوں کو اپنی موت یقینی نظر آئے گویا انقلابی مشن جتنا خالص ہوگا اس کی مخالفت بھی اسی شدت سے کی جائے گی،

ورنہ آپ دن رات اسلامی انقلاب کا راگ الاپتے رہیں کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ آپ سے تعرض کرے۔ دوسری بات یہ کہ ہماری اس دعوت نے خود امت اسلامیہ کے اندر ہوا و ہوس کی دوکان سجانے والوں اور امت کے سیاسی بازی گروں کے لئے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔ اس کے علاوہ ان علماء کو بھی اپنا اعتبار کھوتا ہوا محسوس ہورہا ہے جو مدت سے اس ملک میں امت کو سلائے رکھنے میں اپنی عافیت جانتے رہے ہیں اور جنہوں نے مدت سے اس مکروہ عمل کو اسلام اور شریعت کے حوالے سے معتبر بنائے رکھا ہے۔ کہ اگر واقعی انقلابی عمل کا آغاز ہوگیا تو ان ناانقلابیوں اور مردہ زندگی جینے والے قائدین کے ہاتھوں سے خود ہی قیادت کی باگ ڈور نکل جائے گی۔ رہی موجودہ سیکولر پارٹیاں تو ان کے لئے کسی انقلابی مشن سے نہ صرف یہ کہ کوئی سودا کرنا ممکن نہیں بلکہ امت کے انقلابی احیاء سے انہیں خود موجودہ سیاست کا یہ مکروہ ڈرامہ ختم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس بات سے خوب واقف ہیں کہ اگر مسلمانوں کو اپنی واقعی حیثیت کا احساس ہوگیا اور الٰہی ہدایات کے زیر اثر اگر کوئی واقعی انقلابی مشن کا کارواں چل نکلا تو اس ملک کے سیاسی اقتدار پر ان کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ پھر بھلا ملی پارلیامنٹ کے قیام کو ایک بڑا خطرہ کیوں نہ تصور کیا جائے۔

ملی پارلیامنٹ کے قیام سے گویا اسلام دشمن کیمپوں میں کھلبلی سی مچ گئی ہے جس کا اندازہ ہندو احیاء پرستوں کے بیانات اور ان الزام تراشیوں سے ہوتا ہے جو ان حضرات نے مسلسل احالیان ملی پارلیامنٹ کے خلاف جاری رکھی ہوئی ہیں۔ ان کے چوٹی کے قائدین اور ان کے زیر اثر نکلنے والے ہندی اور انگریزی کے اخبارات نے ملی پارلیامنٹ کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والی مہم چھیڑ رکھی ہے۔ ادھر بھارتیہ جنتا پارٹی کے بیانات اور ان کے رہنماؤں کی دروغ گوئی کا مقصد بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ احیائے امت کی اس تحریک کو کسی بڑی قوت میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ چنانچہ ملی پارلیامنٹ پر وہ سارے الزامات عائد کئے جاچکے ہیں جو اسے دستور کی نظر میں ایک ممنوعہ تنظیم قرار دئے جانے کے لئے ضروری ہوسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ہمارے بعض احباب اس صورت حال سے شکستہ دل ہوجائیں اور انہیں ملی پارلیامنٹ کا اقدامی انقلابی منصوبہ مخالفانہ پروپیگنڈے کی فضا میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہو۔ انہیں ایسا لگے گویا منظم اور مستحکم باطل کو اکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں، البتہ جو لوگ انقلابی تحریکوں کے مزاج سے واقف ہیں انہیں خوب معلوم ہے کہ ہر زمانہ میں مستحکم نظام کی زبردست پروپیگنڈہ

مشینری کے باوجود مٹھی بھر انقلابیوں نے اپنی دعوت کو عوامی رخ دینے میں کامیابی حاصل کی ہے اور بالآخر بے بنیاد پروپیگنڈے کے غبارے سے ہوا نکال کر اس نظام کو الٹ پھینکا ہے۔

ذرا غور کیجئے! دنیا کی سب سے بڑی انقلابی تحریک اور دنیا کے سب سے بڑے انقلابی رسولؐ کے بارے میں کیا کچھ نہیں مشہور کیا گیا۔ کسی نے آپ کو کاہن جانا تو کسی نے ساحر کی حیثیت سے بدنام کرنے کی کوشش کی۔ پروپیگنڈے کی قوت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ کلام الٰہی کو سننے کے لئے دل تو کیا کان بھی کھلے نہ ملے۔ ایک ایسی فضا بنائی گئی جس کے زیر اثر معصوم سادہ لوح لوگوں نے کلام الٰہی کی تلاوت کے وقت کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ انتہائی سنجیدہ دعوت کا اس انداز سے تمسخر اڑایا گیا اور قائد حقیقی کی انتہائی باوقار صادق اور امین شخصیت کو ایک ایسے مقام پر لے آیا گیا جہاں گلیوں کے آوارہ لونڈے آپؐ کے پیچھے تالیاں پیٹتے پھریں اور آپ کو بے وقعت باور کرانے کے لئے پتھروں سے لہولہان کر کے طائف کے شہر سے دھکے مار کر نکال دیں۔ لیکن ان زبردست مخالفانہ پروپیگنڈوں اور اوچھے ہتھکنڈوں کے باوجود، جس سے وقتی طور پر انقلابی دعوت کی ہوا اکھڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی، انقلابی مشن کا یہ قافلہ روکا نہیں جاسکا۔ جس کسی نے بھی انقلابی مشن کی مخالفت میں کوئی بات سنی اس کے اندر براہ راست حقیقت جاننے کی خواہش ضرور پیدا ہوئی اور جو کوئی بھی حاملین مشن کے براہ راست رابطے میں آگیا اس کے لئے یہ مشکل نہ رہا کہ وہ اپنی ساری قوت قائد حقیقی کے قدموں میں لاکر ڈال دے۔ قیامت تک اسلام کے غلبے کے لئے جو تحریک بھی اٹھے گی اسے اس نازک مرحلے سے لازماً گذرنا ہوگا البتہ حامیان انقلاب کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ وہ اپنے حرکت و عمل اور ذاتی اور ملی شناخت کی تشکیل نو میں قائد حقیقی کی حکمت عملی کے انطباق کا کس حد تک سلیقہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی مرحلے میں ہمیں دشمنوں کی ریشہ دوانیاں، اپنوں کی نامہربانیاں اور مخالفانہ الزامات و اتہامات کی مکروہ فضا میں خود اپنی شناخت تحلیل ہوتی ہوئی محسوس ہو تو اس صورت حال سے ڈر جانے، خوف کھانے یا ہمت ہارنے کے بجائے ہر لمحہ اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہم اپنے انداز کار کو قائد حقیقی کی حکمت عملی سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرلیں کہ یہی ہماری کامیابی کی ضمانت ہے۔

مجھے اس بات کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ ملی پارلیامنٹ کے انقلابی مشن کو روز اول سے اللہ تعالیٰ کا خصوصی تعاون حاصل رہا ہے۔ مجھے ہر لمحہ اس جدوجہد میں ایک معاون، مونس و غم خوار، شفیق اور

بے پناہ خیال رکھنے والے خدا کی رفاقت کا احساس ہوتا رہا ہے۔

عزیز بھائیو اور بہنو! ہمیں اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں کا خوب خوب اندازہ ہے۔ یقیناً ملی پارلیامنٹ کا انقلابی مشن ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ ہم جیسی گنہگار روحوں اور کمزور اعصاب والے اشخاص کے لئے یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ ایک مجبور اور بے بس امت میں زندگی کی نئی روح پھونکنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور پھر اس مشن میں مختلف حوصلہ شکن تجربات اور تکلیف دہ مراحل کے باوجود ثابت قدم بھی رہ سکیں۔ یقیناً اللہ جسے چاہتا ہے توفیق اور حوصلہ دیتا ہے اور مشکل ترین مراحل میں بندے کی پکار پر آسانیاں پیدا کر دیتا ہے، یقیناً اللہ بڑا کارساز ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں کام کی زیادتی کے ساتھ ہی نصرت الٰہی کی مقدار بھی بڑھتی جائے گی۔

جن لوگوں نے اس دو روزہ اجلاس میں شرکت کی ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ ہماری یہ کوشش رہی کہ اس اجلاس سے ایک واضح لائحہ عمل لوگوں کے سامنے آسکے اور ایک نئے انداز سے کام کرنے پر دردمندان امت کے قلوب مطمئن ہو سکیں۔ ہم نے اسی لئے آپ حضرات سے خاص طور پر گذارش کی تھی کہ اجلاس میں اپنی بے لبسی کا ماتم کرنے کے بجائے مستقبل کی منصوبہ سازی پر توجہ دیں اور خواہ مخواہ کی خطابت اور زور بیانی میں وقت ضائع نہ کریں۔ مسلمانوں کے روایتی اجلاس اور اس میں ہونے والی جذباتی تقریروں کے پس منظر میں یقیناً ہمارا تجربہ حوصلہ افزا رہا کہ اراکین ملی پارلیامنٹ کی قابل ذکر تعداد نے اپنے مشوروں کو تحریری شکل میں پیشگی ارسال کر دیا تھا، البتہ ہمیں افسوس ہے کہ بعض مخلصین خطابت اور زور بیانی سے پوری طرح اپنا دامن نہ بچاسکے اور بعض حضرات نے موضوع کے اندر رہ کر اظہار خیال کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ توقع ہے کہ انشاء اللہ مستقبل میں ہم ان کوتاہیوں سے اپنا دامن بچاسکیں گے۔ اللہ ہمیں نیک اور مفید عمل کی توفیق دے۔

یہ حقیقت ہماری نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہو کہ ہماری صلاحیت اور مال و دولت سب کچھ اللہ کی امانت ہے لہٰذا اس کے بہتر اور مفید استعمال کی ہر لمحہ کوشش کی جانی چاہئے۔ یاد رکھئے! ملی پارلیامنٹ کی پشت پر مخلص مسلمانوں کی افرادی قوت، غریب مسلمانوں کی گاڑھی کمائی اور مقہور و مجبور امت اسلامیہ کی آہوں اور آرزوؤں کی ایک دنیا موجود ہے۔ اس کے ایک ایک اقدامی منصوبے کے پیچھے نہ جانے کتنوں کی آہ سحرگاہی ہے۔ پھر یہ کہ جن حضرات کے تعاون سے ملی پارلیامنٹ کا قافلہ

آگے بڑھ رہا ہے وہ امت کی سعید روحیں ہیں۔ یہ وہ بیش قیمت سرمایہ ہے جس سے امت کا مستقبل وابستہ ہے۔ بھلا ایسی مقدس قوت کو غیر مفید کاموں یا محض جذباتی تقریروں میں الجھائے رکھنا کیوں کر مناسب ہوگا۔ لہٰذا ہماری ہر ممکن کوشش ہونی چاہئے کہ مقامی نشستیں ہوں یا کل ہند سطح کی عوامی ریلی، ہر ایک سے ممکنہ حد تک غلبہ اسلام کی سمت میں پیش قدمی کا کام ضرور کیا جائے کہ اگر امت میں پائے جانے والے مٹھی بھر انقلابی نفوس کی قوت بھی غلبہ اسلام کے قافلے کو آگے نہ لے جاسکے تو بھلا اس کام کو اور کون انجام دے گا؟

میں بار بار اپنی تحریروں میں اس بات کا اعادہ کرتا رہا ہوں کہ وحدت اسلامی کی تشکیل نو کے لئے مغربی طرز کا کوئی تنظیمی ڈھانچہ کارگر نہیں ہوسکتا۔ انقلاب اسلامی کے مشن کو آگے بڑھانے اور امت کو سابقہ بنیادوں پر پھر سے قائم کرنے کے لئے وہ تنظیمی ڈھانچے مؤثر نہیں ہوسکتے جن کا ارتقاء غیر متقی معاشرے میں ہوا ہو اور جو اپنے اندر ایک خاص قسم کے معاشرے کو چلانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ مغربی طرز کی جمہوریت کو جب بھی اسلامی تحریکوں میں برتنے کی کوشش کی گئی نتیجہ کنفیوژن اور ناکامی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ لہٰذا جو لوگ اسلامی انقلاب کے آرزومند ہوں اور جو مستقبل میں ایک خالص اسلامی معاشرے کے قیام کا خواب دیکھ رہے ہوں انہیں چاہئے کہ بالکل ابتدائی مرحلہ سے اپنے کارواں کو اسلامی خطوط پر منظم کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ملی پارلیامنٹ کی ہیئت ترکیبی اور اسے بنیان مرصوص کی حیثیت سے متحرک رکھنے کے لئے جمہوری کے بجائے شورائی طریقہ کار کو اپنے لئے منتخب کیا ہے۔

مغرب کے زبردست پروپیگنڈہ کے زیر اثر بعض ذہنوں میں یہ تاثر عام ہے کہ جمہوریت اور شورائیت گویا ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ پروپیگنڈے کی اثر انگیزی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ عصر حاضر کی بعض اسلامی تحریکوں نے جمہوری طرز تنظیم کو عین اسلام سمجھ کر قبول کیا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان تنظیموں کے خالص اسلامی لب و لہجے کے باوجود ان کے یہاں بھی وہی تماشے دیکھنے کو ملتے ہیں جو خالص دنیادارانہ تنظیموں کی شناخت ہوتے ہیں۔ جمہوری طرز تنظیم میں اکثریت کی رائے ہی سب کچھ ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ جب چاہے اپنے لئے ایک دستور حیات مرتب کرلے جب کہ شورائی طرز تنظیم میں بنیادی اصول کتاب اور سنت کی شکل میں پہلے ہی طے ہوتے ہیں جنہیں نہ تو اکثریت کا

کوئی فیصلہ بدل سکتا ہے اور نہ ہی قائد کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی مرحلے میں کارواں کا رخ الٰہی ماخذ سے پھیردے۔ رہے وہ مسائل جو بصیرت اور اجتہاد کے محتاج ہوں تو ان امور میں قائد اگر چاہے تو عام مسلمانوں یا ان کے اہل الرائے حضرات سے مشورے طلب کرے، مختلف امور پر کوئی فیصلہ لینے سے پہلے اس کے اثرات و عواقب پر پوری سنجیدگی سے غور کرے البتہ حتمی فیصلے پر پہنچنے کے لئے اسے کسی اکثریت کی حمایت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بس یہ کافی ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں کسی فیصلے پر اس کا دل مطمئن ہو۔ خود مشورہ دینے والوں کو یہ توقع نہیں ہوتی ان کا مشورہ مان ہی لیا جائے گا حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو کسی معاملے میں خاصے پر جوش رہے ہوں۔ اپنی رائے کے خلاف فیصلے کو خوش دلی سے قبول کرتے اور سمع و طاعت کے اسلامی جذبے کے تحت اپنے امیر کے اس فیصلے کو بجالانے میں سرگرم ہو جاتے ہیں جو ان کی رائے میں نسبتاً کم بہتر تھا۔ سمع و طاعت کا یہی وہ غیر معمولی جذبہ تھا جس نے مشکل سے مشکل اوقات میں بھی اسلامی معاشرے کو ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کے عمل سے بچائے رکھا۔ البتہ جب کبھی بھی یہ محسوس ہوا کہ قائد کا کوئی فیصلہ کتاب و سنت کے کسی حکم کے خلاف ہے تو پوری شدت کے ساتھ قائد کی غلطی کو واضح کیا گیا۔ تاریخ کی کتابیں شاہد ہیں کہ ایسے موقع پر قائد کو اپنے فیصلے سے رجوع کرنا پڑا۔

یاد رکھئے! جو شخص کسی عہد میں ملت اسلامیہ کی تنظیم کے لئے اٹھتا ہے اور جو ایک واضح پروگرام کے ساتھ لوگوں کو عمل کی دعوت دیتا ہے اسے کسی نہ کسی درجے میں یہ بصیرت بھی ہوتی ہے کہ وہ اس انقلابی قافلے کو کس طرح آگے لے جائے گا اور بالآخر مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے غلبہ اسلام کا مرحلہ کب آئے گا۔ اب اگر کسی مرحلے میں خود اس کے حامیوں کے اندر ایک ایسا مؤثر گروہ پیدا ہو جائے جو اس کے پروگرام کو مختلف انداز سے چلانا چاہتا ہو اور اکثریت کی مخالفت کے زیر اثر اس کا انقلابی مشن منجمد ہوتا ہوا محسوس ہو تو بھلا کسی نتیجہ خیز مرحلے تک پہنچنا کیسے ممکن ہو سکے گا؟ جو لوگ بعد کے مراحل میں کسی تحریک میں شامل ہوئے ہوں ان پر بہر حال سابقون الاولون کو فوقیت حاصل ہوگی اور سابقون الاولون کی بصیرت کسی بھی طرح قائد کی بصیرت کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر دنیا کے انقلابات کی تاریخ شاہد ہے حتیٰ کہ خالص دنیاوی و سیاسی قسم کے انقلابات کی کامیابی بھی اسی وقت ممکن ہو سکی جب انقلابیوں کے گروہ نے اپنی انقلابی قوتوں کے خزانے کا اختیار کسی

ایک شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔ دور کیوں جائیے خود ہندوستان کی تحریک آزادی میں ایم کے گاندھی کو عام گوشت پوست کے انسان سے کہیں بڑھ کر مہاتما کی حیثیت سے اگر تسلیم نہ کیا گیا ہوتا اور اگر اس کی زبان سے نکلنے والے ایک ایک نعرہ کو آزادی کے متوالوں کا گروہ ناقابل رد نہ سمجھتا تو باشندگان ملک کے حرکت و عمل میں وہ زبردست غلغلہ پیدا نہ ہوتا۔ یقیناً مجاہدین آزادی میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد کو حماقت سے زیادہ نہ گردانتے تھے اور جن کے قلوب گاندھیائی طریقہ جدوجہد پر مطمئن نہ تھے۔ لیکن فکر و نظر کے اس زبردست اختلاف کے باوجود انہیں گاندھی کے جذبات کا خیال کرنا پڑا اور بعد کے مراحل میں تو معاملہ یہاں تک آپہنچا کہ بحث و مباحثہ کے ذریعہ دلوں کو مطمئن کرنے یا مطمئن ہونے کے بجائے گاندھی کے آشرم سے نکلا ہوا ہر لفظ مکمل صداقت کا اظہار قرار پایا۔ کسی نازک ترین، حساس اور دور رس فیصلے تک پہنچنے کے لئے بھی گاندھی کو ہاتھ اٹھوانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ یہ تو رہا عام قسم کی تحریکوں کا معاملہ جہاں تک غلبہ اسلام کے لئے اٹھنے والی کسی تحریک میں سمع و طاعت کا معاملہ ہے تو یہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرط کے ساتھ انقلابیوں کے لئے ہر لمحہ قائد کے ابرو و اشارے کا خیال رکھنا عین جزو ایمان ہے کہ انقلابی مشن کے وجود میں آجانے کے بعد مومنین پر لازم ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اس مشن کے حوالے کر دیں۔

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنہ (توبہ۔ ۱۱۱)

بالفاظ دیگر انقلابی مشن کے حاملین، ایک ایسے ابتدائی مرحلے میں جب کہ دور دور تک صرف خطرات اور مصائب کے بادل منڈلا رہے ہوں، اپنے قائد پر اس درجہ اعتماد کا اظہار کر سکیں جیسا کہ صحابہ کرام کی مختصر لیکن پہاڑوں کا سا عزم رکھنے والی جماعت نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر قائد حقیقیؐ کی ذات اقدس پر کیا تھا:

> "ہم نے رسول اللہؐ سے اس امر پر بیعت کی تھی کہ ہم آپ کا ہر حکم بجالائیں گے، خواہ تنگی میں ہوں یا راحت میں، خواہ ہماری طبیعتوں میں آمادگی ہو یا جبر کرنا پڑے، خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دیا جائے۔ ہم اختیار اور فیصلوں کے بارے میں اہل امر سے جھگڑا نہیں کریں گے اور یہ کہ ہر حال میں حق بات ضرور کہیں گے اور اس بارے میں کسی ملامت کرنے والے کا خوف نہیں کھائیں گے۔ (متفق علیہ)

ملی پارلیامنٹ اپنی ترتیب و تنظیم میں شورائی نظام کی پابند ہوگی جہاں مسائل پر مشورہ اور مفید نصائح کے دروازے ہروقت کھلے ہوں گے البتہ حتمی فیصلہ اکثریت کی رائے کے بجائے کتاب وسنت میں طے شدہ اصولوں کی روشنی میں ہوا کرے گا۔ رہے وہ مسائل جن کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہوں اور جو کتاب وسنت کی روشنی میں یکساں معتبر ہوں تو ایسی صورت میں قائد کو اس بات کا اختیار حاصل ہوگا کہ وہ امت کے حق میں جس رائے کو بہتر سمجھتا ہو اسے قبول کرلے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ دو روزہ اجلاس میں اسٹیج پر قرآن مجید کا ایک نسخہ رحل پر رکھا رہا۔ یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ ہمارے باہمی نزاع اس کتاب تک لوٹا دئے جائیں گے اور مسائل کے حل کی ہر کوشش اس کتاب کی رہنمائی میں ہی کی جائے گی۔ جن لوگوں نے ہماری تحریریں پہلے سے پڑھ رکھی تھیں اور جو اس مشن کے انبیائی لب و لہجے سے واقف تھے انھیں کوئی دشواری پیش نہ آئی البتہ جو حضرات اچانک اس اجلاس میں شرکت کے لئے آگئے تھے انہیں ہمارے طریقہ کار کو سمجھنے میں کچھ دشواری پیش آئی۔

اجلاس کے آخر میں جو قرارداد پیش کی گئی اس کالب و لہجہ مسلمانوں کے عام اجلاس میں منظور کی جانے والی قراردادوں سے یقیناً مختلف تھا۔ یہاں نہ تو کسی کی مذمت کی گئی تھی اور نہ ہی حکومت وقت سے کوئی مطالبہ کیا گیا تھا۔ ساری توجہ اس امر پر صرف کی گئی تھی کہ خود امت مسلمہ اپنے مسائل کے حل کے لئے کیا کچھ کرسکتی ہے۔ بھلا جو حکومت مسلم دشمنی کی پالیسی پر گذشتہ نصف صدی سے عمل کررہی ہو اس سے انصاف کی بھیک مانگنا اور رحم وکرم کی اپیل کرنا کہاں تک درست ہوسکتا ہے؟ ہم اس فضول عمل میں اپنی قوت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتے اور نہ ہی اس فدویانہ طرز التجا کو محمدؐ کی امت کے شایان شان سمجھتے ہیں۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

جب تک امت مسلمہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا نہیں کرتی، جب تک وہ روحانی اور مادی ہر دو اعتبار سے ایک ناقابل تسخیر قوت کی حیثیت سے سامنے نہیں آتی، جب تک محض کفار و مشرکین سے مطالبات کے بل پر اس ملک میں اس کا مستقبل محفوظ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا قرارداد کا بنیادی لب و لہجہ مطالبات کا نہیں بلکہ عمل کا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ امت اپنے گھر کو درست کرے اور اسے من حیث الامت رسول اللہ کے منہج پر پھر سے قائم کردیا جائے کہ جس کے بغیر

باطل کے خلاف کسی فیصلہ کن جنگ کا اعلان قبل از وقت اور خود کشی کے مترادف ہے۔

بابری مسجد سے متعلق قرارداد کو اسی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بعض شرکاء کو اس امر پر سخت حیرت ہوئی کہ جو لوگ ایک انقلابی جدوجہد کا دعویٰ لے کر اٹھے ہوں اور جن کی تقریریں اور تحریریں شوق شہادت سے سرشار نظر آتی ہوں آخر وہ بابری مسجد کی بازیابی کے لئے فی الوقت کسی عوامی تحریک کے حق میں کیوں نہیں ہیں؟ ہم نہ تو بابری مسجد کے سلسلے میں کسی اظہار عزیمت کے خلاف ہیں اور نہ ہی مسجد کی بازیابی کے لئے کسی تحریک جہاد کو غلط سمجھتے ہیں بالخصوص ایسی صورت حال میں جب انہدام بابری مسجد کے بعد متھرا اور کاشی کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی ہوں۔ البتہ جو چیز ہمیں اس جدوجہد کو فی الحال مؤخر کئے دینے پر مجبور کر رہی ہے وہ بعض ایسے منفی حقائق ہیں جن سے چشم پوشی کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ آج سے کوئی چھ سال قبل ہم نے اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تھی کہ اگر مسلمانوں نے بابری مسجد کے مسئلہ کو اپنی قومی لڑائی کا ایجنڈا بنانے سے گریز نہ کیا تو اس کا سارا فائدہ اسلام دشمن، ہندو احیاء پرستوں کی جھولی میں جائے گا۔ ہم نے اس وقت بھی آنے والے خوفناک ایام کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ایک خالص قومی لڑائی میں جب معاملہ مذہب کی اصل روح کے بجائے عوامی جذبات کو مقدم رکھنے کا ہو، ملک میں خانہ جنگی کی ایسی فضا پیدا ہو جائے گی جس میں مسلمانوں کے لئے سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔ ایسا اس لئے بھی کہ جو لوگ مسجد کے حوالے سے مسلم عوام کی قیادت سنبھالنے کے لئے میدان میں آئے تھے ان کے لبوں پر قال اللہ و قال الرسول کے بجائے وہی مکروہ سیکولر نغمے تھے جن کی بدولت مسلمانوں کی جان و مال اور ان کی عبادت گاہیں غیر محفوظ ہوئی تھیں۔ پھر ان بے چاروں کے پاس نہ تو کسی عزیمانہ جدوجہد کے لئے کوئی حوصلہ تھا اور نہ ہی کسی سرفروشانہ جدوجہد کے لئے کوئی آمادگی۔ ان میں سے ہر کوئی قیادت کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے لئے بے تاب تھا۔ اس کا اظہار بوٹ کلب پر ہونے والی ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے بڑی ریلی کے موقع پر ہو چکا تھا۔ اگر ایک طرف سروں سے کفن باندھ کر آنے والے لاکھوں مسلمان مسجد کی بازیابی کے لئے سروں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے آمادہ تھے اور ہر صورت میں اخوت اسلامی کے زبردست مظاہرے سے کفار و مشرکین کے دلوں میں رعب ڈالنے کی آرزو لئے آئے تھے تو دوسری طرف قائدین میں سے ہر کوئی اس زریں موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کا سب سے بڑا ٹھیکیدار بن جانے کے لئے کوشاں تھا۔ اسٹیج سے کی جانے والی

تقریریں ایک دوسرے کے خلاف بہتان تراشی اور آپسی منافرت کی واضح تفسیریں تھیں۔ اب ایسی صورت میں اس تحریک پر کسی انبیائی انقلابی جدوجہد کا مغالطہ ان ہی لوگوں کو ہوسکتا تھا جو رسول اللہؐ کے انقلابی مشن اور اسلامی تحریکوں کے مزاج سے یکسر کورے ہوں۔

جہاد فی سبیل اللہ کے لئے چند بنیادی شرائط میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ صالح قیادت و امامت کا قیام ہے۔ جب تک مسلمانوں کے اندر ایک صالح قیادت وجود میں نہیں آتی جو خالصتاً کتاب وسنت کی روشنی میں انقلابی کارواں کی رہنمائی کا عزم رکھتی ہو اس وقت تک کسی جہاد کی بات سوچی بھی نہیں جاسکتی کہ اسلامی علامتوں کے لئے لڑی جانے والی کوئی جنگ ان لوگوں کی قیادت میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی جو اس راستے کی دشوار گذاریوں سے سرے سے ناواقف ہوں اور جنہیں سیکولر جمہوری اقدار کا ورد اس قدر عزیز ہو کہ غلبہ اسلام کا نام آتے ہی جبینیں شکن آلود ہوجاتی ہوں۔ پھر ان کے قائدانہ شب و روز کا عالم یہ ہو کہ مسجد کی بازیابی کے لئے منعقد ہونے والی میٹنگوں میں اور بعض اوقات تو خود مساجد کے اندر منعقد ہونے والی میٹنگوں میں نماز کا وقت آتے ہی چند ایک کو چھوڑ کر بیشتر چائے سگریٹ کے مشغلے میں لگ جاتے ہوں۔ بھلا کسی ایسی قیادت سے مسجد کی بازیابی تو کجا اس کا تحفظ بھی کیوں کر ممکن تھا۔ کیا یہ طرز قیادت معصوم مسلمانوں کے مقدس جذبات کے استحصال اور اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف نہ تھا؟

یہی وجہ ہے کہ ہم نے بالکل ابتدا ہی سے بابری مسجد کی تحریک کو کسی صالح قیادت کے قیام کے بغیر ایک کار لایعنی قرار دیا لیکن اس وقت جوش جذبات میں اس بات کو سننے کے لئے بہت کم کان کھلے ملے۔ جن لوگوں کی سمجھ میں بات آئی بھی وہ عوامی غیض و غضب کے خوف سے کوئی عملی اقدام نہ اٹھاسکے۔ پھر ایک مرحلہ وہ آیا جب چھ سالہ جدوجہد کے بعد بالآخر مسجد کی تحریک ایک ایسے مرحلے میں داخل ہوگئی جہاں سے پیچھے جانا ممکن نہ رہا۔ اس وقت یقیناً اقدامی عمل کی ضرورت تھی لیکن کسی ایسے عمل کے لئے مسلمانوں کے پاس نہ تو کوئی تیاری تھی اور نہ ہی مسجد کمیٹیوں کے قائدین اس کے لئے آمادہ تھے۔ الفاظ کی جنگ میں اور اپنی جانوں کی قربانی کے بلند بانگ دعووں میں تو یقیناً وہ کسی سے پیچھے نہ تھے لیکن کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ بابری مسجد کے انہدام کو اگر واقعی ہندوستان میں اسلام کا انہدام سمجھتا تھا تو پھر اس کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کی صفیں ترتیب دیتا، البتہ اپنی توفیق بھر ہر ایک کو یہ فکر ضرور لاحق رہی کہ

وہ وزیر اعظم سے مسجد کے تحفظ کی زیادہ سے زیادہ "ضمانت" لے سکے۔

آج جب مسجد کے انہدام کے ساتھ ہی سیکولر، جمہوری ہندوستان کا خواب پوری طرح بکھر چکا ہے۔ جب ماضی کے سارے اقدار اور رویے اپنا وزن کھو چکے ہیں، جب سابقہ سیاسی رویے اور سابقہ مسلم رہنماؤں کی ناکامی ہر شخص پر واضح ہو چکی ہے اور جب ایک نئے انقلابی رویے کی قبولیت کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں، ایک بار پھر امت کو مسجد کے حوالے سے سابقہ سیاسی کھیل میں مبتلا رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کل تک جو لوگ سیکولرزم کے حوالے سے مسجد کی بازیابی کے لئے سرگرم تھے ان ہی لوگوں نے آج مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سائے تلے پناہ لی ہے۔ وہی لوگ ہیں اور وہی طریقہ کار، گفتگو کا وہی انداز ہے اور اظہار عزم کا وہی لب و لہجہ، فرق صرف اتنا ہے کہ اب اس جدوجہد پر شریعت کے تقدس کی مہر لگ چکی ہے اور گاہے بہ گاہے ان حضرات کی گفتگو میں مسجد کی شرعی حیثیت کا تذکرہ آجاتا ہے۔ ظاہر ہے جب سب کچھ وہی ہے تو اس کا نتیجہ بھی وہی نکلے گا۔ مسجد کی بازیابی تو کیا ہوگی البتہ یہ ضرور ہوگا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ، جسے اب تک مخصوص مسئلہ پر گفتگو اور اس کے حل کے لئے ایک معتبر فورم کی حیثیت حاصل رہی ہے، اس کا اعتبار بھی یکسر ختم ہو جائے گا۔

اب ذرا مسئلہ کے امکانی پہلوؤں کا جائزہ لیجئے۔ پرسنل لا بورڈ کے سر یہ سہرا یقیناً ہے کہ ماضی میں پرسنل لا کے سلسلے میں اپنے مطالبات منوانے کے لئے اس نے کامیاب تحریک کی قیادت کی ہے لیکن کیا کوئی ایسی تحریک مسجد کی بازیابی کے سلسلے میں بھی یکساں کارگر ہو سکتی ہے؟ میرے خیال میں اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ مسلم عورتوں سے متعلق بل کو قانونی شکل دینے کی جدوجہد میں پرسنل لا بورڈ کا معاملہ براہ راست حکومت سے تھا جس میں اگر ایک طرف سپریم کورٹ فریق تھا تو دوسری طرف ۲۵ کروڑ ہندوستانی مسلمان، لہٰذا حکومت کو مسلمانوں کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے میں ذرا دشواری نہ ہوئی۔ اسے تو بیٹھے بٹھائے مسلمانوں کی خوشنودی کے حصول کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا لیکن بابری مسجد کا معاملہ مختلف ہے۔ یہاں اگر ایک طرف ۲۵ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کا معاملہ ہے تو دوسری طرف ملک کی عظیم اکثریت کی خوشنودی بھی اسی سے وابستہ ہے۔ کسی جمہوری سیاست میں جہاں اکثریت کی بڑی اہمیت ہوتی ہو اور وہاں کوئی بھی حکومت اکثریت کو ناراض کرنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتی۔ ایسی صورت میں دور دور تک اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ مطالبات اور ایجی ٹیشن کے نتیجے میں منہدم بابری مسجد

مسلمانوں کو لوٹا دی جائے گی۔ پھر کسی ایسی تحریک کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ مزید احساس شکست، مایوسی اور ناکامی کے علاوہ اور کیا آئے گا؟

رہے وہ لوگ جو بابری مسجد کی بازیابی کے لئے گردنوں کا مقدس نذرانہ پیش کرنے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو یقیناً ہمارے دل ان کے ساتھ ہیں۔ اس عمل میں یقیناً وہ قوت ہے جو حالات کی سنگینی کے باوجود مسجد کی بازیابی ممکن کر دکھائے۔ یعنی اگر مسلمانوں نے اپنی ساری بے سروسامانی کے باوجود حکومت، سیکورٹی فورسیز، احیاء پرست ہندو جماعتوں سے ٹکر لینے کی ٹھان لی تو اقلیت اور اکثریت کی بحث یا قوت کے توازن کا معاملہ یکسر ختم ہو جاتا ہے کہ صالح قیادت میں مخلص مسلمانوں کے ذریعہ کی جانے والی کسی بھی جدوجہد کو اللہ کی نصرت کا پہنچنا عین لازم ہے۔ البتہ جب تک کسی ایسی جدوجہد کا واقعی آغاز نہیں ہوتا میں مسجد کی بازیابی کے زبانی دعووں کو امت کے لئے مفید نہیں سمجھتا اور اسی لئے جب تک امت کا گھر درست نہیں ہوتا، میں مسجد کی بازیابی کی تحریک کو مؤخر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

آئیے اب اس مسئلے کا ایک اور پہلو سے جائزہ لیں۔ اگر ۲۵ کروڑ کی امت میں مسلمانوں کا ایک قابل ذکر گروہ بھی صالح قیادت کی نگرانی میں عظیمت کا مظاہرہ کرنے کے لئے آمادہ ہو اور وہ اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانیوں کو بلا تکلف قبول کر سکتا ہو تو کیا اتنی عظیم الشان قوت کے برپا ہو جانے کے بعد بھی ہماری نگاہ صرف ایک مسجد تک مرکوز رہنی چاہیۓ؟ کیا اس عمل میں وہ قوت نہیں کہ پورے ملک کو اللہ کی مسجد میں تبدیل کر دے؟ جو لوگ رسول اللہ کے منہج انقلاب سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتے ہیں انہیں معلوم ہوگا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ جنگ میں جو نکتہ سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ قوت کے کم سے کم زیاں سے زیادہ سے زیادہ فائدوں کا حصول ہے۔ ۲۳ سالہ انقلابی جدوجہد میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ معمولی نوعیت کی فتوحات یا معرکہ آرائی کے لئے انقلابیوں کی ایک بڑی تعداد کو قربان کر دیا گیا ہو۔ نہ ہی کبھی ایسا ہوا کہ مٹھی بھر انقلابیوں کے گروہ کو کسی مناسب تیاری کے بغیر کفار و مشرکین کے مسلح اور منظم دستوں سے براہ راست ٹکرا دیا گیا ہو بلکہ ہر مرحلے میں حملہ وہاں کیا گیا جہاں دشمن نسبتاً کمزور تھا اور جہاں سے کوئی حملہ اس کی صفوں میں انتشار پیدا کر سکتا تھا۔ مثال کے طور پر مکے میں مسلمانوں کی بے لبسی، قائد حقیقیؐ کے خلاف مخالفانہ پیروپیگنڈے، ان کے پیروؤں کے خلاف وحشیانہ مظالم کا لامتناہی سلسلہ، حرم کعبہ میں بتوں کی پرستش اور کعبہ کا ننگا طواف یہ سب وہ مظاہر

تھے جن پر مسلمانوں کا دل خون کے آنسو روتا تھا لیکن ان سخت ترین ایام کے باوجود مٹھی بھر مسلمانوں کو منظم اور مستحکم کفر کے مقابلے میں براہ راست لے آنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ وقت کا رسولؐ خوب جانتا تھا کہ حربی اور مادی محاذ پر منظم کفر سے مقابلہ کچھ مفید نہ ہوگا، اس طرح مسلمانوں کی ساری قوت اقدامی عمل سے ہٹ کر دفاعی امور میں الجھ کر رہ جائے گی۔ کفار قریش گو حربی محاذ پر منظم اور مستحکم تھے البتہ نظریاتی محاذ پر ان کی تہی دامنی واضح تھی۔ لہٰذا حملے کا سارا رخ نظریاتی محاذ پر مرکوز کر دیا گیا۔ انقلابی نعروں کی یہی وہ سحر انگیزی تھی جس نے دارالندوہ میں ایک سردار قریش کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ محمدؐ نے جو نعرہ بلند کیا ہے، اس کا توڑ ہمارے لئے ممکن نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی غلام اور آقا سب برابر۔ آنے والے ایام شاہد ہیں کہ اس حکیمانہ جنگ کے نتیجے میں صرف کعبہ کی بازیابی ہی ممکن نہیں ہوئی بلکہ پورا کا پورا جزیرۃ العرب اسلام کے جھنڈے تلے آگیا۔

منظم اور مستحکم کفر کے ان ہی مظاہر سے آج ہمیں اس ملک میں سابقہ درپیش ہے۔ حربی اور سیاسی سطح پر اپنی ساری قوت کے باوجود اس کا نظریاتی دیوالیہ پن واضح ہے۔ خود کو ہندو کہنے اور کہلانے والے لوگ نہ صرف یہ کہ منتشر اور متضاد گروہوں میں منقسم ہیں بلکہ آپس میں برسرپیکار بھی۔ ضرورت ہے کہ انقلابیوں کی قوت کو براہ راست منظم باطل سے ٹکرانے کے بجائے اسے ان محاذ پر استعمال کیا جائے جہاں پر ضرب لگانا باطل کے انہدام کا سبب ہو سکتا ہو۔ ملی پارلیامنٹ دراصل اسی حکیمانہ جنگ کے لئے وجود میں آئی ہے۔ وہ محض بابری مسجد کی بازیابی کے بجائے پورے ملک کو اللہ کی مسجد میں تبدیل کر دینے کا عزم رکھتی ہے۔

ضرورت تو اس بات کی تھی کہ اس حکیمانہ جنگ کے لئے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض اور ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں اس انقلابی کلیے کو برتنے کے لئے مطلوبہ بصیرت پر "بند کمرے کے اجلاس" میں تفصیل سے گفتگو ہوتی تاکہ اراکین ملی پارلیامنٹ کے دل و دماغ اس پیغمبرانہ حکمت عملی پر پوری طرح مطمئن ہو سکتے۔ لیکن افسوس کہ بعض مسائل کے پیش نظر بند کمرے کا اجلاس اس انداز سے منعقد کیا جانا ممکن نہ ہو سکا اور ہمارا بہت سا وقت غیر ضروری تکرار اور اس کے بعد پریس کانفرنس کی نذر ہو گیا۔ واضح رہے کہ اجلاس کے رسمی خاتمے کے بعد سہ پہر میں پریس کانفرنس کا انعقاد ہمارے طے شدہ پروگرام کا جزنہ تھا لیکن اجلاس سے قبل ہی اخبارات میں بے بنیاد مخالفانہ پروپیگنڈے کا جس شد و مد کے

ساتھ آغاز ہوگیا تھا، اس کے پیش نظر پریس کو اتمام حجت کے طور پر فوری خطاب کرنا ضروری سمجھا گیا۔ ایسا اس لئے بھی کہ پہلے دن کی رپورٹ میں اخبارات نے ہماری بالکل ہی غلط تصویر پیش کردی تھی اور بعض نامہ نگار حضرات نے بعض اصطلاحوں اور تجاویز کو بالکل ہی مختلف پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ خود پریس کانفرنس میں سیر حاصل گفتگو کے باوجود ان حضرات نے شورائی اور جمہوری نظام کے فرق کو سمجھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی۔ انہیں اس دو روزہ اجلاس میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آئی وہ مسلمانوں کو خانہ جنگی پر ورغلانے کی گفتگو اور انہیں مسلح ہونے کا مشورہ تھا اور اس طرح بقول ان کے دستوری اور جمہوری اقدار میں مسلمانوں کے اعتماد کے خاتمے کا اعلان تھا۔ دوسرے دن تمام ہی بڑے ہندی اور انگریزی اخبارات میں صفحہ اول پر شائع ہونے والی ملی پارلیامنٹ کی کارروائی سے متعلق رپورٹ کا لب و لہجہ کچھ ایسا ہی تھا۔ دوسری بات جو ان خبروں میں نمایاں نظر آئی وہ "زبردست" ہنگامہ تھا جو بقول ان حضرات کے اجلاس کے اختتامی اجلاس میں واقع ہوگیا تھا۔

بہرحال وجوہات جو کچھ بھی ہوں واقعہ یہ ہے کہ بند کمرے کے اجلاس کے متوقع انداز سے منعقد نہ ہونے سے بعض رفقاء کے دلوں میں مایوسی پیدا ہوئی اور بہت سے لوگوں کو جو بہت سی باتیں اسی اجلاس میں عرض کرنی تھیں ان سے بھی شارکین استفادہ نہ کرسکے۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں سے گفتگو، بعض انفرادی ملاقاتوں اور گیسٹ ہاؤس میں مقیم مہمانوں سے فراغت کے بعد کہ جن میں سے بیشتر جنوب کی ریاستوں سے تشریف لائے تھے اور جن کی گاڑیاں اسی شام جانے والی تھیں، ہم مغرب تک بچوں کے گھر میں پہنچ پائے۔ مغرب کے بعد شروع ہونے والی اس نشست میں جو احباب موجود تھے انہیں کسی حد تک اس بات کا اندازہ ضرور ہوگیا ہوگا کہ ہم ملی پارلیامنٹ کو ایک عظیم انقلابی قوت میں تبدیل کرنے کے لئے کیا منصوبہ رکھتے ہیں؟ اور یہ کہ آپ حضرات کو اس منصوبہ میں کیا رول ادا کرنا ہے؟ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ حضرات کے دلوں پر اس عظیم جدوجہد میں پیش آنے والی صعوبتوں کو پیشگی واضح کردیا ہے اور آپ اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانیوں کے لئے اپنے دل آمادہ پاتے ہیں۔ اللہ ہمارے اس جذبہ عمل کو قبول فرمائے۔

آپ حضرات نے مجھے اور میرے رفقاء کے ضمن میں جس زبردست اعتماد اور والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے آپ حضرات کو اجر کثیر عطا فرمائے اور ہمارے دلوں کو اپنی راہ میں

جدوجہد کی خاطر باہم جوڑ دے۔ آمین۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس نشست میں یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ آنے والے چند مہینوں میں ہم دو کام بیک وقت کرنا چاہتے ہیں۔ اولاً مسلم اہمیت کے بڑے شہروں، ثقافتی اور تعلیمی اداروں اور مختلف صوبوں کی راجدھانیوں میں بڑے بڑے عوامی نوعیت کے جلسے کئے جائیں جو بڑی حد تک عوامی رابطہ مہم کا کام انجام دیں۔ اس طرح خود مسلمانوں کے درمیان ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ہماری جو غلط تصویر پیش کی جارہی ہے اس کا تدارک ہوسکے اور صحیح معنوں میں ملی پارلیامنٹ کو پچیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہوسکے۔ ثانیاً اسی اثناء میں مختلف امور سے متعلق کمیٹیاں پروگرام کی ترتیب اور منصوبہ بندی کے عملی انطباق سے متعلق اپنی سفارشات مرتب کرلیں۔ قرارداد کی روشنی میں پہلے مرحلے میں جو کمیٹیاں اپنا کام فوری شروع کردیں گی، ان کے نام یہ ہیں:

- کمیٹی برائے سیاسی امور
- کمیٹی برائے دفاع
- کمیٹی برائے ذرائع ابلاغ
- کمیٹی برائے دعوت اسلام
- کمیٹی برائے مالیات

ہر کمیٹی سات افراد پر مشتمل ہوگی البتہ مختلف کمیٹیوں کو مسئلہ سے متعلق گہرا علم رکھنے والے ماہرین کی ایک مختصر ٹیم فراہم کی جائے گی جو انہیں وقتاً فوقتاً مشوروں سے نوازتی رہے گی۔ مشیرکاروں (Advisors) کی یہ ٹیم ملی پارلیامنٹ کے تنظیمی ڈھانچے کے باہر سے بھی لی جاسکتی ہے۔

مختلف کمیٹیوں کے لئے آپ حضرات نے بڑی تعداد میں از خود اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ خیر کے کاموں میں سبقت لے جانے والے اس جذبہ کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے البتہ ضروری نہیں کہ ہم آپ کی پسندیدہ ذمہ داری کو ہی آپ کے حوالے کریں۔ کسی وجہ سے اگر ایسا ممکن نہ ہو تو جو بھی ذمہ داری آپ کو سونپی جائے اسے نظم کے تقاضے کے تحت خندہ پیشانی سے قبول کرلیں اور اپنے کسی مشورے کو ضائع ہوتا ہوا دیکھنے کے باوجود اپنے دل میں کوئی تنگی پیدا نہ ہونے دیں کہ کسی بڑے کام کی انجام دہی کے لئے کارکنان میں اس صفت کا پایا جانا لازمی ہے۔

اپنے علاقے کی مسلم اہمیت کے پیش نظر اور حامیان ملی پارلیامنٹ کی قوت کارکردگی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ہمیں یہ بتائیے کہ ملی پارلیامنٹ کا عوامی جلسہ ریلی آپ کے شہر میں کب تک منعقد ہوسکتی ہے؟ آپ کے جواب کے بعد ہی ہم اپنے ملک گیر دورے میں آپ کے علاقے کو شامل کرنے کا پروگرام

بنا سکیں گے۔ اس بارے میں آپ کے جواب کا شدت سے انتظار ہے۔

امید ہے کہ آپ حضرات حسب سابق اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہیں گے اور غلبہ اسلام کے لئے رات کی تاریکیوں میں کی جانے والی اپنی دعاؤں کو تیز تر کر دیں گے۔

اللہ ہم سبھوں کو شہادت سے سرفراز فرمائے۔ آمین

والسلام

آپ کا بھائی

راشد شاز

ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی قافلہ اب متحرک ہونے کو ہے

برادران گرامی اور دختران ملت! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

الیکشن کا ہنگامہ اب ختم ہونے کو ہے۔ سیاسی پارٹیاں تھکا دینے والی سیاسی مہموں کے بعد اب مستقبل کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ ہر کسی کو خوشگوار صبح کی آمد کا انتظار ہے۔ جس نے جتنی محنت کی ہے اسی قدر بہتر مستقبل کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ ایک ایسے لمحے میں ملک کے پچیس کروڑ ہندوستانی مسلمان خود کو ایک عجیب صورت حال سے دوچار پاتے ہیں۔ غمناک نگاہیں ملک میں ہو رہی سیاسی تبدیلی کی طرف اٹھتی ہیں اور اپنے لئے مستقبل کے دروازے بند پاکر مایوسی سے لوٹ جاتی ہیں۔ آج جب ملک کی دوسری قومیں الیکشن میں اپنی محنتوں کا پھل کاٹ رہی ہیں اور اس کی بنیاد پر قوت کے نئے میزانیے میں زیادہ مؤثر رول ادا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے الیکشن میں ان کا متحرک رہنا پولنگ بوتھ تک جوش و خروش سے جانا اور اپنی پسند کے امیدوار کو کامیاب بنانے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دینا دراصل یہ سب کچھ ایک سراب تھا کہ اب وہ نئی سیاسی صورت حال میں ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں رکھتے۔

اس وقت ہندوستانی مسلمانوں پر وہی کیفیت طاری ہے جو خواب سے اچانک بیدار ہو جانے والے شخص پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی آنکھیں ملتا ہے اور اپنے اردگرد خواہشات سے مختلف ایک نئی دنیا پاکر حقیقت سے آنکھیں بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اے کاش کہ خوابوں کی دنیا ہی سچی ہوتی یا کم از کم اس میں واپس لوٹ جانے کی کوئی ترکیب اسے ہاتھ آجاتی۔ الیکشن سے پہلے جو لوگ آپ کی ہمدردی کا

دم بھرتے تھے اور جنھیں آپ کے ووٹوں کی ضرورت تھی اور جو آپ کے کمزور کندھوں پر اپنی جاہ و حشمت کا جلوس نکالتے تھے وہ سب کے سب اب آپ کے مسائل سے بے خبر اپنے سیاسی مستقبل کو تابناک بنانے کی فکر میں ہیں، اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کو اس وقت یہ محسوس ہو رہا ہے کہ آنے والے دنوں میں اونٹ جس کروٹ بھی بیٹھے اور سیاسی دسترخوان پر جسے جتنا کچھ بھی مل جائے البتہ ان کے ہاتھ کچھ بھی لگنے والا نہیں۔

قرائن بتاتے ہیں کہ نئی حکومت میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو بڑی حد تک سبقت حاصل ہو جائے گی اور یہ صورت حال مسلمانوں میں مزید مایوسی کو جنم دے گی اس لئے کہ انھوں نے اپنے آپ کو جن سیاسی پارٹیوں سے وابستہ کر رکھا ہے یا جن غیر مسلم سیاسی رہنماؤں کو مسیحائی کے مقام پر فائز کر رکھا ہے انھیں اس سیاسی اکھاڑے میں متوقع کامیابی نہیں مل پائے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی قسمتوں کا محافظ لالو یادو یا ملائم سنگھ یادو کو سمجھ بیٹھے ہیں یا جن کو اپنی حفاظت کی امید کانگریس کے سایہ عاطفیت میں نظر آتی ہے ان کے اوپر سخت مایوسی طاری ہو جائے گی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے جن جھوٹے خداؤں پر تکیہ کیا تھا یا جن سیاسی آقاؤں سے اپنے مستقبل کو وابستہ سمجھا تھا، قوت کی جنگ میں ان آقاؤں کے پیچھے رہ جانے سے ان کے حواریوں پر مایوسی کی کیفیت پیدا ہونا فطری ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری امت ہندو احیاء پرستوں کی طرف فدویانہ اور ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھے گی اور اس کے قائدین اس بات کی کوشش کریں گے کہ منت سماجت کے ذریعے نئی سیاسی قوت سے ہی زندگی جینے کی مزید مہلت مانگ لی جائے۔ جو لوگ کانگریسی نظام کفر کے اندر خوشگوار زندگی جینے کا طویل تجربہ رکھتے ہیں اور جنہیں مسلم دشمن کانگریس سے رشتہ الفت و محبت قائم رکھنے میں مہارت حاصل رہی ہے، ان کے لئے ہندتو کے دربار سے راہ و رسم پیدا کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ اس طرح بہت جلد آنے والے دنوں میں کانگریسی اور جنتادلی مسلمانوں کی طرح بھاجپائی مسلمانوں کی بھی ایک نسل وجود میں آجائے گی۔ مسلمانوں میں جو لوگ ماخذ اقتدار سے فائدہ کشید کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں ان کے لئے اس صورت حال سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا اس لئے کہ ان حضرات کے لئے اپنا سیاسی قبلہ تبدیل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ رہے عام مسلمان تو ان کے اندر نئی صورت حال ایک شکست خوردہ مایوسی کو جنم دے گی۔

نئے ہندوستان میں مسلمانوں کو پہلے سے کہیں زیادہ یہ محسوس ہوگا کہ وہ جس سیاسی راستے پر اب

تک چلتے رہے ہیں وہ دراصل اغیار کا بتایا ہوا راستہ ہے جس پر چل کر وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ان کے اندر یہ احساس شدت اختیار کرتا جائے گا کہ سیکولر سیاست کے نام پر دراصل مختلف سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کو غیر اسلامی ایجنڈے کے فروغ کے لئے استعمال کرتی رہی ہیں کہ مسلمان کوئی نصف صدی تک کانگریس کی غیر مشروط اطاعت پر مامور رہے۔ انھوں نے اپنے سیاسی ایجنڈے کو ترک کردیا۔ اس ملک کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کے خواب کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ عافیت کی زندگی کی تلاش میں رسول اکرمؐ کے سیاسی ایجنڈے کو منجمد کردیا۔ ملی اور مذہبی بنیادوں پر اپنی سیاسی صف بندی سے برات کا اعلان کیا اور علی الاعلان من حیث الامت اسلامی ایجنڈے سے کنارہ کش ہوکر سیکولرازم کے علمبردار اور مبلغ بننے سے بھی باز نہ آئے۔ رسولؐ سے جو رشتہ ٹوٹا سو ٹوٹا، خود دنیا میں بھی انھیں کیا ملا؟ کانگریس کی طویل دور حکمرانی کا ہر دن قیامت انگیز ثابت ہوا۔ دریں اثناء ملک میں قوت کے نئے میزانیے وجود میں آنے لگے۔ علاقائی پارٹیوں نے اہمیت اختیار کرلی۔ دلتوں، یادووں اور مختلف قومیت کی نمائندگی کرنے والی چھوٹی چھوٹی پارٹیاں سماجی انصاف کے نعرے کے ساتھ میدان میں آئیں۔ عافیت کے متلاشی مسلمان ان پارٹیوں کے دست و بازو بن گئے لیکن یہاں بھی انھیں صرف استعمال کیا گیا۔ ان پارٹیوں کے قائدین کی تربیت بھی چونکہ کانگریس کلچر میں ہوئی تھی اس لئے مسلمانوں کو سبز باغ دکھانے میں انہیں بھی مہارت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ الیکشن میں یونائٹیڈ فرنٹ کی پارٹیوں کے لئے بھی مسلمانوں کے جوش و خروش میں خاصی کمی آئی ہے۔ بے چارہ مسلمان کرے تو کیا کرے؟ وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسلم دوستی کی دعویدار تمام پارٹیاں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں بلکہ وہ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں جس سے اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پر روک لگانا ممکن ہو۔ گویا اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ موجودہ ہندوستان کی تمام غیر مسلم پارٹیاں اسلام اور مسلمانوں کے لئے مخلص نہیں ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان کرے تو کیا کرے؟

عام مسلمان جب جبہ و دستار والے قائدین کی طرف دیکھتا ہے تو اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ شاید دین و شریعت کا علم رکھنے والے لوگ اس مسئلے میں اس کی کوئی رہنمائی کریں گے لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوتی ہے کہ ہماری مذہبی اور دینی قیادت بھی کفار کے مختلف خیموں میں بٹ چکی ہے۔ کہنے کو تو یہ سب نائبین رسول ہیں اور نظری اعتبار سے ان میں سے ہر ایک کو رسول اللہؐ کی قیادت پر کامل اعتماد

ہے لیکن عملی طور پر ان میں سے بیشتر نے کسی نہ کسی غیر مسلم سیاسی قیادت کے ہاتھوں پر بیعت کر رکھی ہے۔ گویا کفر کا ایجنڈا ڈھونے میں یہ عام مسلمانوں سے کہیں آگے نظر آتے ہیں۔ ہر الیکشن کے موقع پر ان کے جوڑ گھٹاؤ اور غور و فکر کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان کی پسند کی غیر اسلامی ایجنڈا رکھنے والی سیاسی پارٹی کو ووٹ دے دیا جائے۔ اس پورے تماشے میں ان قائدین کا شاید کچھ بھلا ہو جاتا ہو البتہ امت پر سیاسی بے بسی کی رات مزید طویل ہوتی جاتی ہے۔

سابقہ انتخابات کی طرح اس بار بھی سیاسی مسئلہ پر مسلمانوں کے یہاں مشاورتیں منعقد ہوئیں۔ مذہبی لوگ سیاسی مسئلے پر سر جوڑ کر بیٹھے، کمیٹیاں بنائی گئیں تاکہ مسلمانوں کی رہنمائی کی جاسکے لیکن ذرا اندرون میں جاکر دیکھئے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے بیشتر کوششیں دراصل سیاسی پارٹیوں کے ایماء پر ان کے لئے زمین ہموار کرنے کے لئے کی جارہی تھیں۔ یقیناً ان میں بعض مخلص مسلمان بھی تھے جو محض امت کے مستقبل کے سلسلے میں فکر مند تھے اور وہ اپنی بساط بھر فاشزم کے مقابلے کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے البتہ ان سبھوں کا پیش کردہ حل ایک تھا اور وہ یہ کہ مسلمان سیکولر پارٹیوں کی تھیلی میں اپنا ووٹ ڈال دیں اور اس ملک کے امور کو ان کے ہاتھوں میں سونپ کر خود چین کی نیند سوئیں۔

غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے لئے فضا ہموار کرنے والے لوگ خواہ کرائے کے مسلمان ہوں یا موسمی مولوی یا مخلصین امت، یہ سب کے سب یکساں طور پر اس جرم میں برابر کے شریک ہیں کہ وہ اس ملک میں مسلمانوں کو ایک ایسے سیاسی راستے پر چلائے رکھنا چاہتے ہیں جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن برملا اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ کفار مسلمانوں کے امور کے نگراں نہیں بنائے جاسکتے۔ دنیا کے کسی حصے میں اور تاریخ کے کسی لمحے میں امت مسلمہ کی سیاسی، سماجی یا روحانی قیادت پر غیر مسلموں کو فائز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اس بات سے بھی خوب واقف ہیں کہ ووٹ ایک امانت ہے جسے مسلمان کی حیثیت سے ہم کسی ایسی پارٹی کے حوالے نہیں کرسکتے جو اسلام کے علاوہ کوئی اور ایجنڈا رکھتی ہو۔ رہیں موجودہ سیکولر پارٹیاں اور سیاسی قائدین جن کی اسلام دشمنی ہر خاص و عام پر واضح ہے تو ایسی کسی پارٹی کو برضا و رغبت اقتدار سونپنا یا اسے اقتدار میں لانے کے لئے جدوجہد کرنا نہ صرف یہ کہ شرعی احکام کی پامالی ہے بلکہ عقل سلیم کے بھی خلاف ہے۔ جو لوگ علی الاعلان الٰہی ہدایت کے منکر ہوں، جن کے لئے رسول اکرمؐ کی شریعت قابل قبول نہ ہو وہ بھلا رسولؐ کی امت کے تئیں

کیوں کر مخلص ہو سکتے ہیں؟

آپ نے جن سیاسی پارٹیوں پر تکیہ کیا تھا اور جسے اپنے تحفظ کی ذمہ داری سونپی تھی، نئے سیاسی منظرنامے میں ان کی فیصلہ کن حیثیت ختم ہو جانے کا وافر امکان ہے۔ گویا آپ کے مہرے پٹ چکے ہیں۔ سیاسی بساط پر آپ کے حصے میں شکست آئی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ آپ نے جن جھوٹے خداؤں سے اپنی قسمت وابستہ کی تھی ان کی قوت کو ایک نہ ایک دن گہن لگنا تھا۔ رب ذوالجلال کو چھوڑ کر واقعہ یہ ہے کہ ان جھوٹے خداؤں سے لو لگانا ایک بڑی سنگین غلطی تھی۔ لیکن اس صورت حال سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ چلئے اچھا ہوا آپ جھوٹے محافظوں کی حفاظت کے فریب سے نکل آئے۔ اب یہ نئی صورت حال ہے جس میں آپ کو اپنے تحفظ کی فکر خود کرنی ہے۔ مستقبل کے لئے منصوبہ خود ترتیب دینا ہے اور اپنی بنیادوں پر اس ملک میں زندگی جینے کی منصوبہ بندی کرنی ہے۔ اگر نئی صورت حال کا چیلنج قبول کرنے کا داعیہ آپ کے اندر پیدا ہو جائے تو یہ ایک بہت بڑی نعمت ہوگی ورنہ اگر دوبارہ حفاظت کی تلاش میں آپ جھوٹے خداؤں کے بوسیدہ سیاسی خیموں میں چھپتے پھرے تو کہیں پناہ نہ مل سکے گی۔

آپ کی نگاہوں سے یہ بات بھی اوجھل نہ ہو کہ آج آپ کو جس صورت حال کا سامنا ہے اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک مسلم دشمن قوت دہلی میں اقتدار سنبھالنے کی تیاری میں مصروف ہے لیکن کچھ یہی صورت حال تو اس ملک میں گذشتہ پچاس برسوں سے قائم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی بار آپ کے دل و دماغ پر دشمن کی مسلم دشمنی واضح ہوئی ہے اور آپ حکمرانوں کی اسلام دشمنی کا کسی قدر ادراک کر پائے ہیں۔ ہمارے خیال میں موجودہ صورت حال پچھلی تمام صورت حال سے بہتر ہے کہ یہاں آپ کو حکمرانوں کی دشمنی کا ادراک ہے اور آپ کے اردگرد سے تحفظ کا جھوٹا وعدہ کرنے والی پارٹیاں غائب ہو چکی ہیں یا کم از کم ان میں اتنا کس بل نہیں رہ گیا ہے کہ آپ ان سے اپنی حفاظت کی توقع کریں۔ گویا ایک نظام جبر ہے جس میں آپ کو اپنے لئے راستہ بنانا ہے۔ بالفاظ دیگر آپ پہلی بار حقیقت کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کے قابل ہوئے ہیں اور آپ کے اندر یہ احساس بھی پیدا ہو رہا ہے کہ صورت حال کی درستگی کے لئے آپ کو جو کچھ بھی کرنا ہے وہ صرف اپنے بل بوتے پر، گویا پچاس سال کے عرصے میں پہلی بار اسلامیان ہند کا قافلہ اب متحرک ہونے کے لئے پر تول رہا ہے۔

مسلمانوں کے لئے موجودہ صورت حال میں مایوس ہونے یا خوف کھانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جو لوگ چھوٹے محافظوں کے سہارے اس ملک میں زندگی جیتے تھے، انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ان محافظوں نے اسلام اور مسلمان کی حمایت میں زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ نہیں کیا البتہ جو لوگ اپنے لئے اللہ کی حفاظت کو کافی سمجھتے ہیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کی قوت کو کبھی زوال نہیں اور اللہ تعالیٰ آخری رسولؐ کی امت کو کبھی بے سہارا نہیں چھوڑے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان صورت حال کا سچا ادارک کرے، ماضی کی غلطیوں سے اپنا دامن بچائے اور آنے والے دنوں کے لئے ایک جرات مندانہ منصوبہ ترتیب دے، اپنی حفاظت کا کام اور اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کا منصوبہ اغیار کے رحم وکرم پر چھوڑنے کے بجائے اسے اپنی قوت کے مطابق بروئے کار لانے کی کوشش کرے۔ گویا ماضی کی سیاسی بے اعتدالیوں کو یکسر خیرباد کہہ کر ایک نئے رویے کی داغ بیل ڈالنے کا وقت اب آ پہنچا ہے۔ ہم لاکھ چاہیں اب اس ایجنڈے کو مزید مؤخر کرنا ممکن نہیں۔

ہم نے پہلے بھی یہ بات کہی تھی کہ اس ملک میں مسلمانوں کو سیاسی ارتداد سے بچانے کے لئے ایک مسلم سیاسی پارٹی کا قیام ضروری ہے۔ ہم اس صورت حال کو صحیح نہیں سمجھتے کہ جس ملک میں مختلف سیاسی گروہوں اور مذہبی جماعتوں کو سیاسی صف بندی کی اجازت حاصل ہو اور جہاں وہ اس سے کماحقہ فائدہ بھی اٹھا رہی ہوں وہاں مسلمانوں کا سیاسی شیرازہ منتشر رہے، ملک کے ہر نظری گروہ کے پاس تو ایک سیاسی ایجنڈا موجود ہو لیکن مسلمان ایک واضح سیاسی ایجنڈے کی موجودگی کے باوجود دوسری سیاسی پارٹیوں کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے خود کو مجبور پائیں۔ ہم اس صورت حال کو سیاسی ارتداد سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ صورت حال خدا اور اس کے رسولؐ سے بغاوت کے مترادف ہے۔ ہم اسے ایک لمحے کے لئے بھی برداشت کرنا گناہ عظیم تصور کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کو مسلمانوں کی سیاسی صف بندی ایک ناقابل عمل خیال معلوم ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں جہاں مسلمان تھوڑے اور منتشر ہیں، کسی مسلم سیاسی پارٹی کی کامیابی کے امکانات بہت معدوم ہیں۔ اولاً یہ بات عقلی طور پر صحیح نہیں اس لئے کہ اسی ملک میں چھوٹی چھوٹی مذہبی اکائیاں سیاسی صف بندی کے ذریعے ملک کی سیاست پر اثر انداز ہو رہی ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ نئے سیاسی

میزانیے میں مسلمانوں کی سیاسی صف بندی ان کے لئے بہتر حالات پیدا نہ کرے۔ یہ بات وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو سیاسی کھیل کے آداب سے قطعی ناواقف ہوں، بفرض محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ایک مسلم سیاسی پارٹی مسلمانوں کو بہت کچھ دینے میں کامیاب نہیں ہوسکے گی۔ جب بھی اس ایجنڈے کو مؤخر کئے دینا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ ایک نئی سیاسی پارٹی کے قیام سے مسلمانوں پر صرف اقتدار کے دروازے کھلنے کے امکانات پیدا نہیں ہوتے بلکہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے ایجنڈے کو ترک کر کے انہیں ایک اسلامی سیاسی ایجنڈے کے لئے متحرک ہونے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔

اب یہ سوال سیاسی پارٹی کے قائدین پر منحصر ہے کہ وہ مسلمانوں کی سیاسی صف بندی کے ذریعے مستقبل کے اسلامی انقلاب کا راستہ کس طرح ہموار کرتے ہیں۔ سیاسی پارٹی کا قیام فی نفسہ ہمارا ہدف نہیں ہوسکتا البتہ اگر اس ملک میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کسی ایسی پارٹی کے قیام سے کوئی مدد ملتی ہو تو بلا تاخیر اس کے قیام کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہمارے خیال میں ملک میں ایک نئی مسلم سیاسی پارٹی کے قیام سے بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔ اولاً سیاسی سطح پر امت کے اندر جو انتشار پایا جاتا ہے اس کا خاتمہ ہوگا، اندھی گلی میں پھنس جانے کا احساس ختم ہوگا اور مستقبل کی ترتیب و تنظیم کے لئے ایک واضح راستہ ہاتھ آجائے گا۔ ثانیاً مسلمانوں کو یہ معلوم ہوسکے گا کہ ان کے پاس ایک واضح سیاسی ایجنڈا موجود ہے جس سے صرف ان کی دنیا نہیں بنتی بلکہ آخرت میں بھی کامیابی کی ضمانت ملتی ہے۔ مسلمانوں میں اگر یہ احساس عام ہوگیا تو ہمارے منجمد ملی قافلے میں حرکت آجائے گی۔ ثالثاً غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ حسب سابق مسلمانوں کا سیاسی استحصال کرتے رہیں یا بے شعور مسلمانوں کی جدوجہد کی بنیاد پر اپنے سیاسی عزائم کی تسکین کا سامان کریں۔ رابعاً ملک کے عام باشندوں میں یہ احساس ختم ہوگا کہ مسلمان ایک بے سمت گروہ کا نام ہے، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہندوستانی معاشرہ عدل وانصاف کے اسلامی سیاسی ایجنڈے میں دلچسپی محسوس کرے گا جس سے ممکن ہے آنے والے دنوں میں اسلام کی طرف واپسی کی عمومی صورت حال پیدا ہو۔

اس کے برعکس اگر مسلمان موجودہ سیاسی رویے پر گامزن رہے تو رفتہ رفتہ اپنی ملی اور مذہبی شناخت بھی کھودیں گے۔ جس طرح پچاس سال کے عرصے میں شریعت کے نام سے مسلمانوں کے ذہنوں میں نکاح و طلاق اور وراثت کے مسائل آتے ہیں اور یہ عمومی تصور ختم ہوچکا ہے کہ اسلام

کامل اجتماعی زندگی میں شرعی احکامات کی پیروی کا طالب ہے، اسی طرح رفتہ رفتہ یہ تصور بھی ختم ہوجائے گا کہ مسلمانوں کے پاس کوئی اسلامی سیاسی ایجنڈا موجود ہے جس کا نفاذ ان کی مذہبی ذمہ داری ہے۔ اگر صورت حال کو اسی رخ پر چھوڑ دیا گیا اور مسلمانوں کی سیاسی صف بندی نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ سیاسی اور معاشی ارتداد کے بعد مذہبی ارتداد کا سلسلہ شروع ہوجائے اس لئے کہ جو شخص دین کے ایک حصے سے غافل ہوگیا اور جس نے زندگی کے ایک گوشے میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے بغاوت کی اس کے لئے دوسرے گوشے میں بغاوت کی راہ پر چل نکلنا آسان ہوجاتا ہے۔ صرف زبان پر کلمہ جاری ہو اور عملی زندگی کفر کی اتباع میں لت پت ہو تو اس طرح کسی کو زیادہ دنوں تک مسلمان بناکر نہیں رکھا جاسکتا۔ بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمانوں میں غیر اسلامی سیاسی کلچر نے کچھ اس طرح اپنے پنجے جمائے ہیں کہ ان کا نظری سرمایہ اور ان کے اندر ایک انقلابی امت کا احساس بڑی تیزی سے تحلیل ہوتا جارہا ہے، یہ ایک انتہائی خطرناک صورت حال ہے۔ اس کے سد باب کے لئے ضروری ہے کہ اسلامیان ہند کے قافلے کو ایک کامل اسلامی ایجنڈے کے تحت متحرک کردیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس عظیم مقصد کے لئے بلاتاخیر مسلمانوں کی صف بندی کا کام شروع ہوجائے۔ نئی مسلم سیاسی پارٹی دراصل اسی طرف ایک قدم ہوگی۔

مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کے فیصلے سے اور کچھ ہو یا نہ ہو اتنا تو ضرور ہوگا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی قبلہ درست ہوجائے گا۔ جو لوگ اب تک مختلف پارٹیوں میں نام نہاد سیکولرازم اور ڈیموکریسی کے استحکام کے لئے سرگرم تھے انہیں یہ معلوم ہوجائے گا کہ ان اجنبی خیالات کی ترویج و اشاعت کے بجائے ہمارے لئے کرنے کا کام اسلامی نظام عدل کا قیام ہے۔ اب اس مقصد کے لئے ہمیں خواہ کوئی بھی ترکیب اختیار کرنی پڑے، خواہ اس کے لئے الیکشن کا راستہ اختیار کرنا پڑے یا سیاسی عمل سے دور رہنا مفید ہو، البتہ ہر حال میں اسی مقصد کو آگے بڑھانے کی فکر کرنی ہے۔ اگر نئی سیاسی پارٹی صرف اس فکر کو مسلمانوں میں عام کرنے میں کامیاب ہوگئی تو ہم سمجھیں گے کہ انقلاب اسلامی کا خوابیدہ کارواں حرکت میں آگیا ہے اور اگر ایک بار صورت حال کے صحیح ادراک کے بعد امت میں تبدیلی کا احساس عام ہوگیا تو زیادہ موثر اور کارگر ترکیبوں کا ڈھونڈ نکالنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

الیکشن ختم ہوچکا ہے لیکن ہمارا کام ختم نہیں ہوا ہے بلکہ ہم نے تو اب اس کام کا آغاز کیا ہے۔

ملک بھر میں ایک مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کے لئے مختلف سطح پر صلاح و مشورے کئے جارہے ہیں۔ جلد ہی بڑے پیمانے پر عوامی رابطے کا پروگرام بنایا جائے گا۔ ہمارے نمائندے ہر قابل ذکر مسلم آبادی میں پہنچیں گے اور ہر مسلمان کے دل پر دستک دیں گے۔ امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل، مرد ہو یا عورت ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنی بساط بھر اس انقلابی قافلے کو ہر ممکن تعاون دے۔ ایک روشن مستقبل کے لئے امت کے جانبازوں نے صرف اللہ کی نصرت کے بھروسے کام کا آغاز کر دیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کا شمار پیچھے رہ جانے والوں میں ہو۔

والسلام

آپ کا بھائی

راشد شاز

مسلم سیاسی پارٹی کی حمایت اور نصرت کے لئے
قائد ملی کا مکتوب

برادران اسلام اور دختران ملت ! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

یہ بات یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ ملی پارلیامنٹ اپنی قیام کے ابتداء سے ہی ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی صف بندی کے لئے کوشاں رہی ہے۔ گذشتہ پچاس برسوں کی سیاسی تجربے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس ملک میں اگر مسلمانوں کو اپنی ملی اسلامی زندگی عزیز ہے تو انہیں ہر صورت میں اپنی شیرازہ بندی کا کام انجام دینا ہوگا۔ ہم کسی ایسی شیرازہ بندی کو مکمل نہیں سمجھتے جس میں سیاسی زندگی کو ملی زندگی سے یکسر علیحدہ کر دیا گیا ہو۔ ہمیں اس صورت حال پر شدید تشویش ہے کہ آج امت مختلف غیر مسلم سیاسی آقاؤں کی اتباع میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ہم اس صورت حال کو فکری اور عملی ارتداد سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے ہر صورت میں بدل ڈالنا اپنا مذہبی فریضہ جانتے ہیں۔

اس حقیقت سے تو شاید اب کسی کو اختلاف نہ ہو کہ اس ملک کی موجودہ تمام سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کے لئے مخلص نہیں ہیں۔ ان میں نہ کوئی سیکولر ہے اور نہ کوئی فرقہ پرست۔ یہ سب دراصل غلیظ کفر کی مختلف شکلیں ہیں جن سے دامن بچانے میں ہی ہمارے ملی وجود کی سلامتی ہے۔ آپ یقیناً اس بات سے بھی انکار نہیں کریں گے کہ فی زمانہ پچیس کروڑ ہندوستانی مسلمان سیاسی زندگی میں ایک خوفناک خلاء محسوس کرتے ہیں۔ انہیں یہ پتہ ہی نہیں کہ جانا کدھر ہے؟ اور یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی شریعت سیاسی محاذ پر ان سے کس عمل کا مطالبہ کرتی ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ پوری امت پر کفار و مشرکین کے مختلف گروہوں نے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں باشعور لوگ کھلے عام مختلف غیر اسلامی ایجنڈوں کے لئے کام کر رہے ہیں۔ کوئی اس ملک پر گاندھی کا خواب مسلط کرنا چاہتا

ہے تو کسی کو اصرار ہے کہ امبیڈکر کا سماجی انصاف اس ملک میں طلوع ہو۔ کوئی ہندو احیاء پرستوں کے خاکے میں رنگ بھرنے میں مصروف ہے تو کسی کو کمیونسٹوں کے عزائم کی تکمیل پر اصرار ہے۔ یہ کتنی بڑی بد قسمتی ہے کہ آج اس ملک میں آخری رسولؐ کی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایجنڈے کو چھوڑ کر علی الاعلان باطل ایجنڈے کو بروئے کار لانے میں اپنی قوت صرف کر رہی ہے۔ اسی پر بس نہیں بعض چوٹی کے اہل علم اور حاملین شریعت سیکولر جمہوری قدروں کی بحالی کے لئے خم ٹھوک کر میدان میں آگئے ہیں۔ البتہ کسی کو اس بات کی کم ہی فکر ہے کہ سابق دار الاسلام ہندوستان کو دوبارہ دار الاسلام بنانے کے لئے کیا کچھ کرنا چاہیے۔

اللہ کا خاص فضل ہے کہ اس نے مٹھی بھر لوگوں کو یہ توفیق دی کہ وہ ملی پارلیامنٹ کے مختلف اجلاس میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی غلامی کے سدباب کی فکر کریں۔ پٹنہ کے سیاسی اجلاس میں (منعقدہ جنوری ۱۹۹۶ء) مسلم سیاسی بل کی منظوری کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو بجا طور پر یہ امید بندھی تھی کہ ہم سیاسی محاذ پر مزید رہنمائی کے لئے آگے آئیں گے۔ مارچ ۱۹۹۷ء کے مذہبی اجلاس (منعقدہ ہبلی کرناٹک) میں یہ بات اصولی طور پر طے کر دی گئی کہ ہندوستانی مسلمان اپنی سیاسی صف بندی کے لئے ایک علیحدہ ملک گیر سیاسی پارٹی وجود میں لے آئیں۔ اس فیصلے کے بعد مختلف سطح پر مسلم سیاسی پارٹی کے خدوخال پر بحث و مباحثہ شروع ہو گیا۔ اخبارات کے کالم میں اس کی حمایت و مخالفت میں مضامین شائع ہونے لگے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے کسی فیصلے نے نظام کفر کو اتنا پریشان نہ کیا ہوگا جتنا اس دور رس سیاسی فیصلے نے انہیں خوفزدہ کر دیا۔ خاص طور پر وہ سیاسی پارٹیاں جو مسلم مسیحائی کا دعویٰ کرتی ہیں اور جو مسلم ووٹوں پر ایوان میں پہنچتی ہیں انہیں اس فیصلے میں اپنی موت نظر آئی لہٰذا ایک منصوبہ بند کوشش کے تحت انگریزی اخبارات میں ملی پارلیامنٹ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا۔ مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ یہ خطرناک لوگ ہیں، ان کے عزائم غیر جمہوری اور غیر دستوری ہیں۔ خاص طور پر حالیہ لوک سبھا انتخابات کے موقع پر حامیان ملی پارلیامنٹ کو ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی لیکن تب بھی اللہ کے فضل سے ہم کسی لالچ یا دباؤ میں نہیں آئے اور دہلی کے خصوصی اجلاس (منعقدہ فروری ۱۹۹۸ء) میں امت کے نام جو پیغام جاری کیا گیا اس میں بصراحت یہ بات کہی گئی کہ شریعت کی رو سے مسلمانوں کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ کفار و مشرکین کی سیاسی بالادستی کے

لئے اپنے ووٹ کا استعمال کریں۔ ہم نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ جب تک مسلمانوں کی ایک علیحدہ مسلم سیاسی پارٹی وجود میں نہیں آتی اور جب تک ایک اسلامی متبادل سامنے نہیں آتا وہ اپنے ووٹ محفوظ رکھیں اس لئے کہ ووٹ ایک امانت ہے اور شرعی طور پر ہمارے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ ہم اس امانت کو کسی غیر اسلامی نظام کے استحکام کے لئے استعمال کریں۔

دہلی کے خصوصی اجلاس میں مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کے لئے جو لائحہ عمل ترتیب دیا گیا تھا اللہ کے فضل سے اب وہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔ اس سے پہلے کہ ایک ملک گیر سیاسی پارٹی کا باقاعدہ اعلان کیا جائے، ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ امت کے دردمند حضرات سے مشورے اور تعاون کی درخواست کریں۔ آپ کی خدمت میں یہ عریضہ ہم اسی مقصد کے تحت ارسال کر رہے ہیں۔ توقع ہے ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ سیاسی بے سمتی کے ازالے میں آپ ہمیں بھرپور تعاون سے نوازیں گے۔ البتہ اگر ہماری معروضات مزید تفصیل چاہتی ہوں یا آپ کو کسی خاص نکتہ کی وضاحت مطلوب ہو جب بھی ہم سے رابطہ کرنے میں نہ ہچکچائیں۔ انشاء اللہ تعاون کے حصول میں آپ ہمیں مستعد اور مخلص پائیں گے۔

والسلام

آپ کا بھائی

راشد شاز

دستاویزات

- سیاسی اجلاس کے لئے جاری کئے جانے والے دعوت نامے کا مکمل متن
- مسلم سیاسی بل کا پس منظر
- مسودہ مسلم سیاسی بل
- ملی فرمان
- مسلم منشور
- مسلم رائے دہندگان کا منشور

ہم نے مسلمانوں کو کافر سیاسی قیادت سے نکال کر مسلم سیاسی قیادت کے تحت جمع کرنے کی کوشش کی ہے

(۱۹۹۶ء پٹنہ اجلاس کے لئے دعوت نامہ کا متن)

برادران گرامی اور دختران ملت!

ہندوستان اس وقت حیرت انگیز تبدیلیوں کی زد میں ہے۔ سیاسی اتھل پتھل اور نئے نئے سیاسی نظریات کے عروج نے گذشتہ چند سالوں میں سیاسی دنیا کی کایا پلٹ دی ہے۔ قومی سطح کی پارٹیاں سکڑتی جارہی ہیں اور خالص فرقہ وارانہ یا ذات پات کی سیاست نے ملک کی سیاسی شہ رگ پر اپنے پنجے سخت کرنے شروع کردئے ہیں۔ کہیں نیچی ذات والوں کی حکومت ہے تو کہیں بڑی پارٹیوں کا غلبہ، کہیں فاشسٹ نظریات نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے تو کہیں نسل پرست برہمن اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ البتہ بے چارہ مسلمان کہیں کنارے کھڑا رہ گیا ہے۔ اسے افسوس ہے کہ اس کے ہاتھ وعدوں کی ٹوکری اور تالیوں کی آواز کے علاوہ کچھ بھی نہیں آیا۔ ایسا بھی نہیں کہ گذشتہ نصف صدی میں وہ سیاسی جدوجہد سے دور رہا ہو، اس نے ہر پارٹی میں قسمت آزمائی کی۔ کبھی کانگریس کا حاشیہ بردار بنا تو کبھی اپوزیشن کی دوسری چھوٹی بڑی پارٹیوں پر اپنا سب کچھ نچھاور کردیا لیکن اس کی ہر کوشش نے کچھ دینے کے بجائے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا۔ یہ ہے وہ سیاسی صورت حال جس سے آج ہر دردمند مسلمان پریشان ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں دین کا علم عام ہونے اور علمائے کرام کی اتنی بڑی تعداد کی موجودگی کے باوجود آخر یہ کیسے ممکن ہوا کہ خدا کے آخری رسولؐ کی امت کی سیاسی قیادت ظالموں کے حوالے کردی گئی ہو اور اس فاش غلطی کو مسلمانوں کی حمیت ایمانی نے برداشت کرلیا ہو۔ کتنے جری ہیں وہ

لوگ جو دین اور شریعت کا علم رکھنے کے باوجود مسلمانوں کو کسی کافر سیاسی قائد کا تابع بنانے کی کوششوں میں آج بھی سرگرداں ہیں۔ کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ امت مسلمہ کا کام اس ملک کو روحانی اور سیاسی قیادت دینا ہے کہ ان کے پاس خدا کا آخری پیغام آج بھی موجود ہے اور اس پیغام کی موجودگی میں وہ کسی شخص، پارٹی یا سیاسی نظریے کی اتباع نہیں کر سکتی۔

گذشتہ نصف صدی سے اس قسم کی سیاسی قیادت قبول کر لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بیس کروڑ کی امت مسلمہ اپنا امتیازی وصف کھو چکی ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ وہ اس ملک میں زندہ کیوں ہے؟ اس کے لئے کرنے کا کام کیا ہے اور کیا نہیں؟ یہ بات اب اس کے خیال میں کم ہی آتی ہے کہ اس پر اس ملک میں انصاف کے قیام کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور یہ کہ حالات خواہ کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں اللہ کی مدد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت عملی کے ذریعے اسے اس ملک کی قیادت کا کام اپنے ذمہ لے لینا چاہئے۔ لیکن افسوس چند معمولی مراعات اور زندگی جینے کے جھوٹے وعدوں کے طفیل سرکار و دربار سے تعلق رکھنے والے علماء نے خدا کے آخری رسولؐ کی امت کو مکروہ سیاسی جادوگروں کے پاس رہن رکھ دیا ہے۔ اب عالم یہ ہے کہ اسلامی علامتیں یکے بعد دیگرے تباہ کی جا رہی ہیں۔ بابری مسجد کی تباہی کے بعد چرار شریف کا واقعہ پیش آیا لیکن کمزور و بے بس امت میں موثر احتجاج کا کس بل بھی نہیں۔ طرہ یہ کہ یونیفارم سول کوڈ کی دھمکی ہے اور بعض ریاستوں نے اس کو عملاً نافذ کرنے کی دھمکی بھی دے دی ہے۔

عام ہندوستانی مسلمان سخت شکست خوردگی اور بے بسی کے عالم میں پوچھتا ہے ہائے وہ کیا کرے؟

اس ملک میں کسی بھی مسلم سیاسی تبدیلی کے لئے راستے بند کر دئے گئے ہیں۔ الیکشن کا نظام کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ مستقبل قریب تو کیا قیامت تک بھی موجودہ نظام الیکشن کے ذریعے کسی مسلم سیاسی قوت کے احیاء کا امکان مفقود ہے۔ پچاس سال کی سیاسی غلامی کو قائم رکھنے کے لئے سارے قانونی حیلے موجود ہیں۔ اب بھلا مسلمان کرے تو کیا کرے؟ یہ حقیقت مسلمانوں کو کون بتائے کہ اسلام کی رو سے جو قانون انصاف کا احترام نہ کرے اس قانون کا احترام نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا میں بڑے بڑے ظالموں نے قانون ہی کا سہارا لیا ہے اور بڑے بڑے مظالم قوانین ہی کے سہارے انجام پاتے ہیں۔ خود اس ملک میں منو کا قانون اس قبیل کی بہترین مثال ہے۔ فرعون کا بنی اسرائیل کے نونہالوں کا قتل اور عرب کے جاہلی معاشرے میں معصوم بچیوں کو زندہ درگور کرنے کی

رسم بھی وقت کے معاشرے میں قانون کا درجہ رکھتی تھی لہٰذا کسی چیز کو محض قانون بن جانے سے احترام حاصل نہیں ہو سکتا۔

نئے طرز فکر کی ضرورت

ہم نے بہت غور کیا کہ موجودہ ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کو ایک سیاسی قوت میں تبدیل کرنے کے لئے اس نظام کے اندر موجودہ سہولتوں کا سہارا لیا جائے لیکن ہم گہرے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس ملک کے سیاسی نظام میں جب تک بعض مؤثر تبدیلیاں نہ کی جائیں مسلمانوں کو سیاسی انصاف ملنے کا تصور عبث ہے۔ ہم اس رویے کو بھی شکست خوردہ رویے کی پیداوار گردانتے ہیں جو بیس کروڑ کی زبردست عددی قوت کو کبھی ایک مفاد پرست سیاسی پارٹی تو کبھی دوسری مفاد پرست سیاسی پارٹی کی جھولی میں ڈالنے کو سیاسی حکمت عملی کا نام دیتا ہے۔ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ اس ملک کی کسی بھی سیاسی پارٹی کو مسلمانوں کے مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پچاس سال تک برہمن کانگریس کے ضمیمہ بنے رہنے کے بعد اب اگر مسلمان دلتوں اور پچھڑی ذاتوں کے ذریعہ استعمال ہونے لگیں تو اس سے سیاسی غلامی کا اندھیرا کم نہیں ہوتا۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنی اصل قوت کا صحیح اندازہ کریں۔ آخر آپ اس حقیقت سے بے خبر کیوں ہیں کہ نئی دہلی میں کوئی بھی حکومت آپ کے فیصلے کے بغیر نہیں بن سکتی۔ یہ حکمراں خواہ دہلی کی کرسی پر براجمان ہوں یا ریاستیں ان کی تحویل میں آگئی ہوں، دراصل یہ ہمارے معصوم سادہ لوح ووٹوں کا ہی نتیجہ ہے کہ جب آپ نے کانگریس کو من حیث القوم اپنا تعاون دینے سے انکار کر دیا تو ساری سیاسی تگڑم بازی کے باوجود اس کا سورج اس صوبے میں غروب ہو گیا۔ اب ضرورت ہے کہ ہم سیاسی شعور کے اصل مرحلے پر توجہ کریں، ایک قدم اور بڑھائیں اور حکمرانی کا کام کسی اور کے سپرد کرنے کے بجائے اس پر بذات خود قبضہ کر لیں۔ یقیناً یہ مشکل کام ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اسی عمل میں آپ کا مستقبل محفوظ ہے اور خود اس ملک کا بھی۔

ملی پارلیامنٹ امت مسلمہ کو مشرکین کی سیاسی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے اٹھی ہے۔ وہ یہ چاہتی ہے کہ مسلمان اپنی صحیح قوت کا اندازہ کریں اور جن لوگوں نے مصنوعی طور پر مسلمانوں کو اقلیت باور کرانے کی کوشش کی ہے ان کی سازشوں سے ہر لحظہ باخبر رہیں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ملی

رسم بھی وقت کے معاشرے میں قانون کا درجہ رکھتی تھی لہٰذا کسی چیز کو محض قانون بن جانے سے احترام حاصل نہیں ہو سکتا۔

نئے طرز فکر کی ضرورت

ہم نے بہت غور کیا کہ موجودہ ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کو ایک سیاسی قوت میں تبدیل کرنے کے لئے اس نظام کے اندر موجودہ سہولتوں کا سہارا لیا جائے لیکن ہم گہرے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس ملک کے سیاسی نظام میں جب تک بعض مؤثر تبدیلیاں نہ کی جائیں مسلمانوں کو سیاسی انصاف ملنے کا تصور عبث ہے۔ ہم اس رویے کو بھی شکست خوردہ رویے کی پیداوار گردانتے ہیں جو بیس کروڑ کی زبردست عددی قوت کو کبھی ایک مفاد پرست سیاسی پارٹی تو کبھی دوسری مفاد پرست سیاسی پارٹی کی جھولی میں ڈالنے کو سیاسی حکمت عملی کا نام دیتا ہے۔ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ اس ملک کی کسی بھی سیاسی پارٹی کو مسلمانوں کے مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پچاس سال تک برہمن کانگریس کے ضمیمہ بنے رہنے کے بعد اب اگر مسلمان دلتوں اور پچھڑی ذاتوں کے ذریعہ استعمال ہونے لگیں تو اس سے سیاسی غلامی کا اندھیرا کم نہیں ہوتا۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنی اصل قوت کا صحیح اندازہ کریں۔ آخر آپ اس حقیقت سے بے خبر کیوں ہیں کہ نئی دہلی میں کوئی بھی حکومت آپ کے فیصلے کے بغیر نہیں بن سکتی۔ یہ حکمراں خواہ دہلی کی کرسی پر براجمان ہوں یا ریاستیں ان کی تحویل میں آگئی ہوں، دراصل یہ ہمارے معصوم سادہ لوح ووٹوں کا ہی نتیجہ ہے کہ جب آپ نے کانگریس کو من حیث القوم اپنا تعاون دینے سے انکار کر دیا تو ساری سیاسی تگڑم بازی کے باوجود اس کا سورج اس صوبے میں غروب ہو گیا۔ اب ضرورت ہے کہ ہم سیاسی شعور کے اصل مرحلے پر توجہ کریں، ایک قدم اور بڑھائیں اور حکمرانی کا کام کسی اور کے سپرد کرنے کے بجائے اس پر بذات خود قبضہ کر لیں۔ یقیناً یہ مشکل کام ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اسی عمل میں آپ کا مستقبل محفوظ ہے اور خود اس ملک کا بھی۔

ملی پارلیامنٹ امت مسلمہ کو مشرکین کی سیاسی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے اٹھی ہے۔ وہ یہ چاہتی ہے کہ مسلمان اپنی صحیح قوت کا اندازہ کریں اور جن لوگوں نے مصنوعی طور پر مسلمانوں کو اقلیت اور کرانے کی کوشش کی ہے ان کی سازشوں سے ہر لحظہ باخبر رہیں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ملی

پارلیامنٹ کی سیاسی امور کی کمیٹی نے بڑے پیمانے پر مشوروں کی روشنی میں سیاسی بل کا ایک مسودہ تیار کرلیا ہے جسے اب بحث کے لئے عنقریب ملی پارلیامنٹ کے پٹنہ اجلاس میں پیش کیا جانے والا ہے۔ مذکورہ بل دراصل اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ اس ملک میں امت کو ابھی اس اس کا سیاسی حق ملنا باقی ہے۔ ذرا غور کیجیے؛ اٹھاسی کروڑ آبادی والے اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق کوئی بیس کروڑ ہے۔ اب اگر متناسب نمائندگی کا فارمولا بھی اختیار کیا جائے تو ۵۴۴ نشستوں کی پارلیامنٹ میں مسلمانوں کو ۱۱۹ نشستیں ملنی چاہئے تھیں، جب کہ اب تک پارلیامنٹ کے اندر مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ۴۸ رہی ہے۔ یہ بھی ایک استثنائی تعداد ہے جو ۱۹۷۹ء کے الیکشن میں دیکھنے کو ملی۔ اب بھلا جس امت کو مختلف سیاسی پارٹیوں میں بٹنے کے بعد بھی اس کی تعداد کے مطابق نمائندگی نہ مل سکے تو اس کے سیاسی حقوق کی بات کیسے سوچی جاسکتی ہے۔ جو نظام نیچے سے اوپر تک دجل و فریب پر قائم ہے، جہاں دانستہ طور پر مسلمانوں کی عددی قوت کو کم کر کے دکھایا جاتا ہو، جہاں سیاسی حلقوں کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہو کہ مسلم ووٹ بے اثر ہوجائیں، جہاں مسلمانوں کو سیاسی غلام بنائے جانے کی ہر ڈھکی چھپی ترکیب پر نہایت عیاری سے عمل ہورہا ہو، بھلا اس نظام میں مسلمانوں کا کوئی سیاسی مستقبل کیوں کر ہوسکتا ہے؟

پٹنہ اجلاس میں سیاسی بل کی پیشی کی وجہ سے اس کی اہمیت تاریخی اور اسٹریٹیجک ہوگئی ہے۔ اللہ کی نصرت کے سہارے ہم نے ایک انقلابی فکر کو عام کرنے اور مسلمانوں کو کافر سیاسی قیادت سے نکال کر مسلم سیاسی قیادت کے تحت جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بذات خود اتنا بڑا انقلابی قدم ہے کہ اس سے آنے والے دنوں میں سیاسی غلامی کی زنجیریں کٹ سکتی ہیں۔ اس اجلاس کی کامیابی کے لئے اور مسلمانوں میں اس شعور کو عام کرنے کے لئے آپ سے جو کچھ بن پڑے ضرور کیجئے۔ آپ کا مال اور آپ کی جان اللہ کی امانت ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ و تفوق کے لئے جو کوشش بھی کی جائے اس میں آپ کی حتی الامکان شرکت اور انتہائی درجے کا تعاون لازمی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی بے دلی اور سست روی اس انقلابی مشن کی ناکامی کا سبب بن جائے کہ اگر ایسا ہوا تو ایک طویل مدت تک اس کام کو اس ملک میں انجام دینے کا کسی میں حوصلہ نہ ہوگا۔

یاد رکھئے۔ آپ تاریخ کے انتہائی نازک موڑ پر اس سرزمین پر موجود ہیں۔ تاریخ ایک نیا رخ لینے

والی ہے اور امت کے بعض متوالوں اور فدائین اسلام کے ایک قابل ذکر گروہ نے اس ملک میں اسلام کے روشن مستقبل کے لئے اپنا سب کچھ قربان کردینے کا تہیہ کرلیا ہے۔ وہ اس راہ میں کچھ دور چل بھی چکے ہیں۔ ملی پارلیامنٹ کی انقلابی دعوت اور اس ملک کو الٰہی ہدایت میں رنگنے کا عزم اب ہم میں سے بہتوں پر منکشف ہوچکا ہے۔ تاریخ کے اس نازک لمحے میں ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اس انقلابی مشن کو اپنے خون کا آخری قطرہ تک مہیا کرے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کے غلبہ کی راہ میں سب کچھ قربان کرنے کی توفیق عطا کرے اور اس عمل کو اپنی بارگاہ میں قبولیت عطا فرمائے۔

آپ کا بھائی

راشد شاز

مسلم سیاسی بل کا پس منظر

تلخ سیاسی حقائق

ایک محتاط اندازے کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کوئی بیس کروڑ ہے جو مجموعی آبادی کا تقریباً بائیس اعشاریہ دو فیصد (22.2) ہے۔ لیکن یہ ایک عجب تاریخی مذاق ہے کہ اتنی بڑی عددی قوت کو ایک بے بس اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے جس کا ملک کے معاملات میں عملی طور پر عمل دخل صفر کے برابر ہے۔ سیاسی طور پر اگر ان کی کوئی اہمیت ہے تو صرف اتنی کہ الیکشن کے وقت وعدوں کے سبز باغ دکھا کر مختلف سیاسی پارٹیاں ان کا استحصال کرتی رہیں۔ گزشتہ پچاس سالوں سے بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو محض ایک ووٹ بینک کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ کبھی ڈرا دھمکا کر، کبھی فسادات کا ہوا کھڑا کر کے، کبھی جان و مال کے اتلاف کا عملی ڈرامہ رچا کر اور کبھی وعدوں کے سبز باغ دکھا کر سیاسی پارٹیوں نے اس امت کو اپنا دست نگر بنا رکھا ہے۔ باور یہ کرایا گیا ہے کہ اس ملک میں تم اقلیت میں ہو۔ تم نے پاکستان بنا کر اپنا حصہ پالیا ہے۔ اب بھلا تمہارا اس ملک میں اگر کوئی رول ہو سکتا ہے تو بس یہی کہ خاموشی سے جیئے جاؤ اور اس طرح جیو جس طرح ہم جینے دیں۔ حالانکہ اعداد و شمار کی عملی قوت اس کے برعکس ہے۔ اگر مسلمان اس ملک میں صرف بائیس فیصد ہیں تو دوسری قومیں بھی اکثریت کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ اب جو لوگ اس ملک پر گزشتہ پچاس سالوں سے حکومت کرتے رہے ہیں ان کی عددی قوت کا بھی اندازہ لگایئے۔ برہمن مجموعی آبادی کے سات فیصد سے زیادہ نہیں اسی طرح اونچی ذات کی دوسری برادریوں کی علیحدہ رائے شماری انہیں قلیل اقلیت میں تبدیل کیئے دیتی ہے۔ رہی نیچی ذات کی قومیں تو یہ بھی اپنی اپنی بنیادوں پر غیر مشروط اکثریت ثابت کرنے میں ناکام ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو آج بھی دوسری تمام قوموں کے مقابلے میں مسلمان ایک عظیم الشان عددی قوت ہیں پھر بھلا انہیں اقلیت

کے خوف میں مبتلا کئے دینے کے پیچھے اس کے علاوہ اور کیا عوامل ہوسکتے ہیں کہ ان کے عزائم کا کس بل نکال دیا جائے اور اس طرح ایک عظیم الشان نظریاتی گروہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ملک کے معاملات سے بے دخل کر کے ایک بے بس زندگی جینے پر مجبور کر دیا جائے۔

گزشتہ پچاس سالوں کے سیاسی تجربے کے بعد آج ہندوستانی مسلمانوں پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہوچکی ہے کہ موجودہ سیاسی نظام میں ان کے جائز سیاسی حقوق کا تحفظ ممکن نہیں۔ فی زمانہ جب ہر سیاسی پارٹی کا مکروہ مسلم دشمن چہرہ کھل کر سامنے آچکا ہے، جب ہر مشرک سیاسی قیادت کے ہاتھ مسلم خون سے رنگین ہیں، جب بلا استثنیٰ ہر سیاسی پارٹی کا منافقانہ رویہ پوری طرح بے نقاب ہوچکا ہے، جمہور امت کا یہ احساس ہے کہ کوئی بھی قومی سیاسی پارٹی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مخلص نہیں ہے۔ اس سنگین صورت حال میں یہ احساس شدت سے سر اٹھانے لگا ہے کہ سیاست کی موجودہ اندھی گلی سے نکلنے کی کوئی راہ دریافت کی جائے۔

یہ احساس بھی عام ہے کہ موجودہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کے واقعی نمائندوں کے لئے پارلیامنٹ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ رہے سیاسی پارٹیوں کے ذریعہ نامزد کردہ مسلمان تو ان کی حیثیت ہمیشہ اکثریتی فرقے کے نامزد کردہ زر خرید غلام کی ہوتی ہے جو اپنا اولین فریضہ اپنے سیاسی آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کو قرار دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اکثریت کے ذریعہ نامزد کردہ لوگ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ یہ اپنے مسلم نام کے باوجود دراصل اکثریتی فرقے کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہندوستانی سیاست میں واقعی مسلم نمائندگی کے دروازے کھولے جائیں اور مسلمانوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے حقیقی نمائندے ہندوستانی پارلیامنٹ اور مختلف ریاستی اسمبلیوں میں بھیج سکیں اور یہ جبھی ممکن ہے جب مخلوط طریقہ انتخاب کو ختم کر کے متناسب نمائندگی کی بنیاد پر جداگانہ انتخاب کا طریقہ عمل میں لایا جائے۔ جہاں ہر مذہبی، ثقافتی اور نظریاتی گروہ کو اپنی آرزوؤں کے مطابق اس ملک کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ ادا کرنے کا موقع مل سکے۔

سیاسی انصاف کے قیام کے لئے متناسب نمائندگی کو تسلیم کر لینا پہلا مرحلہ ہوگا۔ جو لوگ قوموں کی تاریخ سے واقف ہیں اور جو حالات کے جبر اور تاریخ کی قوتوں کا ادراک رکھتے ہیں انہیں یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ کوئی بھی قوم زیادہ دنوں تک جبر اور ظلم کے سہارے مجبور اور بے بس بنا کر نہیں رکھی جاسکتی

اور اگر انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کے لئے پر امن تبدیلی کے راستے نہیں کھولے جاتے تو یہ تبدیلی تشدد اور توڑ پھوڑ کے راستے سے آتی ہے۔ تاریخ کا یہ ایسا جبر ہے جسے دنیا کی کوئی قوت ٹال نہیں سکتی۔ وطن عزیز کو کسی خانہ جنگی سے بچانے اور ایک پر امن مستقبل میں داخل کرنے کے لئے لازم ہے کہ ہم انصاف کے بنیادی اصولوں کا پاس رکھتے ہوئے پر امن تبدیلی کے لئے جلد از جلد راستہ ہموار کریں۔

گذشتہ دس برسوں میں فسطائیت نے جس تیزی سے سر ابھارا ہے اور ہندو احیاء پرستی قدیم ہندو ثقافت کے فروغ کے لئے جس طرح کوشاں رہی ہے اس سے اس بات کا واضح اشارہ ملتا ہے کہ اس ملک میں مستقبل بعید میں بھی ایک خالص سیکولر معاشرے کا قیام غیر حقیقت پسندانہ خیال ہے۔ پھر ہندو احیاء پرستی جس شدت کے ساتھ مسلم ثقافت سے برسرپیکار ہے اور تمام مسلم ثقافتی اور مذہبی علامتوں کو یکسر ختم کر دینے کے درپے ہے، اس سے بھی اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ آنے والے دنوں میں ایک تباہ کن خانہ جنگی اس ملک کے مقدر میں ہے۔ ہندو احیاء پرستی اس ملک کو مسلسل ایک خون آشام طوفان کی طرف دھکیل رہی ہے۔ ایسی صورت میں مختلف تہذیبوں اور مذاہب کو پر امن زندگی کی ضمانت دینے کے لئے لازم ہے کہ ایک ایسے ہندوستان کا خاکہ ترتیب دیا جائے جس میں آزادانہ اور منصفانہ طور پر تمام مذہبی گروہ کو پر امن زندگی کی ضمانت ملتی ہو اور ایسا اسی وقت ممکن ہے جب عظیم جمہوری ہندوستان کو مختلف ثقافت کے وفاقی گہوارے میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس طرح ایک سو بائیس چھوٹے چھوٹے تہذیبی وفاق کا ہندوستان امن و آشتی کی ایسی نظیر قائم کرے گا جس میں تمام مذہبی اور ثقافتی گروہ مشترکہ احساس کے تحت ملک کی ترقی کے لئے کام کر سکیں گے گو کہ یہ تمام وفاقی ریاستیں اپنے اپنے معاملات میں کلی طور پر آزاد ہوں گی البتہ دفاع اور خارجہ پالیسی کے امور مرکز کے زیر نگراں ہوں گے۔

سابقہ تلخ سیاسی تجربات اور حالات کے جبر کے تحت آج کے ہندوستانی مسلمان اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کو خانہ جنگی اور ٹوٹ پھوٹ سے بچانے کے لئے متناسب نمائندگی اور ثقافتی وفاق کی تجویز پیش کر کے اس ملک کے نئے معماروں کی صف اول میں اپنے آپ کو شامل کرنے کا فخر حاصل کر سکیں۔

نئی سیاسی تجاویز کے محرکات

اگر حکومت کی مردم شماری کے اعداد و شمار کو ہی صحیح تسلیم کر لیا جائے جب بھی اس ملک میں

مسلمانوں کی آبادی بارہ فیصد سے کم نہیں ہے، جس کے مطابق لوک سبھا کی ۵۴۴ نشستوں میں ان کا حصہ ۹۳ نشستیں قرار پاتی ہیں جب کہ اب تک مسلمان کہلائے جانے والے پارلیمانی اراکین کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۴۸ تک پہنچی ہے۔ یعنی 8.8 فیصد۔ یہ بھی ایک اسثنائی تعداد ہے جو صرف ۱۹۷۹ء میں دیکھنے کو ملی۔ گویا خود حکومت کے اپنے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کو ہمیشہ اپنی تعداد سے بہت کم نمائندگی ملی ہے۔ بلکہ بعض جگہوں پر ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری کی پوری ریاستی اسمبلی مسلمانوں کے وجود سے محروم رہی ہے۔ مدھیہ پردیش کی موجودہ اسمبلی اس قبیل کی بہترین مثال ہے۔ اب اگر یہ حقیقت ہے کہ موجودہ سیاسی نظام میں سیاسی پارٹیوں کے پسندیدہ مسلمان بھی مسلم تناسب کے اعتبار سے نشستیں حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں تو بھلا اس نظام کو مزید جاری رہنے کے لئے کیا اخلاقی جواز ہے۔ سیاسی انصاف کا قیام دستور کی تمہید میں کیا گیا ایک وعدہ ہے۔ پھر ایک ایسے نظام سے جو سیاسی انصاف کی کھلی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہو ایک ایسے غیر دستوری عمل کو جاری رکھنے کے لئے کوئی موثر دلیل نہیں لائی جاسکتی لہٰذا ایک نئے سیاسی متبادل کی تلاش کا کام وقت کی اہم ضرورت ہے۔

مابعد انہدام ہندوستان میں یہ احساس بھی عام ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے نامزد کردہ مسلم اراکین پارلیامنٹ یا مسلم وزراء مسلمانوں کی حقیقی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ یہ دراصل اپنی پارٹیوں کے نمائندہ ہوتے ہیں جن کا بنیادی کام متعلقہ پارٹیوں کے مفاد کی حفاظت کرنا ہوتا ہے اور ان سے ایک سیکولر جمہوری ڈھانچے میں یہی توقع بھی کی جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مرکز میں مسلم وزراء کی موجودگی کے باوجود دن کی روشنی میں غیر قانونی اور غیر آئینی طور پر بابری مسجد منہدم کی جاتی رہی اور پارٹی کے مفاد کو اولیت دینے والے مسلم وزراء انتہائی خاموشی سے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ اب اگر مسلم وزراء کی موجودگی اور پارلیامنٹ میں مسلم اراکین کی چلت پھرت کے باوجود مسلمانوں کی مذہبی علامات محفوظ نہ رہ پائیں تو پھر ایسی مسلم نمائندگی کا حاصل ہی کیا۔ ان واقعات نے دراصل یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ مسلم نمائندگی در حقیقت اکثریتی فرقے کی نامزد کردہ نمائندگی ہے جس سے مسلمانوں سے کہیں زیادہ اکثریتی فرقے کے عزائم کی پاسداری مقصود ہے۔ حقیقی مسلم نمائندگی جداگانہ طریقہ انتخاب کے بغیر ممکن نہیں۔

جغرافیائی حقائق

تقریباً پچاسی فیصد ہندوستانی مسلمان جو ملک کے نو صوبوں میں آباد ہیں، وہ ہیں یوپی، مغربی

بنگال، بہار، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، کرناٹک، کیرالہ، آسام اور جموں و کشمیر۔ ان صوبوں میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کی آبادی کچھ اس طرح ہے۔

نام ریاست	ریاست میں مسلم آبادی کا تناسب	مسلمانوں کی مجموعی آبادی کا تناسب
اتر پردیش	15.92	22.2
مغربی بنگال	21.51	14.7
بہار	14.12	12.5
مہاراشٹر	9.24	7.3
کیرالہ	21.25	6.8
آندھرا پردیش	8.46	5.7
آسام	26.0	5.6
کرناٹک	11.05	5.1
جموں و کشمیر	64.19	4.8

گویا جغرافیائی طور پر منتشر ہونے کے باوجود ملک کی نو ریاستوں میں مسلم آبادی کا ارتکاز کچھ اس طرح ہے کہ نئے ہندوستان کے بین الملی ثقافتی وفاق میں واضح طور پر مختلف علاقوں میں مسلم ثقافتی وفاق کے لئے گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ رہی جداگانہ طریقہ انتخاب کو رائج کرنے کی بات، تو سیاسی انصاف کے اس پہلے مرحلے میں بھی ان نو ریاستوں میں حقیقی مسلم نمائندوں کا عمل دخل بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی محرومی کے ازالے کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ محض سیاسی ترتیب و تشکیل کا مسئلہ ہے ورنہ عددی قوت بذات خود کسی قوم کی سیاسی برتری کا فیصلہ نہیں کرتے۔ ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ کیرالہ اور مغربی بنگال میں مسلم آبادی کا تناسب تقریباً یکساں ہے لیکن کیرالہ میں جہاں مسلمان اپنی بنیادوں پر منظم ہونے کی وجہ سے ایک مؤثر سیاسی قوت ہونے کا احساس دلاتے ہیں وہیں مغربی بنگال میں سیاسی پارٹیوں کے حاشیہ نشیں بن جانے کی وجہ سے وہ صوبائی سیاست میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اب اگر اتنی

بڑی عددی قوت کے ساتھ دانش مندانہ سیاسی حکمت عملی بھی بروئے کار لائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک کے معاملات میں مسلمانوں کو فیصلہ کن سیاسی اہمیت حاصل نہ ہوسکے۔ اس کے برعکس اگر موجودہ سیاسی نظام کے اندر ہی مراعات تلاش کرنے کی روایت برقرار رکھی گئی تو آنے والے دنوں میں سیاسی ناانصافی کی اذیتوں سے پریشان ہوکر اس ملک کے مقہور و مجبور عوام ان راستوں کی طرف جانکلیں گے جس میں باشندگان ملک کی بھی تباہی ہے اور خود اس ملک کی بھی۔

مذکورہ اعداد و شمار اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ موجودہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کے لئے منصفانہ سیاسی عمل دخل کا راستہ مسدود ہے۔ صورت حال اتنی سنگین ہے کہ ہندوؤں کے ذریعہ نامزد کردہ کامیاب مسلم امیدواروں کی تعداد بھی مسلسل کم ہورہی ہے جب کہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ حلقہ انتخاب کے غیر منصفانہ تعین کے باوجود آج بھی تقریباً ۸۲ لوک سبھا حلقوں میں مسلمان ایک فیصلہ کن تعداد میں آباد ہیں۔ خود سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک کے اندر کم از کم ستر اضلاع ایسے موجود ہیں جن میں مسلمانوں کی آبادی تین لاکھ سے زائد ہے۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ مسلم آبادی کو ذات پات کی بنیادوں پر تقسیم کرنے کے باوجود آج بھی مسلم آبادی کے حلقوں میں مسلم ووٹوں کا واضح ارتکاز موجود ہے۔ اب اگر مسلم آبادی کے ارتکاز کے پیش نظر پہلے مرحلے میں ان نو صوبوں سے جداگانہ انتخاب کا آغاز کیا جائے تو لوک سبھا کی سو سے زائد نشستیں مسلم نمائندگی کے حصے میں آئیں گی جو خود اتنی بڑی تعداد ہے جو اکثریت اور اقلیت کے سارے تصورات کو تہ و بالا کرنے کے لئے کافی ہے۔

انتخابات کا موجودہ منظر نامہ

موجودہ سیاسی نظام میں واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے کوئی متبادل نہیں ہے۔ ان نو ریاستوں میں جہاں مسلمانوں کی پچاسی فیصد آبادی رہتی ہے درج ذیل سیاسی پارٹیوں کو اثر اصل ہے۔

جنتادل، بی جے پی، شیوسینا، کانگریس آئی، سی پی آئی ایم (لیفٹ فرنٹ)، سماج وادی پارٹی، سماج وادی جنتا پارٹی، جنتا پارٹی، سی پی آئی، انڈین یونین مسلم لیگ، تلگو دیشم، مجلس اتحاد المسلمین، آسام گن پریشد۔

سردست مرکز میں حکمرانی کے لئے تین پارٹیاں اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔

کانگریس آئی، بی جے پی اور قومی مورچہ بائیں مورچہ کا مجوزہ محاذ۔ مسلم لیگ جو کیرالہ کی سطح تک موثر قوت سمجھی جاتی تھی اب انتشار کا شکار ہے اور کچھ اسی عمل سے مجلس اتحاد المسلمین بھی دوچار ہے۔ قومی سطح کی پارٹیوں میں مسلمانوں کو گویا ان تین سیاسی محاذ کے درمیان ہی کسی ایک کو معتبر ٹھہرانا ہے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ان تینوں سیاسی محاذ کو اپنا دشمن تصور کرتے ہیں۔ کانگریس کو بابری مسجد کے انہدام اور مسلمانوں کی موجودہ پستی کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے تو بی جے پی واضح طور پر مسلم دشمن رویے کے ساتھ میدان میں آئی ہے۔ جنتادل، سماج وادی جنتا پارٹی اور بائیں بازو کی قوتیں بھی اپنے دور اقتدار میں مسلمانوں کو صرف وعدوں کا سبز باغ دکھاتی آئی ہیں جب کہ متعلقہ ریاستوں میں ان کی حکومتیں مسلم ووٹوں کی بنیاد پر ہی وجود میں آئی تھیں۔ ان تین منافقوں میں کسی ایک کا انتخاب مسلمانوں کی سیاسی مجبوری تو کہا جاسکتا ہے لیکن اسے ان کا پسندیدہ سیاسی فیصلہ باور نہیں کرایا جاسکتا۔ مسلمانوں میں گزشتہ چند برسوں میں یہ احساس بھی عام ہوا ہے کہ سبھی سیاسی پارٹیاں اپنے اپنے انداز سے مسلمانوں کا سیاسی استحصال کرنا چاہتی ہیں اور اس نکتے پر تو سبھی متفق ہیں کہ اس ملک میں کسی مسلم سیاسی قوت کے احیاء کا راستہ روکے رکھا جائے۔ رہے خوش کن بیانات اور سبز باغ دکھانے کا سلسلہ، تو اس کا انتظام تقریباً سبھی بڑی پارٹیوں نے کم و بیش کر رکھا ہے۔ کانگریس آئی اگر پانچ سو کروڑ روپیوں کی تھیلی دکھاتی ہے تو بی جے پی نے بھی اماموں کی تنخواہوں میں اضافے اور شیروانیوں کی تیاری کا کام شروع کردیا ہے۔ رہی جنتادل یا بائیں بازو کی قوتیں تو مسلمانوں کو مسحور کردینے والی گرما گرم تقریروں کا یہاں بھی وافر انتظام ہے۔ البتہ اگر مسلمانوں کے تئیں ان تمام پارٹیوں کے عملی رویے کا جائزہ لیا جائے تو سخت مایوسی ہوتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کو مختلف قصائیوں میں سے ایک قصائی کا انتخاب کرنا ہے۔ اب ایک ایسی صورت حال میں یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ جب ووٹ دینے سے سیاسی غلامی کے سائے مزید گہرے ہوتے جاتے ہیں اور جب کسی پارٹی کو ووٹ دینے سے مسلمانوں کا کچھ بھی بھلا نہیں ہوتا تو آخر ووٹ دیا ہی کیوں جائے؟ اگر مسلمانوں کے پارلیامنٹ میں موجود ہونے یا وزارت کی کرسیوں پر براجمان رہنے سے امت مسلمہ کو ذرہ برابر بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تو ان نمائندوں کو پارلیامنٹ میں رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

بعض لوگ اس احساس فکر کو ہو سکتا ہے ایک منفی رویے کا نام دیں اور بعض لوگ شاید یہ بھی کہیں کہ اس طرح مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی صفر ہو جائے گی۔ لیکن جو لوگ اس اندیشے کا اظہار کرتے

ہیں ان کی آنکھیں ان حقائق کو کیوں نہیں دیکھ پاتیں کہ فی الواقعہ آج بھی پارلیامنٹ میں امت مسلمہ کی کوئی نمائندگی نہیں ہے۔ مسلمانوں کے سے نام رکھنے والے اراکین پارلیامنٹ مسلمانوں کی نہیں بلکہ ان مشرک آقاؤں کی نمائندگی کرتے ہیں جن کے قلم کی نامزدگی سے ان بے چاروں پر پارلیامنٹ کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس لئے یہ مفروضہ ہی باطل ہے کہ فی زمانہ ہندوستانی پارلیامنٹ میں مسلمانوں کی کوئی نمائندگی موجود ہے۔ سوائے اس استثنیٰ کے جو مسلم لیگ یا اتحاد المسلمین یا کسی آزاد رکن کی شکل میں دو تین آوازیں کبھی کبھی اس پارلیامنٹ میں اٹھتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن موجودہ سیاسی نظام کے تحت یہ آوازیں اتنی کمزور ہیں کہ انہیں بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ہندوستانی سیاست کی اس اندھی گلی میں جہاں امت مسلمہ پر سارے دروازے بند کردئے گئے ہیں، جہاں امت کے حقیقی نمائندوں کا پارلیامنٹ میں داخلہ ناممکن ہے، جہاں ملکی معاملات اور پالیسی امور میں امت مسلمہ کا عمل دخل عملی طور پر ختم کردیا گیا ہے، جہاں سیاست کے نئے میزانیے میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے تسلط کے بعد اب نچی ذات کے ہندو اسے اپنا دست نگر بنانے کی تیاروں میں مصروف ہیں اور جہاں مسلم قائدین کے نزدیک امت مسلمہ کو ایک مشرک سیاسی قیادت کی تابعداری سے نکال کر دوسری مشرک سیاسی قیادت کی اتباع میں ڈال دینا سیاسی حکمت عملی قرار پایا ہے اور جہاں پوری امت یہ بھول چکی ہے کہ اس کا کام اس ملک کی سیادت کا فریضہ انجام دینا ہے اور یہ کہ مشرکین کا دست نگر بن کر رہنا خدا کے آخری رسولؐ کی امت کے لئے باعث شرم ہے۔ ایک ایسے اجنبی ماحول میں ایک نئے سیاسی رویے کی تشکیل کا کام انتہائی ضروری ہوگیا ہے۔

مسودہ

مسلم سیاسی بل

تمہید

ملک ٹوٹ پھوٹ کے دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ آج ہم میں سے بہتوں پر یہ بات منکشف ہو چکی ہے کہ ہم بہت تیزی کے ساتھ انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کی طرف گامزن ہیں۔ مابعد انہدام ہندوستان میں سیکولر جمہوری اقدار کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے۔ اب اس ملک کے پاس کوئی ایسی نظریاتی اساس نہیں جو اس کی جغرافیائی سلامتی کی ضمانت دے سکے۔ رہے سیاسی قائدین تو یہ اتنے بدعنوان، خود پرست اور اقتدار کے بھوکے ہیں کہ انہیں وطن عزیز کے مستقبل کی ذرہ برابر پروا نہیں۔ یہ محض اپنی غرض کے بندے ہیں جن کا کام صرف اپنی سیاسی انا کی تسکین اور ہوا و ہوس کی تابعداری ہے۔ ایک ایسی سنگین صورت حال میں کوئی ملک خواہ اس کی کتنی ہی عظیم تاریخ کیوں نہ رہی ہو، اس کا شکست و ریخت کے عمل میں مبتلا ہو جانا فطری ہے۔ نہ صرف کشمیر، آسام، پنجاب اور ناگالینڈ بلکہ ہر چہار طرف سے احتجاج اور بغاوت کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ بعض علاقوں میں تو ان احتجاجات نے سنگین صورت حال اختیار کر لی ہے۔

اس ملک کے مجبور و مقہور باسیوں کے اندر یہ احساس عام ہے کہ ملک کا سیاسی نظام کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ایک مختصر سی برہمن اقلیت کو ہر طرح برتری حاصل ہو جائے۔ اس برہمن اقلیت نے گذشتہ پچاس سالوں سے وسائل سے مالا مال اس ملک کو لوٹ کھسوٹ کی آماجگاہ بنا رکھا ہے۔ لفظ ہندو کی من مانی دستوری تعریف نے برہمنوں کو اس بات کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک کثیر لیکن مختلف الخیال قوموں کے نمائندہ اور رہنما کی حیثیت سے پیش کریں حالانکہ جن مختلف الخیال لوگوں کو ہندو بتایا گیا ہے نہ تو ان کے نظریات مشترک ہیں نہ ثقافت نہ رنگ و نسل اور نہ ہی بنیادی عقائد۔

البتہ گذشتہ چند برسوں میں ان قوموں نے بھی جمے جمائے سیاسی ضابطوں اور کھیل کے تسلیم شدہ اصولوں پر تنقید شروع کردی ہے۔ ان علاقوں میں جہاں ایک مختصر سی مدت کے لئے بھی کوئی غیر برہمنی حکومت قائم ہوئی وہاں سیاسی اور سماجی نظام کی ناہمواریاں کھل کر سامنے آئی ہیں جنہیں اگر بروقت سنجیدگی سے نہ لیا گیا تو یہ سب ایک ہمہ گیر اور مستقل نوعیت کی خانہ جنگی میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ انتشار کی مختلف آوازوں اور فاشزم کے مسلسل اٹھتے ہوئے طوفان میں آخر اس ملک کو کون سی قوت یکجا رکھ سکتی ہے؟ یقیناً نہ تو کسی جابرانہ ریاستی اقتدار کے لئے ایسا ممکن ہے اور نہ ہی جھوٹے وعدوں اور کھوکھلے نعروں کے ذریعہ یہ مہم سر کی جاسکتی ہے۔ اگر ہم سوویت یونین کے تجربے سے سبق حاصل کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو ہمیں حقائق کا کھلی آنکھوں سے سامنا کرنا ہوگا۔ ہمیں صورت حال کی فوری درستگی کی طرف توجہ دینی ہوگی اور پیش آمدہ تباہ ناکیوں سے بچنے کے لئے سخت جدوجہد کرنی ہوگی۔ اس سرزمین کے ایک باشندے کی حیثیت سے ہمیں اب چوکنا ہوجانے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ یہ جان لینے کے بعد کہ یہ ملک تیزی سے ایک خون آشام طوفان اور ہمہ گیر انارکی کی طرف بڑھ رہا ہے جس میں لاکھوں زندگیاں تلف ہوجائیں گی۔ ضرورت ہے کہ اس ملک کے قافلے کا رخ فوری طور پر تبدیل کردینے کے لئے ہمارے ہاتھ حرکت میں آجائیں۔

ہم مسلمان اس ملک کے محض شہری ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہیں۔ خدا کے آخری رسولؐ کی امت کی حیثیت سے اور آخری الٰہی پیغام کے حامل ہونے کے ناطے یہ ہماری بنیادی ذمہ داری ہے کہ ہم ہر قسم کے ظلم و جبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں خواہ یہ ظلم کسی کی طرف سے بھی ہو اور کسی کے خلاف بھی روا رکھا گیا ہو۔ یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ ہم صورت حال کی اصلاح کے لئے آگے آئیں، نظام کفر کے چیلنج کو قبول کریں اور اس وطن عزیز کو جو انتظامی بدعنوانی اور غاصب حکمرانوں کی شیطانی آرزوؤں کے عذاب میں مبتلا ہے اسے ایک منصفانہ اور عادلانہ قیادت فراہم کریں۔

اسلام مسلمانوں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ عملی دنیا میں کنارہ کشی کے رویے پر گامزن رہیں یا کسی غیر اسلامی سیاسی نظریے یا گروہ کی اتباع قبول کرلیں۔ یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ آخری رسول کی امت کو اس ملک میں یہ باور کرایا جاتا رہا ہے کہ ہندوستان میں وہ محض ایک اقلیت ہیں اور اس لئے ملکی معاملات میں کوئی بنیادی رول ادا نہیں کرسکتے۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ بات

انہیں مسلسل دوسروں نے نہیں بلکہ ان کے اپنے علماء و دانشوروں نے باور کرائی ہے۔ ہمارے علماء ہمیں یہ بھی بتاتے رہے ہیں کہ اس ملک میں نظام حکومت کے لئے سیکولر ڈیموکریسی سے بہتر کوئی نظام نہیں ہوسکتا اور یہ کہ ہمیں حالات کے تقاضے کے پیش نظر ایک الٰہی نظام کے تحت زندگی جینے کی تمنا اور اس سرزمین پر نظام عدل کے قیام کا خواب ترک کردینا چاہئے۔ البتہ یہ کہتے وقت شاید وہ مسلم قائدین اس بات کو فراموش کرگئے کہ اسلامی نقطہ نظر سے انسان کے بنائے ہوئے کسی نظام حیات سے بیعت کرنا یا اس کی اتباع میں اپنے آپ کو دے دینا دراصل کھلا شرک ہے اور یہ کہ جو لوگ اسلام کو اس ملک کے بین الملی معاشرے کے پیش نظر ایک ناقابل عمل نظریہ تصور کرتے ہیں وہ دراصل اپنے ایمان سے ہاتھ دھو لیتے ہیں اور اس طرح گویا کھلے ارتداد کا ارتکاب کرتے ہیں۔

البتہ دسمبر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کے انہدام نے امت مسلمہ پر بہت سے نئے حقائق منکشف کردئے۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ گذشتہ پچاس سالہ مسلم سیاسی تاریخ دراصل تاریک ایام تھے اور یہ کہ سیکولر جمہوری اقدار میں یہ کس بل نہیں کہ وہ اسلامی علامتوں کے تحفظ کی ضمانت دے سکیں۔ مابعد انہدام ہندوستان میں مسلم کش فسادات کے نازک ایام میں مسلم قیادت کی نئی نسل نے جو ملی پارلیامنٹ کے قیام کے لئے جمع ہوئی تھی اس احساس کا شدت سے اظہار کیا کہ عملی طور پر سیکولر جمہوریت ایک دستوری فراڈ سے زیادہ کچھ نہیں، جس کا واحد مقصد بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو سیاسی غلام بنائے رکھنا ہے۔

ملی پارلیامنٹ کی کمیٹی برائے سیاسی امور جو بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک منصفانہ سیاسی متبادل کی تلاش کے لئے قائم کی گئی تھی، طویل غور و فکر، صلاح و مشورے اور قانونی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ موجودہ الیکشنی نظام میں مسلمانوں کا سرے سے کوئی سیاسی مستقبل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ بعض بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں کے لئے راستہ ہموار کیا جائے۔ اگر کھیل کے غیر منصفانہ اصول نے ہمارے لئے فتح کے سارے دروازے بند کر رکھے ہیں تو نئے سرے سے اصول ترتیب دئے جائیں اور اگر کوئی مخصوص سیاسی نظام سیاسی انصاف کی ضمانت دینے میں بری طرح ناکام رہا ہے تو ایک نئے سیاسی نظام کی ترتیب و تشکیل کے لئے منصوبے بنائے جائیں۔

بہت کچھ غور و فکر کے بعد آج ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس ملک میں سیاسی انصاف کے قیام

کے لئے جلد از جلد سیاسی نظام کو بدل ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اب اس ملک میں بیس کروڑ کی عظیم عددی قوت کو اقلیت باور کرایا جانا مزید ممکن نہیں۔ دنیا کی تاریخ میں شاید کوئی دوسری مثال نہ مل سکے۔ جب اتنی بڑی عددی قوت کو نصف صدی تک مسلسل اقلیت باور کرایا جاتا رہا ہو اور ایک ایسا سیاسی نظام تشکیل دیا گیا ہو جس میں سماجی انصاف، سیاسی آزادی، انسانی حقوق اور جمہوری اقدار کے خوشنما نعروں کے جلو میں دراصل اکثریت کا قاہرانہ تسلط قائم کر دیا گیا ہو۔ ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل آج اس مروجہ سیاسی نظام کو یکسر کالعدم قرار دیتی ہے اور سیاسی انصاف کے رہنما اصولوں کی روشنی میں اس ملک کے باسیوں کو دعوت عام دیتی ہے کہ وہ مستقبل کے ہندوستان کا ایک خاکہ تیار کریں۔ ایک ایسے نظام کی تشکیل کی کوشش کریں جس میں ہر شخص، عقیدے، مذہبی گروہ اور نظریاتی جماعتوں کو زندگی جینے کے یکساں مواقع حاصل ہوں اور اس راہ میں پہلے مرحلے کے طور پر متناسب نمائندگی کی بنیاد پر جداگانہ طریقہ انتخاب کو عمل میں لاتے ہوئے ایک منصفانہ سیاسی نظام کے قیام کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ جداگانہ انتخاب کوئی ایسی خطرناک اصطلاح نہیں ہے جس سے ہم خوف کھائیں، یہ کوئی نئی سیاسی بدعت نہیں ہے۔ ماضی میں بھی اس طریقہ انتخاب کا استعمال مختلف معاشروں میں عام رہا ہے۔ قبرص، بوہیمیا اور ماقبل تقسیم ہندوستان اس قبیل کی بہترین مثالیں ہیں۔ جہاں مذہبی یا نسلی گروہ اپنے اپنے نمائندوں کا انتخاب کرنے کا حق رکھتے تھے۔ یہ خوف بھی بے جا ہے کہ جداگانہ طریقہ انتخاب کو عمل میں لانے سے نئے پاکستان بننے کے راستے کھلیں گے۔ پاکستان کا بننا جداگانہ طریقہ انتخاب کو تسلیم کئے جانے کی وجہ سے ممکن نہیں ہوا بلکہ اس طریقہ انتخاب کی مخالفت کرنے والی قوتوں نے دراصل قیام پاکستان کے لئے جواز فراہم کیا۔ آج بھی ملک کو یکجا کرنے کے لئے سیاسی انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا لازم ہوگا۔ لہٰذا اس ملک کو ایک پرامن معاشرے میں تبدیل کرنے اور علیٰحدگی پسندوں کے غبارے سے ہوا نکالنے کے لئے لازم ہوگا کہ متناسب نمائندگی کے فارمولے کو فوری طور پر تسلیم کرلیا جائے۔ سماجی انصاف کے دوسرے مرحلے میں عظیم ہندوستان کو مختلف ثقافتی گہوارے کے وفاق میں تبدیل کئے جانے کا منصوبہ ہے۔

ملک کی موجودہ سنگین صورت حال، سیاسی عدم توازن، سماجی انتشار اور اس کے ٹوٹ جانے کے شدید خطرات کے پیش نظر تاریخ کی قوت آج ہمیں اس بات پر مجبور کر رہی ہے کہ اس ملک کو شکست و

ریخت کے عمل سے بچانے کے لئے منصفانہ سیاسی فارمولوں کی وکالت کریں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لئے بعض بنیادی نوعیت کے سیاسی فیصلے لینے کا وقت آگیا ہے۔ یہ سیاسی بل دراصل اسی سمت ایک قدم ہے۔

اول: دستوری ترامیم

(۱) اسلام کی رو سے مومن کی پوری زندگی خواہ وہ نجی ہو یا سماجی، قرآن کے تابع ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کے علاوہ کسی اور نظام کا اتباع مومن کے لئے کفر کے مترادف ہے، اس لئے لازم ہے کہ بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو اس ملک کا نظریاتی شہری بنانے کے لئے دستور میں ان ضروری شقوں کا اضافہ کیا جائے جو مسلمانوں کے لئے مکمل اسلامی زندگی کی ضمانت دے سکیں۔

(۲) مسلمان کے لئے اسلام محض ایک نجی معاملہ نہیں ہے اس لئے مومن پر لازم ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی پر اسلامی نظام کی علمداری قائم کرے۔ موجودہ نظام حیات میں عملی طور پر ایسا مشکل ہوگیا ہے۔ دستور اس ملک کے کارواں کو یونیفارم سول کوڈ کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو قرآن کا مطالبہ ہے کہ مسلمان قرآنی سول کوڈ کی طرف معاشرے کے کارواں کو گامزن کردیں۔ ہندوستانی دستور اور الٰہی احکامات میں اس واضح ٹکراؤ کو دور کیا جائے تاکہ مسلمانوں میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کے وسیع مفہوم کا احساس پیدا ہو اور دستور ہند کے اسلامی احکامات سے متصادم ہونے کا خیال ختم ہو۔

(۳) خدا کی نازل کردہ شریعت صرف مسلمانوں کی میراث نہیں ہے بلکہ وسیع انسانی سماج کو چلانے کے لئے بہترین ہدایت ہے۔ اس لئے انسانی معاشرے کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے انسانوں کے خودساختہ قوانین، تعزیراتی حدود اور نیک و بد کے پیمانے کو حتمی قرار دینے کے بجائے الٰہی قوانین کو رہنما اصولوں کے طور پر تسلیم کرلیا جائے۔ ملک میں جاری سیاسی نظام کا یکسر خاتمہ کیا جائے اور اس کی جگہ سماجی انصاف کے لئے رہنما قرآنی اصولوں کی روشنی میں ایک نئے نظام حکومت کی داغ بیل ڈالی جائے۔

(۴) یہ بات تسلیم کی جائے کہ ہر انسان خواہ مرد ہو یا عورت، گورا ہو یا کالا، امیر ہو یا غریب، نیچ

ذات کا ہو یا اونچی ذات کا ہر کوئی اللہ کی مخلوق ہے۔ لہٰذا ایک ایسا سیاسی نظام وضع کیا جائے جس میں کسی کو کسی پر سبقت حاصل نہ ہو۔ سوائے اس کے جو لوگ اللہ سے نسبتاً زیادہ ڈرنے والے ہیں۔

دوم: سیاسی نظام کی اصلاح

(۱) گذشتہ پچاس سالہ سیاسی تجربے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ موجودہ سیاسی نظام کے اندر مسلمانوں کی سیاسی ترقی تو کجا خود ان کی سیاسی بقا کا سوال مشکل ہے۔ مروجہ انتخابی طریقہ کار نے اس ملک میں بعض ایسی اسمبلیوں کو جنم دیا ہے جن میں نام کو بھی کوئی مسلمان ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ الیکشن کے مروجہ طریقے کو یکسر تبدیل کردیا جائے۔

(۲) سماجی انصاف کے قیام کے لئے متناسب نمائندگی کی بنیاد پر جداگانہ طریقہ انتخاب کو عمل میں لایا جائے تاکہ اس ملک میں بسنے والی ہر لسانی مذہبی اور نظریاتی اکائی ملک کی ترقی کے منصوبوں میں یکساں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لے سکے۔

(۳) گذشتہ چند برسوں میں بعض مذہبی اکائیوں میں یہ احساس بڑی شدت اختیار کرتا گیا ہے کہ ملک کے موجودہ سیاسی نظام میں ان کی فلاح و بہبود کا امکان معدوم ہے اور یہ کہ اقلیتیں اس جمہوری نظام میں اکثریت کے قہر کے نیچے پس کر رہ گئی ہیں۔ اس احساس نے ملک کے مختلف حصوں میں علیحدگی پسندی کی تحریکوں کو جنم دیا ہے۔ جداگانہ طریقہ انتخاب علیحدگی پسندی کی تحریکوں کے غبارے سے ہوا نکالنے کے لئے مؤثر نسخہ ثابت ہوگا۔

(۴) مختلف نظریاتی، تہذیبی اور مذہبی قومیتوں کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنے کے لئے مرکزی سطح پر ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جس میں متعلقہ قومیتوں کے نمائندہ افراد کو شامل کیا جائے اور اس مقصد کے لئے ملک گیر سطح پر غیر جانبدارانہ مردم شماری کا ایک ایسا ہمہ گیر منصوبہ بنایا جائے جس کی توثیق ہندوستانی مسلمانوں کی ملی پارلیامنٹ نے کردی ہو۔

(۵) مردم شماری کے عمل میں مسلمانوں کا اعتماد بحال کرنے کے لئے مرکزی، صوبائی، ضلعی اور بلاک کی سطح تک ان خصوصی مسلم اہل کاروں کا تقرر کیا جائے جو امت کے نزدیک قابل

اعتبار ہوں۔

(۶) لوک سبھا میں متناسب نمائندگی کے فارمولے کو عمل میں لاتے ہوئے ۱۱۹ نشستوں پر ملک گیر سطح پر مسلم رائے شماری رائج کی جائے اور پھر زیادہ ووٹ پانے والے امیدواروں کو منتخب قرار دیا جائے

(۷) ہندوستان جیسے وسیع ملک کا سیاسی نظام چلانے کے لئے مناسب ہوگا کہ اسے چھوٹے چھوٹے وفاق میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح پورے ملک پر یوپی اور بہار کے سیاسی تسلط کا احساس بھی کم ہوگا اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے صوبے اپنی ترقی کی رفتار کو زیادہ منظم انداز سے جاری رکھ سکیں گے۔ یوروپ کے چھوٹے چھوٹے ممالک کی بے پناہ ترقی اور سوویت یونین جیسے وسیع و عریض خطے کے معاشی دیوالیہ پن سے سبق لیا جانا چاہیے۔

(۸) سیاسی، مذہبی، جغرافیائی، تہذیبی اور لسانی بنیادوں پر ہندوستان کو وفاقوں کے اجتماع میں بدلنے کے لئے ۱۲۲ چھوٹے چھوٹے خود مختار وفاق میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ سارے وفاق خود مختار ہوں البتہ ان کی خارجہ پالیسی اور دفاع کا کام مرکز کے زیر نگرانی ہو۔

(۹) ان مختلف وفاق کو تاریخی، تہذیبی اور مذہبی آبادی کے اجتماع کی بنیاد پر مخصوص تہذیبوں کا گہوارہ قرار دیا جائے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ہندوستان کی کوئی تہذیب ریاستی سرپرستی سے محروم نہ رہ گئی ہو۔

(۱۰) ان تمام تہذیبی وفاق کو کلی طور پر غیر عسکری زون قرار دیا جائے تاکہ عسکری سرگرمیوں کے لئے ان حکومتوں کو کوئی گنجائش حاصل نہ رہے اور وفاق کے باہمی نزاع میں قوت کے استعمال کا دور دور تک کوئی امکان نہ پایا جائے۔

(۱۱) ان وفاق میں پائی جانے والی اقلیتوں یا کسی خاص ریاست کی معاشی خوش حالی کے پیش نظر دوسری ریاستوں سے آکر آباد ہونے والی تہذیبی اقلیات کو پھلنے پھولنے کا یکساں موقع فراہم کیا جائے۔ البتہ وہ اگر اپنی تہذیبی ضرورتوں کے پیش نظر متعلقہ تہذیبی ریاست کی طرف دیکھتی ہوں تو اسے دستوری طور پر معتبر سمجھا جائے اور اس بارے میں ان کے اندر یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ کسی ایک مقامی ریاست کے شہری نہیں بلکہ وسیع تر ہندوستانی وفاق کے شہری ہیں۔

سوم: ثقافتی اصلاحات

(۱) اس حقیقت کے پیش نظر کہ ثقافتی اظہار کو تاریخ اور مذہب سے جدا نہیں کیا جاسکتا، یہ کہنا کہ کوئی معاشرہ اپنے ثقافتی اظہار میں خالصتاً سیکولر ہوسکتا ہے ایک لغو خیال ہے۔ گویا ہندوستانی سیکولرزم کو ایک نئی تعبیر کی ضرورت ہے اور اگر اس تعبیر کو Pluralism کے وسیع مفہوم میں لیا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گذشتہ پچاس سالوں میں سیکولرزم کے نام پر اکثریتی فرقہ کی ثقافت کو فروغ دیا جاتا رہا ہے۔ سرکاری تقریبات میں ہندوانہ رسم و رواج کی پاسداری نے مسلمانوں کے اندر ایک شدید احساس محرومی کو جنم دیا ہے جس کے ازالے کے لئے لازم ہے کہ مسلم ثقافتوں کے اظہار کے لئے مسلم اکثریت کے علاقوں میں سرکاری سطح پر اس کا نظم کیا جائے۔ گویا یہ مسلم تہذیبی وفاق سے وجود میں آنے سے قبل کی ایک عبوری شکل ہوگی۔

(۲) روزمرہ کی زندگی سے ہندو ثقافت کے اظہار کی موجودہ شکلوں کو ختم کرنا نہ تو عملاً ممکن ہے اور نہ ہی یہ مسئلے کا حل ہے۔ لہٰذا تہذیبی اظہار کے طریقے کی اصلاح کے بجائے اس بات پر زور دیا جائے کہ مسلم ثقافتی اظہار کے لئے بھی یکساں اور مؤثر مواقع فراہم ہوسکیں۔

(۳) ہندوستانی وفاق کو ایک لسانی رابطے میں مربوط رکھنے کے لئے ہندی اور اردو کے جھگڑوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ایک ایسی زبان تشکیل دی جائے جو ہندی اور اردو کے ذخیرہ الفاظ کی بنیاد پر رومن رسم الخط میں لکھی جائے تاکہ کسی ایک مذہبی اکائی کو کسی دوسری پر سبقت پانے کا احساس نہ ہو۔ البتہ متعلقہ تہذیبی ریاستوں میں اپنی پسند کے رسم الخط یا اپنی پسند کی زبان کو سرکاری سرپرستی عطا کرنے کا پورا موقع رہے۔

(۴) وفاقی حکومت مختلف ریاستوں کے یا ان ریاستوں میں پائی جانے والی یا اپنی مرضی سے آکر آباد ہونے والی اقلیات کی ثقافتی ضروریات کے لئے خصوصی طور پر مرکز میں ادارے قائم کرے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ وفاقی فنڈ سے کسی مخصوص ثقافت یا تہذیب کی سرپرستی کا کام انجام نہ پائے۔

چہارم: احساس تحفظ کے لئے ضروری اقدامات

(۱) مجوزہ وفاق میں حکومتیں اس بات کو یقینی بنائیں کہ انسانی جان کی حفاظت ان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ کسی بے گناہ کا خون بہنے سے روکا جائے۔ وفاقی حکومت کو یہ حق حاصل ہو کہ کسی شہری کے ناحق خون پر وفاق کا ہنگامی اجلاس طلب کر سکے۔ ریاستوں کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنی حدود میں ناحق مرنے والوں کے جرم کی تلافی کے لئے تین دن کے لئے اندر ورثاء کو ایک خطیر رقم عطا کریں۔ تاخیر کی صورت میں مجوزہ رقم سے کئی گنا زیادہ ادا کرنے کو یقینی بنایا جائے۔

(۲) افراد ہی نہیں بلکہ ریاستوں سے بھی ہتھیاروں کے استعمال کی اجازت سلب کر لی جائے۔ دہشت گردی خواہ ریاستی ہو یا فرد واحد کی طرف سے، اسے یکساں قابل مذمت سمجھا جائے اور ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جہاں دور دور تک ہتھیار دکھائی نہ دیں۔

(۳) انسانی آزادی کے تحفظ کے لئے ہر ممکن پروگرام ضرور وضع کیا جائے البتہ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ریاستیں اس کا بہانہ بنا کر اظہار خیال کی آزادی اور نظریے کی تبلیغ پر کوئی پابندی عائد نہ کر سکیں۔

پنجم: مذہبی آزادی کا مسئلہ

(۱) اس حقیقت کے پیش نظر کہ اسلام کا تصور دین دوسرے ادیان کے تصور مذہب سے قطعاً مختلف ہے اور یہ کہ اسلام زندگی کے ہر گوشے میں اپنے ماننے والوں سے واضح مطالبات رکھتا ہے۔ دستور میں دی گئی مذہبی آزادی امت مسلمہ کے لئے ہمیشہ ناکافی محسوس ہوئی ہے اور وقتاً فوقتاً اس ملک میں مسلمان شریعت کے تحفظ کی مہم چلاتے رہے ہیں۔ لازم ہے کہ مذہبی آزادی کے واضح اسلامی تصور کو دستور سے ہم آہنگ کیا جائے۔

(۲) گذشتہ پچاس سالوں کے دوران امت مسلمہ کو شدت سے اس بات کا احساس رہا ہے کہ مذہبی آزادی کے وعدے ان کے مذہبی عزائم کا ساتھ نہیں دیتے اور اس بارے میں دستور کی دفعہ ۴۴ کو بھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سمت دستور کی ان تمام شقوں میں تبدیلیاں لائی جائیں جو کسی بھی درجے میں امت مسلمہ کی مذہبی آزادی پر روک لگاتی ہوں۔

(۳) اس حقیقت کے پیش نظر کہ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی مکاتب اور مدارس میں تعلیم پاتی ہے اور یہ کہ اسلامی علوم کا حصول مسلمانوں پر عائد کردہ ایک مذہبی ذمہ داری ہے۔ وفاقی حکومت کو چاہئے کہ وہ مسلمانوں کو اس مذہبی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرے اور آبادی کے تناسب کے اعتبار سے مسلم تعلیمی اداروں کے لئے تعلیم کے مرکزی بجٹ سے حصہ مختص کرے اور اس کے نفاذ کا کام فی الحال مسلم انجمنوں اور مستقبل میں نئے ہندوستان کی مسلم ریاستوں کو سونپ دیا جائے۔

(۴) پچاس سالہ سیکولر تجربے کی روشنی میں اب اس بات کے واضح ہونے پر کہ ثقافتی طریقہ اظہار کو مذہب سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ ہر مذہبی گروہ کو اس ملک میں اپنے اپنے انداز سے زندگی جینے کی مکمل ضمانت دینے کے لئے ضروری ہے کہ مرکز میں مختلف مذاہب، نظریاتی گروہ کے لئے الگ الگ سیل قائم کئے جائیں جو وزارت مذہبی امور کے تحت اپنے فرائض انجام دیں۔ البتہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ہر مذہبی گروہ اپنی علیٰحدہ شناخت کے قیام کے لئے کوئی متفقہ تحریری منشور ضرور پیش کرے۔ خواہ یہ مذہبی کتابوں کی شکل میں ہوں یا انجمنوں، اداروں اور نظریات کی بنیاد پر وجود میں آنے والے مذہبی گروہ کی شکل میں۔ نیز اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ کسی مذہبی گروہ پر اس کی مرضی کے بغیر کوئی لیبل نہ تھوپا جاسکے۔

(۵) شرعی عدالتوں کے تصور کو مذہبی آزادی کا ایک حصہ قرار دیا جائے اور اس سلسلے میں ان کی ترتیب و تشکیل کے مسئلے کو کلی طور پر مستقبل کی مسلم ریاستوں پر چھوڑ دیا جائے تاکہ ہر مسلم ریاست اپنی ضرورت کے مطابق اسے مختلف شکل دے سکے۔

ششم: تعلیمی نظام کی اصلاح

(۱) اس حقیقت کے تسلیم کئے جانے کے بعد کہ خالصتاً سیکولر نظام تعلیم کا تصور عملی طور پر ممکن نہیں اور یہ کہ گذشتہ پچاس سالوں سے سرکاری سرپرستی میں چلنے والے اسکولوں اور کالجوں میں سیکولرزم کے نام پر اکثریتی فرقے کے مذہبی عقائد، قصہ کہانیاں اور اوہام کی ترویج و اشاعت ہوتی رہی ہے۔ ایک ایسا نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت ہے جو ہندوستان میں پائے جانے

والے ہر مذہبی فرقے اور نظریاتی گروہ کے بنیادی عقائد اور تصورات سے طلباء کو واقف کراتا ہو۔ ملک میں پائی جانے والی باہمی نفرت کے رجحان کو ختم کرنے کے لئے لازم ہوگا کہ ہماری درسی کتابیں سبھی مذاہب کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرتی ہوں۔

(۲) اس امر کے پیش نظر کہ مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات دوسری مذہبی اکائیوں سے مختلف ہیں اور یہ کہ علوم اسلامی کے ادارے اور عربی مدارس کے موجودہ نظام مسلم تعلیمی نظام سے علیحدہ نہیں کئے جاسکتے۔ مرکز اس بات کو یقینی بنائے کہ جب تک مستقبل کی مسلم ریاستیں وجود میں نہیں آتیں تب تک عارضی طور پر مسلم نظام تعلیم کے ارتقاء کو یقینی بنایا جائے۔

(۳) وفاق کے وجود میں آنے سے پہلے اور بعد میں تاریخی اعتبار سے معروف مسلم تعلیمی اداروں اور دانش گاہوں کو مسلم تعلیمی ورثہ کے طور پر تسلیم کیا جائے اور ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری وفاقی حکومت پر ہو۔

(۴) گو کہ ہر ریاست کو اس بات کی قطعی آزادی ہو کہ وہ اپنی پسند کا تعلیمی نظام ترتیب دے۔ البتہ اسے کسی مذہب یا نظریاتی گروہ کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈوں سے اپنی درسی کتابیں بھرنے کا حق حاصل نہ ہو۔ مرکزی حکومت وفاق کے تعاون سے اس امر کو یقینی بنائے۔

ہفتم: لسانی مسئلہ

(۱) ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک ملک کی ساری زبانیں یکساں معتبر ہیں اور عقیدے کی رو سے کسی بھی زبان میں اظہار خیال سے انہیں کوئی الجھن نہیں۔ البتہ وہ کسی بھی زبان کے جابرانہ تسلط کے خلاف ہیں۔ مستقبل کے ہندوستان میں جہاں ریاستوں کو یہ آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اپنے اپنے ریاستی حدود میں کسی خاص زبان یا رسم الخط کو اختیار کر سکیں وہیں مرکز پر یہ لازم ہوگا کہ وہ بین الوفاقی ٹیلی ویژن نیٹ ورک پر مختلف زبانوں کو متناسب نمائندگی دینے کی پالیسی پر پابندی سے عمل پیرا رہے۔

(۲) مستقبل کے ہندوستان میں ہر شخص کو اس بات کی ضمانت حاصل ہوگی کہ وہ اپنی مادری زبان میں ابتدائی مراحل کی تعلیم حاصل کر سکے۔ اگر کسی وجہ سے وفاقی ریاستیں اپنی حدود میں مذکورہ

زبان میں تعلیم کا نظم نہ کر سکیں تو ان پر لازم ہوگا کہ ان طلباء کو ریاستی وظائف پر متعلقہ زبانوں والی ریاستوں میں تعلیم کے لئے بھیجیں۔

(۳) گو کہ وفاق کی سرکاری زبان رومن رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندوستانی ہوگی البتہ ریاستوں کی سرکاری زبان بھی مرکز کے نزدیک تسلیم شدہ ہوگی اور ان زبانوں کے لئے وفاقی حکومت کے زیر تحت ایک بورڈ قائم ہوگا۔

ہشتم: معاشی مسئلہ

(۱) اس امر کے پیش نظر کہ ملک کے موجودہ معاشی نظام میں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر حصہ نہیں ہے اور ملک کی بڑی صنعتوں پر مخصوص خاندانوں کی اجارہ داری ہے۔ مستقبل کے ہندوستان میں نوزائیدہ ریاستوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ وہ معاشی انصاف کے قیام کے لئے مؤثر اصول وضع کریں اور سماجی انصاف کے ضابطوں کے تحت مرکز بھی ان بنیادی اصولوں کی پاسداری کو یقینی بنائے۔

(۲) مسلمانوں کی بیشتر صنعتیں موجودہ جابرانہ معاشی نظام میں یرغمال بنالی گئی ہیں جن سے اصل فائدہ سیاسی اقتدار میں شرکت دار غیر مسلم قومیں اٹھارہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ روایتی مسلم صنعت و حرفت میں بھی مسلمان محض کاریگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ نئے ہندوستان میں وفاق کی ریاستیں اپنے اپنے علاقوں میں اس معاشی استحصال پر روک لگائیں۔ ملک کے وسائل کا چند ہاتھوں میں اجتماع ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور ہر شخص کو اس کی محنت کا معاوضہ اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے یقینی بنایا جائے۔

(۳) ملک کے موجودہ معاشی نظام میں مسلمانوں کی انتہائی قلیل شرکت کی اہم وجوہات میں سے ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ پورا معاشی نظام، کاروباری ترقی کے مواقع، لین دین کا معاملہ، قرضوں کے حصول اور واپسی کا طریقہ، ریاستی سرپرستی یا سہولتوں کی اسکیم یہ سب کچھ سودی نظام پر قائم ہے۔ جس میں شرکت کے لئے مسلمان نظریاتی طور پر خود کو فٹ نہیں محسوس کرتا۔ اس لئے مسلمانوں کے مذہبی احساسات کا خیال رکھتے ہوئے ایک نئے عادلانہ غیر سودی نظام کی تشکیل

ضروری ہے، اس کے بغیر یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کو بھی اس ملک میں یکساں ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔

(۴) نئے ہندوستان میں وفاق کی مسلم ریاستیں غیر سودی عادلانہ معاشی نظام کی ترتیب و تشکیل میں اہم کردار ادا کریں گی۔ البتہ مرکز پر بھی یہ لازم ہوگا کہ وہ ایک متبادل غیر سودی معاشی نظام کی تشکیل کے عمل میں اپنے شہریوں کی نظریاتی ضرورت کے تحت ایک مؤثر اور فعال کردار ادا کرے۔

(۵) البتہ وفاق کے وجود میں آنے سے قبل کے عبوری مرحلے میں ملک بھر میں ایک متبادل غیر سودی بینکنگ کے نظام کے قیام کے لئے ریزرو بینک آف انڈیا وہ تمام سہولتیں فراہم کرے جو کسی عام بنکاری کے ادارے کے قیام کے لئے حاصل ہیں۔ بالفاظ دیگر ایک غیر سودی بنکاری کے نظام کو عبوری مرحلے کے طور پر تسلیم کرلیا جائے۔

(۶) اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ اس ملک میں رہنے والے ہر شخص کو شخصی ارتقاء، تعلیم و تربیت اور بنیادی ضرورتیں لازماً حاصل ہوں، خواہ اس کا تعلق کسی بھی فرقے، نسل، رنگ یا جنس سے ہو۔

ملی فرمان

(جو پٹنہ اجلاس کے اختتام پر ۱۵/ جنوری ۱۹۹۶ء کو جاری کیا گیا)

(۱) مسلمانوں کے لئے کفار و مشرکین کی سیاسی قیادت قبول کرنا شرعاً حرام ہے اس لئے مسلمانوں کو تمام غیر مسلم سیاسی جماعتوں سے دور رہنا چاہئے۔

(۲) مسلمانوں کو نظام کفر سے خوشگوار روابط رکھنے والے یا غیر مسلم و کافر حکمرانوں سے ملاقات کو باعث سعادت گردانںے والے تمام علماء کا بائیکاٹ کرنا چاہئے۔ ایسے علماء کو مسلمانوں کی مذہبی نمائندگی کا مزید حق نہیں ملنا چاہئے۔

(۳) غیر مسلم سیاسی جماعتوں میں مسلم سیاسی لیڈران مسلم فرقے کے نمائندے نہیں ہیں۔ چونکہ وہ کفار کے نامزدگان میں سے ہیں اس لئے مسلمانوں کو ان کی انتخابی کامیابی کے لئے کام نہیں کرنا چاہئے۔

(۴) آج کے سیاسی ڈھانچے میں مسلم سیاسی پارٹیاں مؤثر نہیں ہیں اس لئے آئندہ انتخابات کے لئے ایک ملک گیر مسلم سیاسی جماعت کی تشکیل کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔

(۵) مسلم گروہوں، اداروں اور علماء کو ۱۲۲ غیر فوجی خود مختار ریاستوں پر مشتمل ہندوستانی وفاق کے لئے مشترکہ کوشش کرنی چاہئے اور ملی پارلیامنٹ کے سیاسی منشور "مسلم پولیٹیکل بل" کی حمایت کے لئے آگے آنا چاہئے۔

(۶) جمہوریت اور سیکولرزم کے تصورات چونکہ غیر اسلامی ہیں اس لئے کسی ایسے غیر اسلامی نظام کو تقویت دینے کی خاطر کوشش کرنا مسلمانوں کے لئے حرام ہے۔

(۷) ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد کرتے ہیں کہ اس ملک میں ہم مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کے لئے کام کریں گے اور ہندوستان کے بیس کروڑ مسلمانوں کو غیر مسلم سیاسی قیادت کے ظلم واستبداد سے نجادت دلانے کی ہر ممکن جدوجہد کریں گے۔

مسلم منشور

(جوایام گم گشتہ کی پچاسویں برسی پر ملی پارلیامنٹ کے مذہبی اجلاس
منعقدہ ہبلی کرناٹک بتاریخ ۱۶/ مارچ ۱۹۹۷ء کو جاری کیا گیا)

ابتدائیہ:

ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے شروع نہیں ہوتی۔ ہندوستانی مسلمان مستقبل کی کسی منصوبہ سازی میں اپنے اس ماضی کو فراموش نہیں کر سکتے جس کی داستان کوئی ہزار سالوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی نہیں بھلائی جانی چاہئے کہ تاریخی اعتبار سے یہ ملک اسلامی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے اور اسے عرصہ ہائے دراز تک دارالاسلام کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

بدقسمتی سے گذشتہ پچاس برسوں سے ہم ایک اقلیت کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ہماری فکری اور نظری قیادت اس انقلابی امت کو ایک اقلیت کی حیثیت سے زندگی جینے کا مشورہ دیتی رہی ہے۔ عملی طور پر ملک کی تعمیر و ترقی اور اس خطے کے لئے مستقبل کی منصوبہ سازی میں ہمارا عمل دخل صفر ہو کر رہ گیا ہے۔ اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت اب ایک قابل عمل فلسفہ حیات کے طور پر ہمارے نزدیک معتبر نہیں ہے۔ اس سرزمین کے باشندوں کو الٰہی رنگ میں رنگنے اور یہاں ایک نظام عدل کے قیام کا خواب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ ہماری قوت اسلامی نظام عدل کے قیام کے بجائے نظام کفر کے استحکام میں صرف ہو رہی ہے۔ گویا ہم پوری طرح من حیث الامت فکری اور عملی ارتداد کے نرغے میں آگئے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ماضی کی غلطیوں کا صحیح ادراک کیا جائے اور ان خوفناک غلطیوں کے ازالے کی جلد از جلد فکر کی جائے جس نے اس امت کو سیادت کے منصب سے اتار کر کفار و مشرکین کا دست نگر

بنا رکھا ہے۔ مسلمان کے لئے اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ایمان ہے۔ جب ہماری ایمانی سرحدیں پامال ہو جائیں تو ہمارے لئے کچھ بھی باقی نہیں بچتا، دستوری تحفظات کے وعدے ہمارے درد کا درماں بن سکتے ہیں اور نہ ہی تحفظ شریعت کی ضمانت ہمارے اطمینان قلب کا سبب ہو سکتی ہے۔

یہ محض اللہ کا فضل و کرم ہے کہ پچاس سالہ فکری گمرہی کے ازالے کے لئے اس نے اپنے چند کمزور بندوں کو یہ توفیق بخشی ہے کہ وہ اسلامیان ہند کے گمشدہ قافلے کو ایک بار پھر الٰہی منشور کے تحت متحرک کر دیں۔ توقع ہے مسلم منشور کی اشاعت سے ایک واضح سمت کے تعین میں خاطر خواہ مدد مل سکے گی۔ یہ ایک خالص مذہبی دستاویز ہے، اس کا مطالعہ اسی حیثیت سے کیا جانا چاہئے۔

وباللہ التوفیق

پس منظر

۱۵/اگست، ۱۹۴۷ء کو اعلان آزادی کے ساتھ ہی بھارتی ہند کے مسلمانوں کا مستقبل تاریکی میں ڈوب گیا۔ مسلم قیادت کی پے در پے ہمالیائی غلطیوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ایسی صورت حال سے دوچار کر دیا جس میں ہزار سالہ دور حکمرانی کی تاریخ رکھنے والی امت ایک مجبور و بے بس اقلیت میں تبدیل ہو گئی۔ گذشتہ پچاس برسوں میں سرکاری پروپیگنڈے کے زیر اثر ہماری ملی سیاسی قیادت یہ باور کراتی رہی ہے کہ اقلیت میں ہونے کے سبب ہندوستانی مسلمانوں کی نجات ہندوستانی سیکولرزم سے وابستہ ہے اس لئے ہمارا ملی ایجنڈا اس ملک میں سیکولر ڈیموکریسی کا استحکام ہونا چاہئے۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ہم اس ملک کے مرکزی اسٹیج پر کوئی کلیدی رول ادا نہیں کر سکتے، نہ تو ہماری کوئی علٰیحدہ سیاست ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس ملک کو ایک نیا مستقبل دینے کے لئے ہمارا کوئی علٰیحدہ خواب یا علٰیحدہ منصوبہ ہو سکتا ہے۔ ہم اگر زیادہ سے زیادہ کچھ کر سکتے ہیں تو وہ صرف یہ کہ دوسری سیاسی پارٹیوں کے دست و بازو بن جائیں۔ رہی یہ بات کہ ہمارا خواب ان کے خواب سے یکسر مختلف ہے تو ان خطرناک سوالوں پر مجرمانہ خاموشی اختیار کی گئی۔

ہندوستانی مسلمانوں کی پچاس سالہ تاریخ مجرمانہ خاموشی کی شرمناک تاریخ ہے۔ سیکولر دانشور

ہوں یا مذہبی علماء، ملی قائدین ہوں یا روحانی گدی نشین، یہ سب گذشتہ پچاس سالوں سے مداہنت کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ کہیں کہیں گاہے بہ گاہے اگر کوئی آواز حق سنائی بھی دیتی ہے تو اس میں اتنی قوت نہیں کہ وہ اس عمومی مداہنت اور منافقت کا مقابلہ کرسکے۔ ہم بحثیت امت یہ بالکل بھول گئے کہ ہندوستان کی سرزمین میں جہاں ۱۹۴۷ کی نئی سیاسی صورت حال نے ہمیں ایک اجنبی ملک کا باشندہ بنادیا تھا اس میں ہمارے لئے زندگی جینے کا اگر کوئی جواز ہوسکتا تھا تو وہ کیا تھا؟ نئے ہندوستان میں جہاں مسلمان ایک قوم کی محکومی سے نکل کر دوسری قوم کی سیاسی محکومی میں چلے گئے تھے وہاں ہماری اسٹریٹیجی کیا ہونی چاہئے تھی؟ ہم اس مسئلہ پر بھی گفتگو سے گریز کرتے رہے کہ نئے ہندوستان میں ہمارا ملی ایجنڈا کیا ہونا چاہئے؟ ہم یہ بھی بھول گئے کہ موجودہ اذیت ناک صورت حال کو ایک روشن مستقبل میں بدلنے کے لئے ہمارے پاس اب بھی ایک الٰہی انقلابی منصوبہ موجود ہے۔ گذشتہ پچاس برس ہماری ملی تاریخ میں عہد سیاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ایسا عہد جسے ہم ایام گم گشتہ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

قوموں کی تاریخ میں عروج وزوال یا سیاسی اتھل پتھل کوئی ایسا واقعہ نہیں جو قوم کے معماروں کو شکستہ دلی میں مبتلا کردے۔ سلطنتوں کا کھونا، حکومتوں کا آنا جانا، مال و دولت کا رخصت ہونا کوئی ایسا زیاں نہیں جس کی تلافی ممکن نہ ہو۔ البتہ جب کسی امت کی نظریاتی سرحدوں پر حملہ ہونے لگے اور کسی نظریاتی گروہ سے اس کا خواب رخصت ہونے لگے تو یہ اس قوم کی زندگی کا فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے۔ بھارتی ہند میں اس امت کے لئے سب سے زیادہ تشویش کی اگر کوئی بات ہے تو وہ یہ کہ گذشتہ نصف صدی میں ہمارا قرآنی خواب ہم سے بہت حد تک رخصت ہوگیا ہے۔ یوں تو کہنے کو اس ملک میں بے شمار مدارس قائم اور مساجد آباد ہیں۔ دین اور شریعت کے حوالے سے قال اللہ و قال الرسول کا بازار گرم ہے۔ معتبر علماء اور تقدس والے روحانی پیشواؤں کی بھی کمی نہیں لیکن اس ساری چلت پھرت کے باوجود کسی بھی گوشے سے کوئی ایسی آواز اٹھتی دکھائی نہیں دیتی جو اس ظلمت کدہ ہند میں اس امت کو ایک خالص قرآنی ایجنڈے کے تحت متحرک ہونے کی دعوت دے۔ دینی شخصیات اور اداروں نے اپنی اپنی پسند کا دین تیار کر رکھا ہے۔ ایک ایسا دین جو نظام کفر کی اطاعت میں اسلامی زندگی جینے کا فن سکھاتا ہے۔ صورت حال اتنی خراب ہے کہ اہم ملی مسائل اور سیاسی امور میں رہنمائی کے لئے بھی ہمارے معتبر علمائے کرام کتاب وسنت کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے ذاتی رجحانات پر انحصار کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے

کہ اب ہم پوری طرح بھول گئے ہیں کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں اور اس دنیا میں ہمیں کس لئے بھیجا گیا ہے؟ کہنے کو ہم خود کو حامل قرآن بتاتے ہیں، لیکن جب وقت عمل کا آتا ہے تو قرآن کی واضح ہدایات کو نظرانداز کرکے ہم خوشی خوشی کفار و مشرکین کی اتباع اختیار کرلیتے ہیں۔ ہما شما تو کیا بڑے بڑے علماء و دانشور کتاب و سنت سے بغاوت اور سرکشی کے راستے پر بگ ٹٹ دوڑے چلے جارہے ہیں۔

کسی نظریاتی گروہ کے لئے سب سے اہم چیز اس کا انقلابی پیغام ہوتا ہے۔ زندہ قومیں تاریخ کے ہر مرحلے پر اپنے نظریاتی سرمائے کی روشنی میں لائحہ عمل ترتیب دیتی ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو آخری رسول کی امت کی حیثیت سے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کے پاس انقلابی نظریہ کا تازہ بہ تازہ الٰہی ایڈیشن موجود ہے، جس کی روشنی میں سخت سے سخت حالات میں بھی ایک کامیاب اسٹریٹیجی وضع کی جاسکتی ہے۔ یہی ہمارا ایمان ہے۔ البتہ گذشتہ پچاس برسوں کی دوڑ دھوپ اور ملی سرگرمیوں میں کتاب و سنت کو مستقبل کی رہنمائی کے لئے برتنے کا رواج نہیں ملتا۔ گذشتہ پچاس برسوں سے ہماری ملی قیادت ببانگ دہل اس امر کا اعلان کرتی رہی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں سیاسی نظام حیات کے طور پر سیکولرزم ہی ایک قابل قبول اور قابل عمل نظریہ ہوسکتا ہے۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا رہا ہے کہ اس ملک میں بین الملی ثقافت کے پیش نظر اور ہندوستانی مسلمانوں کی قلت تعداد کے سبب ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم سیکولر ڈیموکریسی کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنائیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں ہماری ملی قیادت یہ باور کراتی رہی ہے کہ کسی قرآنی معاشرے کے قیام کا زمانہ اب ہوا ہوگیا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے اسلام کے علاوہ زندگی کے کسی بھی گوشے میں کسی دوسرے نظام کو قبول کرنا ایک ایسا عمل ہے جس سے ہمارا ایمان مشتبہ ہوجاتا ہے۔ قرآن کی رو سے امت مسلمہ کو سیکولرزم کے قیام میں لگانا ایک کار لایعنی ہی نہیں بلکہ جرم عظیم ہے۔ یہ ہمارے ملی ایجنڈے سے صریح انحراف ہے۔

اس ملک میں ہماری ہزار سالہ ملی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے جب ایک اجنبی ایجنڈے کے تحت دوسری قوموں کے ساتھ ہمیں اس ملک کی تعمیر میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حالانکہ ان کی سمت الگ ہے اور ہماری سمت الگ۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم نئے ہندوستان کی تعمیر میں ہاتھ بٹانے سے پہلے یہ دیکھتے کہ جس تعمیر کی بات کی جارہی ہے وہ خود ہمارے ملی عزائم سے میل کھاتی ہے یا نہیں۔ دستور اس ملک کے کارواں کو یونیفارم سول کوڈ کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو قرآن ہم سے ایک اسلامی نظام

عدل کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا کھلا تضاد ہے جس پر پچاس سال گزرنے کے باوجود کسی سنجیدہ گفتگو کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ہم بہت سے تضادات کو اپنے دامن میں سجائے خود کو اس ملک کا معتبر شہری بتاتے رہے۔

مسلمان کے لئے محاکمے کا بنیادی معیار کتاب وسنت ہے۔ ہم اس بات کو اصولاً تو تسلیم کرتے رہے لیکن عملی زندگی میں قرآنی محاکمے کی ضرورت سے بے نیاز رہے، نوبت بایں جا رسید کہ سیاہ و سفید کے پیمانے بدل گئے۔ گذشتہ پچاس برسوں سے اپنی ملی بقا کے لئے جدوجہد کرنے والی دردناک صورت حال سے دوچار امت مسلمہ خود کو آزاد ہندوستان کا شہری سمجھتی رہی، حالانکہ قرآن کی رو سے اسلامی نظام عدل کے قیام کے بغیر حقیقی آزادی کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا۔ یہ تو ایک قرآنی محاکمے کی بات تھی، سیاسی طور پر بھی جو لوگ حالات کی نبض سے واقف تھے وہ اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ ایک بے بس اقلیت کے لئے ایک محکومی سے نکل کر دوسری محکومی میں چلے جانا آزادی کا ہم معنی نہیں ہوسکتا لیکن ان نازک مسائل پر خالص اسلامی زاویہ سے کسی گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ سیاسی قیادت ہو یا ملی رہنمائی یہ سب کے سب مسلمہ اسلامی سیاسی فکر سے انحراف کی مختلف شکلیں ہیں۔ نصف صدی کے اس پورے عرصے میں خالص شرعی حوالے سے نازک سیاسی مسائل پر کلام کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ ۱۹۴۸ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھنو کنونشن میں جب یہ اعلان کیا کہ اب اس ملک میں ہندوستانی مسلمانوں کی کوئی علاحدہ سیاسی پارٹی نہیں ہوگی اور جمعیۃ العلماء محض ایک ثقافتی ادارے کے طور پر کانگریس کو تعاون دے گی تو اس وقت کسی گوشے سے یہ آواز بھی نہ اٹھ سکی کہ ایسا کرنے کے لئے آزاد کے پاس کون سے شرعی دلائل تھے۔ تب ہم یہ بھول گئے کہ آخری رسول کی امت جسے عالمی سیادت کا فریضہ سونپا گیا ہے اس کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ کفار و مشرکین کا دست و بازو بن جائے۔ پھر آنے والے دنوں میں امت کی سیاسی قیادت پر جب کفار و مشرکین پوری طرح قابض ہوگئے تب بھی ہم نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ کیا اللہ کی شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ مسلمان کفار و مشرکین کو اپنا سیاسی قائد تسلیم کرلیں۔ اس گمرہی کا منطقی نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے کہ پوری امت کو غیر مسلم سیاسی قیادت کے اردگرد مجتمع دیکھ کر ہمارے اندر اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ ہمارے لئے مقبول عام رویہ بن گیا ہے۔ کتاب وسنت سے ہماری

دوری نے ہمیں انسانوں کی ایسی بھیڑمیں تبدیل کردیا ہے جس کے پاس نہ کوئی سمت ہے اور نہ کوئی راستہ من حیث الامت ہم زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار آخری سانس لے رہے ہیں۔ ہمارے اندر ایک اسلامی زندگی جینے کی آرزو تو ضرور ہے البتہ عملی طور پر اسلامی زندگی کو منظم کرنے کا کام انتہائی ناقابل عمل معلوم ہوتا ہے۔ ہم سیکولرزم میں اپنے یقین کا بار بار اعادہ بھی کرتے ہیں اور قرآنی خواب سے پوری طرح پیچھا بھی نہیں چھڑا پاتے۔ ہم ایک طرف تو خود کو خلافت علی منہاج النبوۃ کے قیام کا داعی بتاتے ہیں لیکن دوسری طرف عملی طور پر ہم اپنی ساری قوت نظام کفر کے استحکام کے لئے وقف کئے دیتے ہیں۔ فکری اور نظری قیادت ہو یا منظم جماعتیں اور دینی گروہ ہر کوئی ایک بے سمتی اور تضاد کا شکار ہے۔ ہمارے علماء دعائیں تو دین کے غلبے کے لئے مانگتے ہیں لیکن فتوے کفار و مشرکین کو ووٹ دینے کے لئے جاری کرتے ہیں۔ گویا ہم جو کچھ کہتے ہیں خود اپنے اعمال سے اس کی پرزور تردید بھی کر رہے ہیں۔ ہم اس بات کے لئے تو آمادہ نہیں ہوتے کہ مسجد کی امامت غیر مسلموں کے حوالے کردیں لیکن ان کی سیاسی اتباع میں ذرہ برابر بھی تکلف محسوس نہیں کرتے، حالانکہ شریعت کی رو سے مسلمانوں کے امور کو غیر مسلموں کے ہاتھوں میں سونپنا قطعاً حرام ہے۔

ہمارے اندرون میں پلنے والے تضاد نے ہمیں اندر سے اتنا کمزور کردیا ہے کہ ہمارے حوصلے پست ہوچکے ہیں۔ ہم نے موجودہ اذیت ناک صورت حال کو مقدر سمجھ کر قبول کیا ہوا ہے۔ نئی صبح کے قیام کا خیال ہمیں ایک موہوم خواب معلوم ہوتا ہے، حالانکہ اس ملک میں ہم پر انتہائی سخت ایام بھی گزرے ہیں۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ ہماری قوت کے مظاہر مدھم پڑگئے، تلواریں کند ہوگئیں اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس ملک میں امت کا چراغ گل ہونے کو ہے۔ لیکن ہر فیصلہ کن گھڑی میں ہم نے تن تنہا خطرات کا مقابلہ کیا۔ تب ہمیں اپنی قوت کا احساس تھا، اپنی ملی شخصیت پر بھروسہ تھا۔ آج ہم نہ جانے کیوں خود کو اقلیت میں محسوس کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا ہماری حفاظت کا انتظام کردے۔ ہماری پچاس سالہ ملی سیاسی قرارداد حکومت سے نوع بنوع مضحکہ خیز مطالبات سے بھری پڑی ہے۔

گویا ہماری پچاس سالہ ملی زندگی کسی واقعی اسلامی ایجنڈے سے خالی ہے۔ یہ ایک ایسا انحراف ہے جس کی کوئی اور مثال ہمیں تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ مصیبت یہ ہے کہ جو لوگ اس امت کو دوبارہ قرآنی ایجنڈے کے تحت متحرک کرنا چاہتے ہیں ان سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ آخر نامور

علمائے کرام اور تقدس والی شخصیات کیا دینی و ملی ایجنڈے سے واقف نہیں؟ پھر یقیناً کوئی بات ہوگی جو ان محترم شخصیات نے اس قرآنی ایجنڈے کو موخر کر رکھا ہے۔ بڑے بڑے ناموں اور تقدس والی شخصیات کا دبدبہ کچھ اتنا زیادہ ہے کہ ان کے سامنے اللہ کی کتاب اور رسول اللہؐ کی سنت بھی لوگوں کے خیالات میں ہلچل پیدا کرنے کا باعث نہیں بنتی۔ عملاً اسلام مفلوج اور بے ضرر اسلام مساجد کی چہار دیواری تک محدود ہے، مسجد کے باہر کفار و مشرکین کی اتباع ہے۔ جھوٹے روحانی پیر و فقیر، دنیادار مولوی آخرت کے ٹھیکیدار ہیں۔ رہی دنیا کی کامیابی تو اس کام کے لئے اخلاق باختہ مشرک سیاست دانوں کی اتباع کو لازم تصور کرلیا گیا ہے۔ یہ کچھ وہی صورت حال ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

'افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض'

بیشتر دینی اور ملی سرگرمیاں کسی واضح ہدف سے محروم ہیں۔ ان بے چاروں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ آخر انہیں جانا کہاں ہے۔ ہر کسی نے اپنے دماغ کی اپج سے امت مسلمہ کے موجودہ مسائل کا حل ڈھونڈ نکالا ہے۔ کوئی تعلیم کو ہمارے مسائل کا حل بتاتا ہے تو کوئی معیشت کی درستگی کا مشورہ دیتا ہے۔ کسی کو تحفظ شریعت کی مہم پر اصرار ہے تو کوئی مسلمانوں کو سیکولر قوتوں کا معاون و رفیق بناکر مراعات کے دلکش باغ دکھاتا ہے۔ گویا کل حزب بما لدیھم فرحون۔ تحقیق و تصنیف کے نام پر فقہی موشگافیوں کا بازار گرم ہے۔ علماء کی مجالس نکاح و طلاق کے مسائل میں الجھی ہوئی ہیں۔ کہیں نئے طرز کے نکاح نامے کی تیاری کا کام جاری ہے تو کہیں کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت پر بحث چل رہی ہے۔ کہیں اسلام کے تعزیراتی قوانین پر نکتہ آفرینی ہورہی ہے تو کہیں مسئلہ رجم پر کتابیں تصنیف کی جارہی ہیں۔ ان بے چاروں کو نہ تو صورت حال کی سنگینی کا کوئی احساس ہے اور نہ ہی ان کے اندر یہ حوصلہ ہے کہ وہ اصل نازک مسائل پر زبان کھولیں۔ یہ کوئی وہی صورت حال ہے کہ جب قسطنطنیہ میں عیسائیوں کو شکست دے کر مسلمان شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہورہے تھے تو اس وقت وہاں کے سب سے بڑے گرجا گھر میں عیسائی علماء کے درمیان بڑے زور و شور سے یہ بحث جاری تھی کہ حضرت عیسیٰ پر جو روٹی اتری تھی وہ خمیری تھی یا فطیری۔

صورت حال کی سنگینی ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ فروعی مسائل پر اپنی قوت صرف کرنے کے بجائے ہم سب سے پہلے اس فکری انحراف کو دور کرنے کی فکر کریں جس نے ہمارے وجود کو مضمحل کردیا

ہے۔ گویا ایک واضح سمت کا تعین ہماری اولین ضرورت ہے۔ تاریخ کے اس لمحے میں ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ گمشدہ اسلامی ایجنڈے کی بازیافت کا وقت اب آپہنچا ہے، یہ مسلم منشور دراصل اسی سمت میں ایک قدم ہے۔

اعتراف

مستقبل کی کامیاب منصوبہ سازی کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں ماضی کی ان بنیادی غلطیوں کا ادراک اور اعتراف بھی ہو جنہیں ہم اپنی موجودہ پستی کا سبب قرار دیتے ہیں۔

(۱) ہمیں بحیثیت امت اس امر کے اعتراف میں کوئی تکلف نہیں ہونا چاہئے کہ ہماری ملی زندگی کے گذشتہ پچاس سال دراصل بے سمتی کے ایام ہیں جس میں ہم کسی واضح ملی ایجنڈے سے یکسر غافل رہے ہیں۔ اپنی ملی تاریخ کے ان شرمناک ایام کو ہم دور سیاہ یا ایام گم گشتہ (Lost Years) سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) ہمیں اعتراف ہے کہ کتاب و سنت کی موجودگی کے باوجود ہماری دوڑ دھوپ غیر الٰہی نظام حیات کے استحکام کے لئے وقف رہی ہے۔ ہم اس مبینہ انحراف کے لئے اپنے آپ کو مجرم تصور کرتے ہیں۔

(۳) ہم یہ سمجھتے ہیں کہ لکھنو کنونشن ۱۹۴۸ء میں ابوالکلام آزاد کا مسلم پارٹی کو تحلیل کردینے کا فیصلہ ایک بڑی سیاسی غلطی تھی، جس سے آنے والے دنوں میں کفار و مشرکین کی سیاسی اتباع کی راہ ہموار ہوئی۔

(۴) ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ شرعی طور پر تقسیم ہند کا فیصلہ غلط تھا، جو ملک صدیوں سے دارالاسلام رہا ہو اس کے کسی حصے کے حصول کے لئے دوسرے حصے کا سودا نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی سابق دارالاسلام کے کسی حصے کو اجنبی حکمرانوں کے حوالے کیا جانا شرعاً درست ہے۔ رہا پاکستان کے نام پر مسلمانوں کی کسی ایسی قومی ریاست کے قیام کا مسئلہ جہاں الٰہی قوانین کو بالادستی حاصل نہ ہو تو اسلام کسی ایسی ریاست کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ موجودہ سیکولر پاکستان ہماری ملی سیاسی روایت سے انحراف کا آئینہ دار ہے۔ آج ہم اپنی اس فاش غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے پاکستان کو

مسلمانوں کی قومی ریاست کی حیثیت سے (de-recognise) کرتے ہیں۔

(۵) ہم اعلان کرتے ہیں کہ شریعت کی رو سے ہمارے لئے اسلام کے علاوہ زندگی جینے کا کوئی دوسرا نظریہ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ مکروہ سیکولرزم کے حواریوں میں شامل ہوکر ہم نے جرم عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔ ہم من حیث الامت اپنے اس عمل پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں۔

تجدید عہد

انقلابی عمل سے پچاس سالہ غفلت کے اعتراف کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم من حیث الامت اللہ اور اس کے رسولؐ سے کئے گئے عہد و پیمان کی تجدید کا سامان کریں۔

(۱) آئیے اس بات کا اعلان کریں کہ اسلام محض ایک انقلابی پیغام نہیں بلکہ ایک انقلابی طریقہ کار بھی ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمارا ایمان ہے کہ موجودہ صورت حال سے نجات کے لئے کتاب و سنت کی روشنی میں ایک کامیاب اسٹریٹیجی تشکیل دی جاسکتی ہے۔

(۲) ہم اسلام کو جیسا کہ آخری رسولؐ کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں ایک قابل عمل طریقہ حیات تسلیم کرتے ہیں اور اس عمل سے اپنی دنیوی اور اخروی نجات کی توقع رکھتے ہیں۔

(۳) انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اتباع لازم خیال کرتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ زندگی جینے کے دوسرے تمام طریقہ حیات کو ہم یکسر مسترد کرتے ہیں۔

(۴) ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان کی حیثیت سے دنیا میں ایک قرآنی نظام عدل کا قیام ہمارا بنیادی دینی فریضہ ہے۔ ہم اس ملک میں اور اس سے باہر ایک ایسے نظام عدل کے قیام کے لئے سرتوڑ جدوجہد کا اعلان کرتے ہیں۔

(۵) مسلمان کی حیثیت سے ہمارا ایمان ہے کہ حق اور باطل کی تمیز کے لئے اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت ہی کافی ہے۔ ملی سفر کے ہر مرحلہ میں ہم کتاب و سنت کی ہدایت کو حتمی سمجھتے ہیں۔ رہے وہ درباری علماء جو نظام کفر کی حاشیہ نشینی پر فخر کرتے ہیں اور جو ہمارے ملی قافلے کا رخ کتاب و سنت سے ہٹا کر اپنے ہوا و ہوس کی سمت موڑنے کا کام انجام دے رہے ہیں تو ہم ان سے مکمل

برات کا اظہار کرتے ہیں۔

(۶) ہم اول تا آخر مسلمان ہیں۔ صرف اور صرف مسلمان۔ دین کی مختلف تعبیر و تشریح یا سیاسی اور فقہی اختلاف کی بنیاد پر کسی گروہ بندی کو ہم اصل اسلام سے انحراف تصور کرتے ہیں۔ ہم شیعہ ہیں نہ سنی، ہم میں نہ کوئی اونچی ذات کا ہے اور نہ نیچی ذات کا، ہم سب کے سب ایک دوسرے کے مونس و غمخوار بھائی بھائی ہیں، "انما المومنون اخوۃ" ہم امت کے ہر فرد کو انقلابی مشن میں اس کی استطاعت بھر شریک کرنا چاہتے ہیں۔

(۷) ہم اس یقین کا بھی اعادہ کرتے ہیں کہ نظام عدل کے قیام کی ذمہ داری مردوں کی طرح عورتوں پر بھی ڈالی گئی ہے۔ (والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر) ہم غلبہ اسلام کی تحریک میں بہنوں کی عدم شرکت کو قابل مواخذہ جرم سمجھتے ہیں اور انہیں بھرپور شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔

ہمارا ملی ایجنڈا

(۱) ایک ہمہ گیر عالمی خلافت کا قیام اور امام عادل کی رہنمائی میں نظام عدل کا استحکام ہمارا بنیادی دینی فریضہ ہے۔ شریعت کی رو سے خلافت کی کرسی تین دن سے زیادہ خالی نہیں چھوڑی جاسکتی۔ جب تک منہاج النبوۃ پر خلافت کا قیام عملاً ممکن نہیں ہوتا مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لئے آرام کا کوئی لمحہ نہیں ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی چونکہ ہندوستان میں رہتی ہے اور تاریخی اعتبار سے بھی ہندوستانی مسلمان خلافت کے ادارے سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اس لئے بجاطور پر توقع کی جاتی ہے کہ احیائے خلافت کی تحریک میں ہندوستانی مسلمان کلیدی رول انجام دیں گے۔

(۲) شریعت کی رو سے اس ملک میں ہماری حیثیت کسی اقلیتی گروہ کی نہیں بلکہ ایک نظریاتی پارٹی (خیر امت) کی ہے۔ دنیا کے اس خطے میں ایک نظام عدل کے قیام کے لئے راہ ہموار کرنا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہم اس بات کے پابند ہیں کہ اس ملک کے کارواں کا رخ قرآن کی طرف پھیر دیں۔ اس کے علاوہ زندگی جینے کا کوئی اور طریقہ خواہ اسے موجودہ دنیا میں کتنا اعتبار ہی کیوں نہ مل گیا ہو ہمارے لئے ناقابل اعتناء ہے۔

(۳) اللہ کے رسولؐ نے ہمیں صرف عبادات کا طریقہ ہی نہیں بتایا ہے بلکہ سیاسی زندگی کی ترتیب و تشکیل کے اصول بھی بتائے ہیں۔ ہماری سیاسی صف بندی کا مقصد قرآنی معاشرے کی تعمیر ہونا چاہئے۔ شریعت کی رو سے سیاسی زندگی میں کفار و مشرکین کی اتباع قبول کرنے سے رسولؐ سے ہماری بیعت ٹوٹ جاتی ہے۔ ہم ہر حال میں اسلام کے اس بنیادی سیاسی اصول کا احترام کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔

(۴) ہمارا ہدف نہ تو اپنے لئے مراعات کا حصول ہے اور نہ ہی سیاسی اقتدار میں ہماری شرکت ہمارے اضطراب کو کم کر سکتی ہے۔ ہم نہ تو ریزرویشن کے حصول سے مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ ہی معاشی اور تعلیمی صورت حال کی اصلاح ہمارے لئے اطمینان قلب کا باعث ہو سکتی ہے۔ ہمارے لئے سکون و اطمینان کا اس وقت تک کوئی موقع نہیں جب تک اس ملک کے مقہور و مجبور باسیوں کو الٰہ واحد کی اطاعت میں حقیقی آزادی کے لطف سے ہمکنار نہ کر دیا جائے۔ گویا ہمارے پاس ایک واضح زیر اتمام (unfinished) ایجنڈا موجود ہے۔

۔ مسلم رائے دہندگان کا منشور

(جو ملی پارلیامنٹ کے اعلیٰ سطحی اجلاس منعقدہ نئی دہلی فروری ۱۹۹۸ء میں جاری کیا گیا)

ابتدائیہ

ہم ہندوستانی مسلمان تاریخ کے اس لمحے میں جب نظام کفر نے ہم پر بارہواں پارلیمانی انتخاب تھوپا ہے اور ہم سے ایک بار پھر نظام کفر کے استحکام کا ووٹ لیا جانے والا ہے، ایک ایسے لمحے میں ہم ہندوستانی مسلمانوں کی توجہ ان امور کی طرف دلانا چاہتے ہیں۔

۱۔ اسلام میں حکمرانی اور قانون سازی کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ " اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ "

ترجمہ۔ فرمانروائی صرف اللہ کے لیے ہے۔ اس کا حکم ہے کہ تم اس کی تابعداری کرو، اسی کی مانو اور کسی کی نہ مانو۔ زندگی گزارنے کا یہی صحیح طریقہ ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں سمجھ پاتے۔

(سورہ یوسف۔ ۴۰)

۲۔ اسلام کی رو سے قرآنی ہدایات کی موجودگی میں کوئی اور نظام زندگی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

" وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا "

ترجمہ۔ کسی مسلمان کے لیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ہرگز جائز نہیں کہ جب کسی چیز کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول کی رائے موجود ہو تو وہ اس بارے میں کوئی ذاتی رائے اختیار کرے کہ اگر کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول سے منہ موڑتا ہے تو گویا وہ کھلی گمرہی میں مبتلا ہے۔

(الاحزاب۔ ۳۶)

۳۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول سے وفاداری کے صرف زبانی دعوے پر اکتفا نہ کریں بلکہ نظام کفر یا نظام طاغوت سے برات کا عملی مظاہرہ بھی کریں۔ " أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا "

ترجمہ۔ کیا تم ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ان ہدایات میں یقین رکھتے ہیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہیں اور جو ان سے پہلے لوگوں پر اتری ہیں، البتہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے امور کا فیصلہ نظام طاغوت کے مطابق کیا جائے حالانکہ انہیں ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں گمرہی میں دور بہت دور لے جائے۔ (النساء ۶۰)

۴۔ قرآن کا انتباہ ہے کہ۔ " وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا "

ترجمہ۔ اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا اس امر کے باوجود کہ اس پر حق ظاہر ہو چکا تھا اور اس نے مومنین کا راستہ چھوڑ کر اپنے لیے کوئی اور راستہ منتخب کر لیا تو ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے جو انتہائی برا ٹھکانہ ہے۔ (النساء ۱۱۵)

ان قرآنی احکامات کی اتباع کرتے ہوئے ہم ایک بار پھر ہندوستانی مسلمانوں کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ

(۱) ووٹ ایک امانت ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ ہم اپنے ووٹ کے ذریعے کفار و مشرکین کے موجودہ نظام جبر کو استحکام بخشیں یا ہمارے ووٹ کے ذریعے کوئی کافر و مشرک یا اس کا کوئی مسلمان ایجنٹ برسراقتدار آجائے۔

(۲) اللہ کے بندوں پر اختیار حکمرانی ایک امانت ہے۔ اس امانت کو امام عادل کے علاوہ کسی اور کے ہاتھوں میں سونپنا صریح ظلم و نادانی ہے۔

(۳) موجودہ جمہوری نظام ایک دجل اور فریب سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ اسلام کسی ایسی جمہوریت کا قائل نہیں جس میں قانون سازی کے اختیارات کفار و مشرکین کے ہاتھوں میں آگئے ہوں۔

(۴) سیکولرازم ایک سیاسی نظریے کے طور پر ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا، ایسا اس لیے بھی

کہ عملی طور پر گزشتہ پچاس برسوں میں سیکولرازم کے نام پر ہندو ثقافت کو فروغ دیا جاتا رہا ہے۔

(۵) ہمیں اس بات پر بھی قلق ہے کہ ملک بھر میں لوک سبھا کی ۱۲۰ نشستیں درج فہرست ذاتوں کے لیے مخصوص کردی گئی ہیں جن میں بیشتر نشستیں مسلم آبادی کے علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ اس طرح سماجی انصاف کے نام پر مستقبل میں کسی مسلم سیاسی قوت کے احیاء کا روستہ روک دیا گیا ہے۔

(۶) ہمیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ مسلمانوں کی صحیح عددی قوت سے نظام جبر کو خوف آتا ہے اس لیے متناسب نمائندگی اور جداگانہ طریقہ انتخاب کے فارمولے کو قبول نہیں کیا جارہا ہے تاکہ پچیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی غلامی کی یہ شب تاریک کبھی ختم نہ ہو۔

ہم اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ:

(۱) موجودہ نظام جبر میں جہاں فی الوقت ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کوئی اسلامی متبادل موجود نہیں ہے، جلد از جلد امت مسلمہ کی سیاسی صف بندی کا کام انجام دیں گے اور اس مقصد کے لیے آئندہ لوک سبھا انتخابات سے پہلے پہلے ایک اسلامی سیاسی پارٹی کی تشکیل کا کام انجام دے لیں گے۔

(۲) البتہ جب تک ایک اسلامی متبادل سامنے نہیں آتا ہم یہ جائز نہیں سمجھتے کہ ہم اپنا ووٹ کفار و مشرکین کو اقتدار میں لانے کے لیے استعمال کریں۔ اس لیے مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ موجودہ الیکشن سے یکسر لاتعلق ہوکر اگلے انتخاب کی تیاری میں جٹ جائیں۔

(۳) ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں غلیظ کفر کی مختلف شکلیں ہیں، لہٰذا ان میں سے کسی کو نسبتاً بہتر سمجھنا سادہ لوحی ہے۔ اللہ کے رسولؐ کا ارشاد ہے "الکفر ملة واحدة" اور یقیناً رسول کی فہم و بصیرت ہم سبھوں کی سمجھ سے بہتر ہے، لہٰذا حالیہ انتخاب میں تمام سیاسی پارٹیوں کو مسترد کرتے ہوئے ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ کسی بھی پارٹی کے حق میں اپنا ووٹ استعمال نہیں کریں گے۔ اور ہم کسی کافر کے حمایتی نہیں بنیں گے بلکہ کفار و مشرکین کو آپس میں لڑنے کے لئے چھوڑ دیں گے۔ جب تک ایک، مسلم سیاسی پارٹی وجود میں نہیں آتی، پولنگ بوتھ تک ہمارے قدم نہیں اٹھیں گے۔

تصاویر غیرت

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود



"بھارت ماتا" کی یوم آزادی پر ایک دینی مدرسے میں مٹھائیوں کی تقسیم کا ایک "روح پرور" منظر



اسلام زندہ رہے یا فنا ہو جائے۔ ہم مسلمانوں کا تو صرف ایک ہی نعرہ ہے
سونیا گاندھی کو حیاتِ دوام عطا ہو

امام الائمہ نرسمہا راؤ جی : امام کانفرنس میں "نائبین رسول" کے ساتھ



سابق وزیراعظم وی پی سنگھ اپنے مسلمان اتقیوں کے ہمراہ فاروق عبداللہ کو گلے لگاتے ہوئے

نرسمہاراؤ کی حمایت میں علماء و مشائخ کی کانفرنس : شمع محفل ہیں راؤ کے خصوصی معتمد ال کے مشرا جنہیں تصویر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا عشوہ خوں ریز ہے ساقی



جمعہ کی ایک نماز (سابق) وزیر اعظم راؤ جی کے نام
ایام الیکشن میں راؤ کی رہائش گاہ پر نماز جمعہ ادا کرتے ہوئے بے بس اور بے شعور مسلمان



سابق وزیر اعظم راؤ کے آستانے پر علماء کا ایک وفد اس عزم مصمم کے ساتھ کہ
ع تیرے در سے نہ جائیں گے خالی



ہندو احیا پرست رہنما مدن لال کھورانہ کے استقبال میں
دیدہ و دل فراش کرتے ہوئے مسلم خواتین



تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار
حیدر آباد میں مسلم قائدین نظام کفر کے استحکام کے لئے دعا کرتے ہوئے



بھارتیہ جنتا پارٹی کی حمایت میں علماء و مشائخ اور سجادہ نشینوں کے چہرے کھل اٹھے
واللہ کتنے خوش ہیں آپ سیاسی غلامی کی اس اذیت ناک زندگی پر

واللہ آپ کو تو اس فن میں کمال حاصل ہے
اجمیر میں نرسمہا راؤ کو خلعت عطا کئے جانے کا ایک منظر



درگاہ حضرت نظام الدین میں موجودہ صدر جمہوریہ کے آر نارائنن کی دستار بندی کا ایک منظر

حضرت!
اب
بس
بھی
کیجئے

تعمیر بابری مسجد کمیٹی کے رکن افضال نظامی نئی دہلی کی ایک تقریب میں لالو پرساد یادو کی دستار بندی کرتے ہوئے



مسلم خواتین ہندو احیاء پرستوں کے پارلیمانی رہنما اٹل بہاری باجپئی کو امام ضامن باندھتے ہوئے۔

کہ غیرت نام تھا جس کا
گئی تیمور کے گھر سے



اے اللہ دشمن اسلام
کے اقتدار کو طول دے،
اس کا اقبال بلند کر

اجمیر شریف سے ایک وفد
وزیر اعظم
مسٹر اٹل بہاری باجپئی
کے لئے مصروف دعا

کہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے



مشائخ کے ہاتھوں
وزیر اعظم واجپائی
کی ٹوپی نمائی
کا ایک
"روح پرور" منظر

تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟



ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں



بھاجپائی ایجنڈے کی حمایت میں مصلیٰ باز مسلمانوں کا ایک اجتماع

دھراوی (ممبئی) میں دسمبر ۱۹۹۲ء کے فسادات سے خوف زدہ مسلمان ایک مندر کی تعمیر میں حصہ لیتے ہوئے
اللہ واحد کے پرستاروں پر قومی یک جہتی کا مفہوم کچھ اس طرح واضح ہوا ہے۔



حضرت ! حضرت !
اب رہ ہی کیا گیا ہے ؟
تنظیم ائمہ مساجد کے
صدر مولانا جمیل الیاسی
راجیش کھنہ کی
رہائش گاہ پر
ان کی دستار بندی
کرتے ہوئے

رام بھگتوں
کا
ایک انداز
یہ بھی
ہے

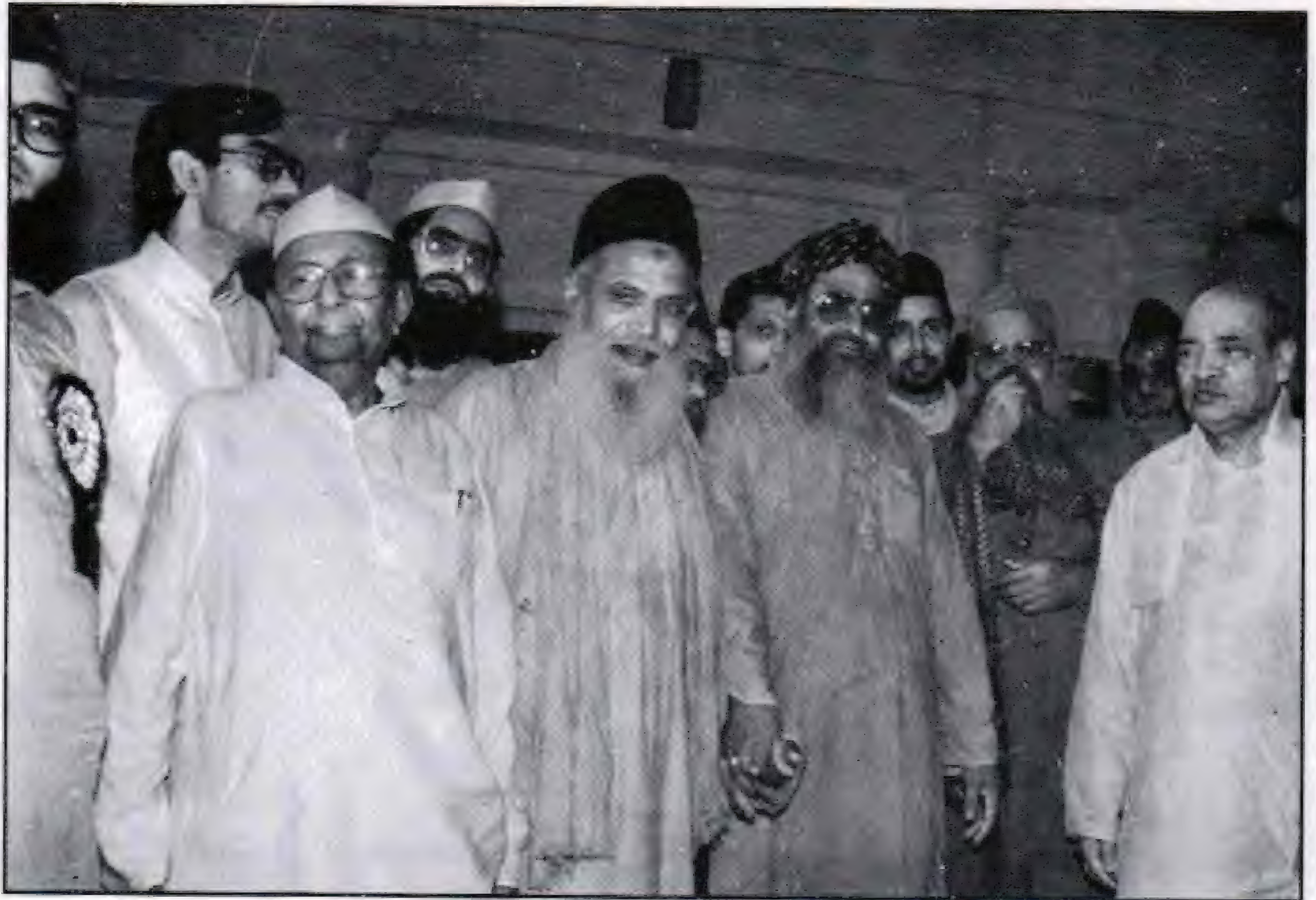


وزیر اعلیٰ فاروق عبد اللہ رام لیلا تقریبات میں علامتی تیر چلاتے ہوئے
دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

سکیولرازم
اور
رواداری
کی ایک
زندہ مثال



مجسمہ مسیح کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے مسلمان
(جب عیسائی راہبہ ٹریسا کی بحالی صحت کے لئے مشنریز آف چیریٹی میں ایک بین المذہبی دعائیہ کا اہتمام کیا گیا)



چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

خود ساختہ اولی الامر اور اصحاب دعوت و ارشاد راؤ اور کیسری کے آستانے پر غالباً جائے امان کی تلاش میں ایک حضرت کو حیامانع آگئی : چہرہ چھپانے کی ناکام کوشش



مہاراج!
محمد اوران کی
امت کیا چیز ہے
ہم تو آپ کی
خاطر سب کچھ
ہنسی خوشی قربان
کرنے کو تیار
ہیں، بس اک
نگاہ کرم کی
درخواست ہے۔

”جے رام جی کی“ یعنی بلند رہے ترا اقبال — مبارک سلامت ردائے مبارک



مولانا توصیف رضاخان بریلی شریف میں اعلیٰ حضرت کے ناموس کو نیلام کرتے ہوئے

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے — گلیم بوذر و دلق اویس چادر زہرا

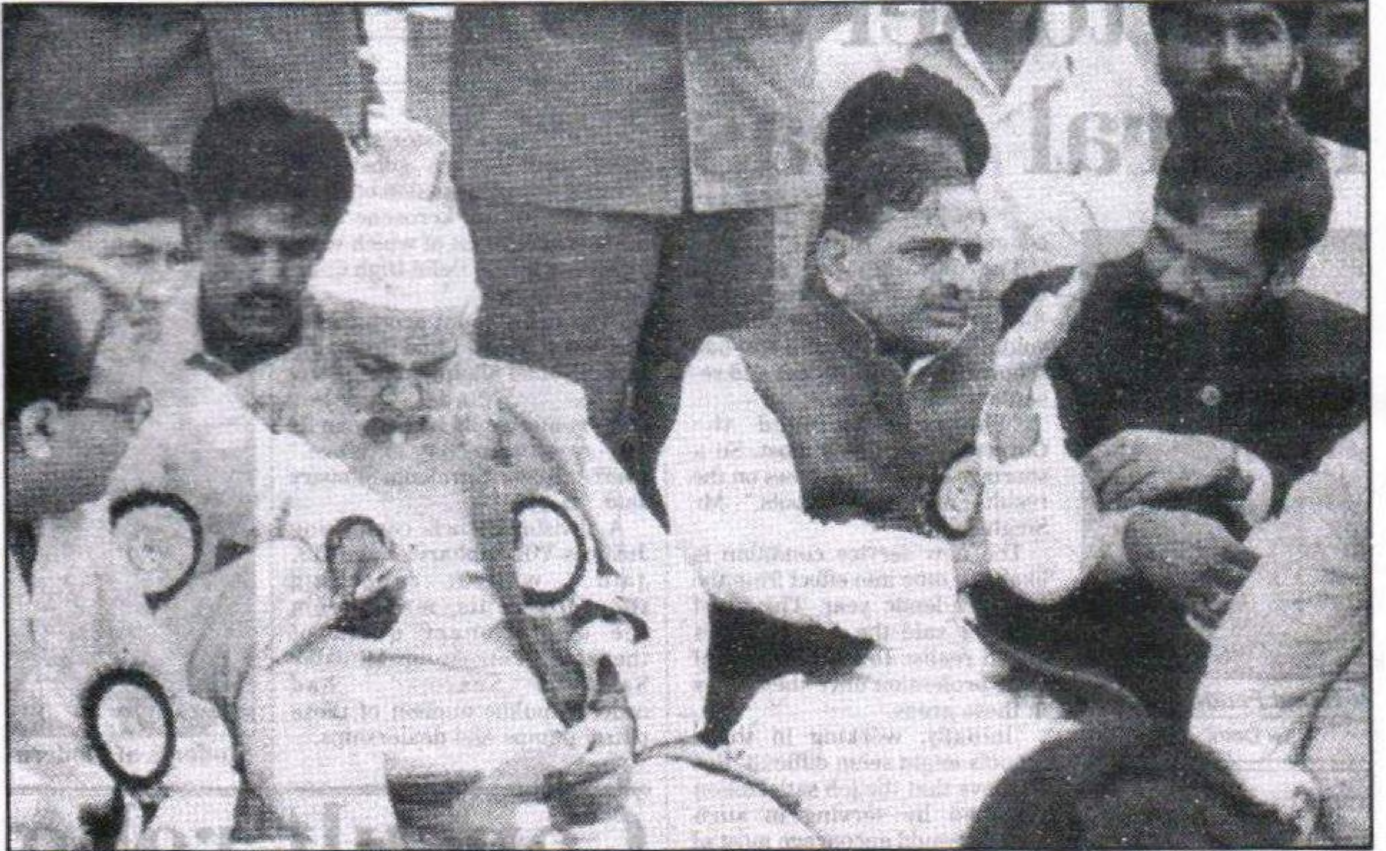


محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کا ہجوم جو اب سونیا گاندھی کے آستانے پر سر ٹکانے کو بے چین ہے۔

مرکزی مسلم وزیر مختار عباس نقوی شیو مندر میں جل چڑھاتے ہوئے



تذلیل امت کا ایک اور دل آزار منظر
آخری نبیؐ کی امت کے عمائدین کفار و مشرکین کے در پر رحم و کرم کی التجا کرتے ہوئے
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں　　کچھ بھی پیغام محمد کا تمہیں پاس نہیں



وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا



اے کاش
کہ یہ ہاتھ
لالو کی حمایت
کے بجائے
محمدؐ کی حمایت
میں اٹھتے۔

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک امتی جو اب لالو یادو کے امتیوں میں شامل ہوگیا ہے۔
لالو کا ایجنڈا اس کا ایجنڈا قرار پایا ہے۔